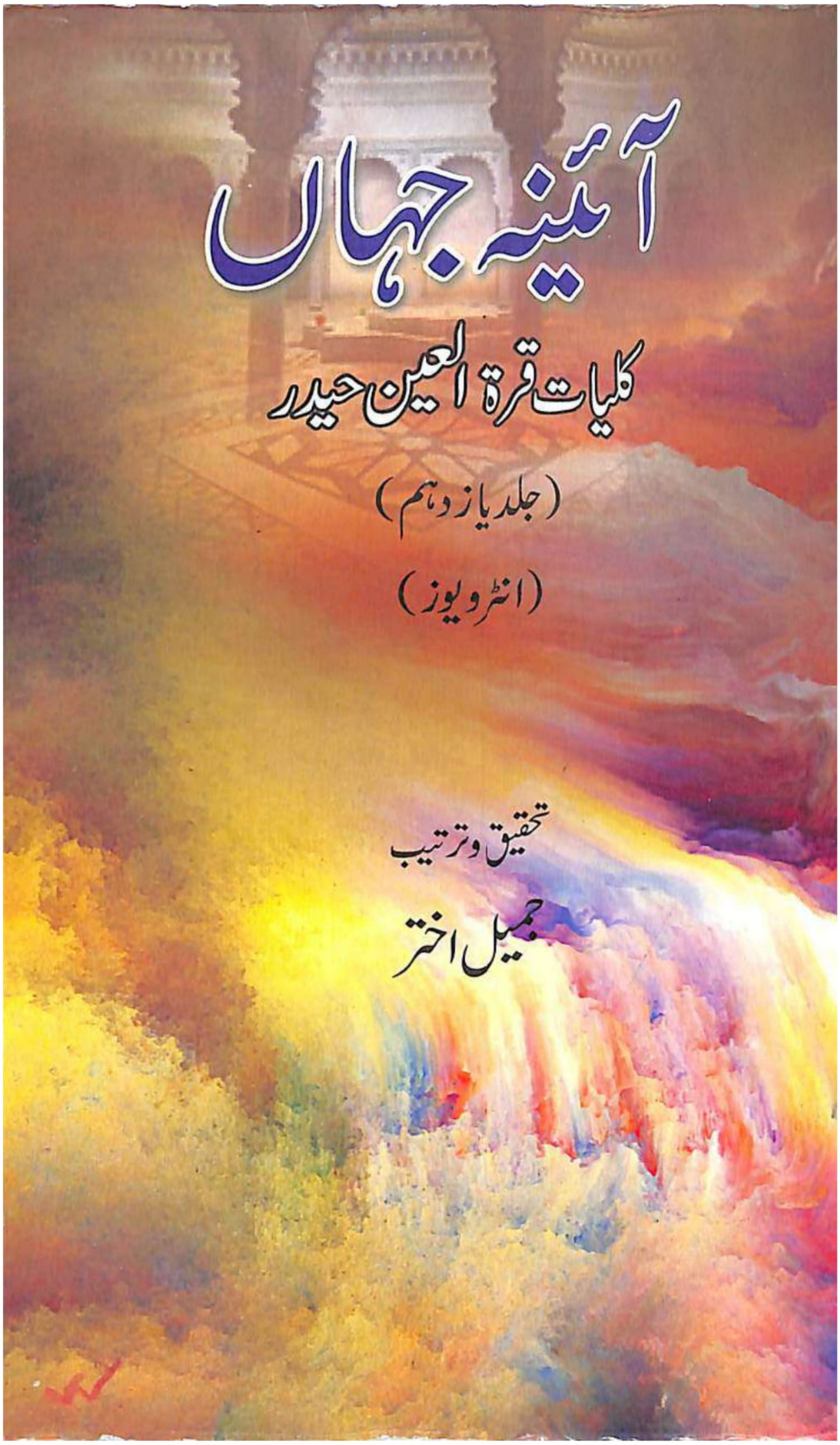

آئینہ جہاں

کلیات قرۃ العین حیدر

(جلد یازدہم)

(انٹرویوز)

تحقیق و ترتیب

جمیل اختر

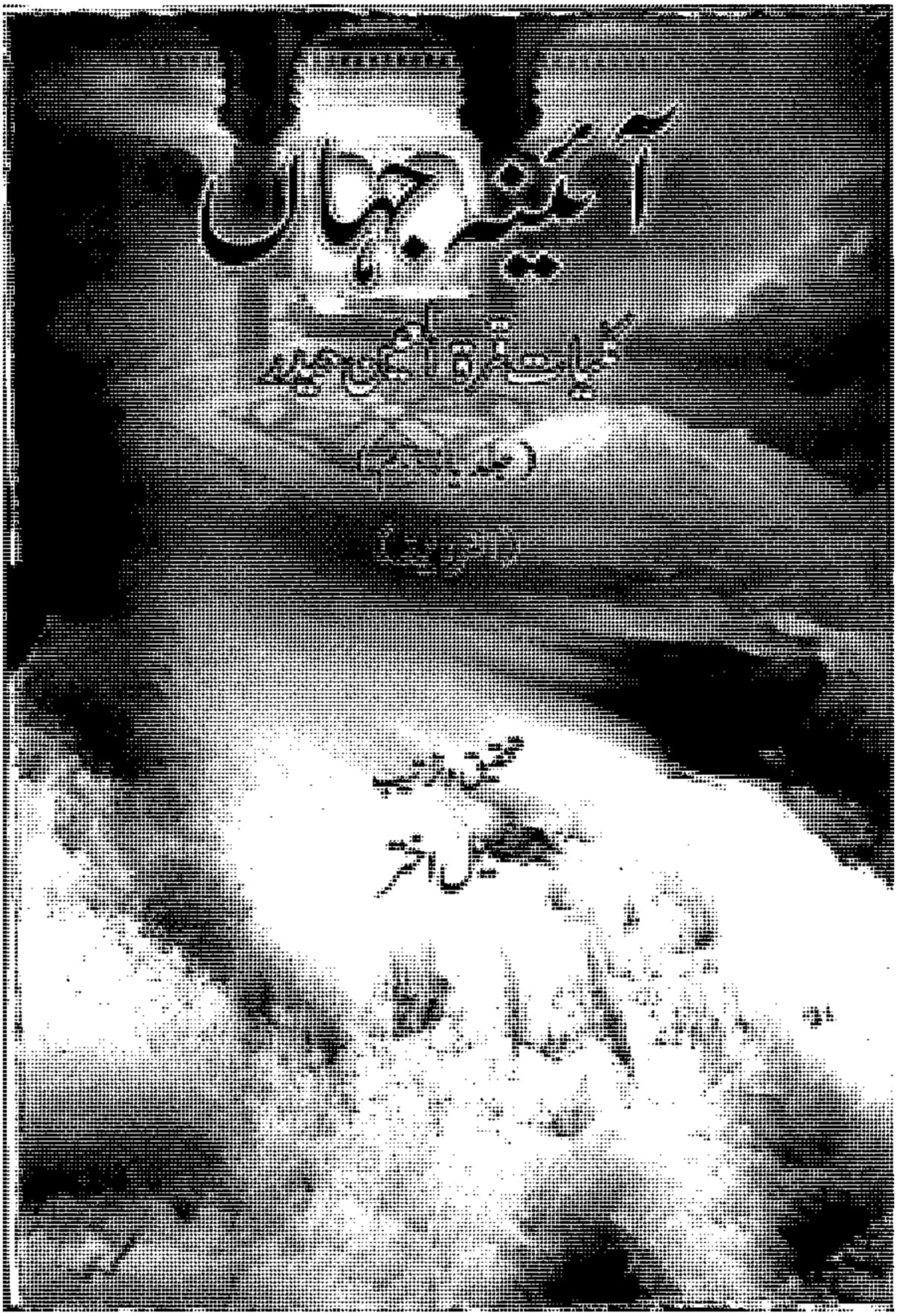
آئینۂ جہاں
کلیاتِ قرۃ العین حیدر
تحقیق و ترتیب
جمیل اختر

آئینۂ جہاں

کلیات قرۃ العین حیدر

(انٹرویوز)

(جلد یازدہم)

تحقیق و ترتیب :

جمیل اختر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا نئی دہلی۔ 110025

©قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2016
تعداد : 550
قیمت : -/132 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1895

Aaina-e-Jahan

Kulliyat-e- Quratulain Haidar Vol. 11

By: Jameel Akhtar

ISBN :978-93-5160-129-6

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔ 110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی۔ 110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدارسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائریکٹر

فہرست

• دیباچہ	قرۃ العین حیدر	vii
• مقدمہ		xv
1. ہمارے اکثر ناقدین لکیر کے فقیر ہیں	شمیم حنفی	1
2. نقادوں نے خاتون لکھنے والیوں کو اگنور کیا ہے	آصف فرخی	7
3. بیشتر نقادوں کو فکشن کی سمجھ نہیں	زبیر رضوی	75
4. اردو میں متوازن تنقید بہت کم لکھی گئی ہے	شہزاد منظر	83
5. عام آدمی میرا موضوع کبھی نہیں رہا	پرویز احمد	101
6. ہندستان میں اردو کو پاکستان کے قیام کی سیاسی قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے	الکا سنگھ	111
7. اردو ہندستانی تہذیب کی عکاس ہے	نمائندہ فانا	115
8. تاریخ ایک بنیادی حقیقت ہے	جاوید ناصر	119
9. میرے نزدیک مسجد کی مسماری ایک المناک واقعہ...	بھرت واریاوالا، اراپانڈے	135

10. اردو کا رسم الخط اس کا لباس ہے	فیروز بخت احمد	145
11. میں نسوانی آزادی کی قائل نہیں	شمع افروز زیدی	157
12. شہر آرزو	امجد حسین	167
13. میں اردو میں ترقی پسند تحریک کی حامی ہوں	احمد ندیم قاسمی	173
14. میں نے پہلی بار حقیقت پسندانہ انداز کی کہانی لکھی	ڈاکٹر محمد صادق	179
15. ہم سب تاریخ کے چوکھٹے میں بندھے ہیں	راجندر اپادھیائے	189
16. ناچ گرل خالص برطانوی اصطلاح ہے	وہاج الدین علوی	203
17. ظ. انصاری کے جملوں میں طباعی اور ذہانت کی چنگاریاں پوشیدہ ہوتی تھیں	وہاج الدین علوی	207
18. ذکر اس پری وش کا	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	213
19. اس کی باتوں میں غضب کی خوشبو ہے	مشتاق احمد شیدا	217
20. اس کا انداز منفرد ہے بہت	ابوالفیض سحر	243
21. بچوں میں پڑھنے کا شوق کم ہو گیا ہے	آصف جیلانی	251

دیباچہ

جس فرد نے بحیثیت ایک یونیورسٹی اسٹوڈنٹ، ریڈیو براڈ کاسٹر اور صحافی اپنے کالج کے زمانے سے طرح طرح کے مشاہیر کو انٹرویو کیا ہو جب خود اس کا انٹرویو لیا جائے تو اسے عجیب لگتا ہے۔ والد مرحوم کے ملاقاتیوں میں جو ہمارے یہاں آیا کرتے تھے بعد میں پتہ چلا کہ یہ سب مشاہیر ادب تھے۔ آنند نرائن ملا، جگر و جوش و مجاز، علی عباس حسینی، سید سجاد ظہیر اور منشی دیا نرائن نگم وغیرہ۔ ہماری والدہ اس صدی کی اولین روشن خیال خاتون تھیں، لہٰذا نامور خواتین کی آمد و رفت بھی رہتی تھی۔ چنانچہ جیسا کہ ایسی صورت حال میں ہوتا ہے بچوں نے اپنی تربیت کے مطابق ان سب کا ادب تو بے حد کیا لیکن ان کی ادبی اہمیت کا کچھ احساس یا اندازہ نہیں تھا اور چونکہ یہ ایک بہت متقی قسم کا گھرانہ تھا، یہاں محافل نا ؤ نوش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دراصل آزادی سے قبل ہمارا معاشرہ زیادہ تر نہایت ہی صالح قسم کا معاشرہ تھا۔ ماہرین عمرانیات کو جاننا چاہیے کہ سیاسی زلزلے نے ذہنوں کو بھی کس طرح اور کس حد تک متاثر کیا کہ ہم اچانک ایک صارفی دور میں داخل ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی ترقی پسند تحریک جو آزادی سے چند سال قبل ہی شروع ہوئی تھی اسی سرعت کے ساتھ معدوم ہوئی، ان ساری تبدیلیوں کا اثر ہمارے ادب پر بھی پڑا۔ یہ واقعہ

ہے کہ تخلیقی ادب کرائسس کے زمانوں میں پھلتا پھولتا ہے۔ مصوروں اور موسیقاروں کو پرامن زمانوں کی ضرورت ہے۔ قلم کار کا دماغ ہی اس کا اسٹوڈیو بھی ہے اور جلسہ گھر بھی۔ اسے اپنے سامنے جیتے جاگتے حاضرین اور سامعین کی بھی ضرورت نہیں وہ تنہائی میں اپنا کام کرتا ہے۔ اسی تنہائی سے اپنے پیغامات دنیا کو بھیجتا رہتا ہے اور ایک دن خاموش ہو جاتا ہے۔ لکھنا ایک بے حد انفرادی عمل ہے لیکن اسی کے ذریعے لکھک اجتماعی زندگی میں اپنا اہم رول ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے دور کی سیاسی اور دوسری تحریکوں کا اثر قبول کرتا ہے یا ان سے الگ بھی اپنی ایک راہ بناتا ہے۔ بعض دفعہ یہ راہ بالکل غیرارادی طور پر بنتی ہے مثلاً جب میں نے لکھنا شروع کیا تو ترقی پسندی کے عروج کا دور تھا، بیشتر ادیبوں نے سطحی مارکسیت کو اپنے اوپر اوڑھ لیا تھا۔ ڈگر سے ہٹ کر جو بھی چلا وہ رجعت پسند۔ مجھے اب تک یاد ہے اور میں اس کا پہلے بھی ذکر کر چکی ہوں۔ چونکہ جو باتیں بہت دکھی کرتی ہیں وہ ہمیشہ یاد رہتی ہیں۔ میرے دو کزن جو انڈین پولس کے ایک اعلیٰ افسر کے بیٹے تھے، یہ دونوں بھائی زبردست سرخے بن گئے تھے۔ ایک دن وہ ایک ضخیم کتاب لے کر آئے جس کا گردوپوش سرخ رنگ کا تھا۔ کتاب کا عنوان تھا 'مل کے سایے میں'۔ اندر اس وقت کے تمام نامی گرامی ترقی پسند اہل قلم کے افسانے شامل تھے۔ دیباچہ کرشن چندر نے لکھا تھا جس میں انھوں نے 'میرے بھی صنم خانے' کا تذکرہ کیا تھا جو ان ہی دنوں چھپ کر آئی تھی۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ اس ناول میں ڈرائنگ روم، تعلقہ داروں اور ڈنر پارٹیوں وغیرہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ مجھے اصل الفاظ تو یاد نہیں مطلب یہی تھا۔ مجھے یہ پڑھ کر بہت صدمہ ہوا اور تعجب بھی کہ اتنے بڑے بڑے ادیب اتنی سطحی بات بھی کر سکتے ہیں اور وہ افسانے کے متن کی گہرائی میں جانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ میں اس وقت بہت کم عمر تھی لیکن مجھے کچھ اندازہ ہوا کہ ادب میں اب بھیڑ چال زیادہ ہو گئی ہے۔ انفرادی آوازوں کی گنجائش رہی ہے نہ اہمیت، لیکن میں لکھتی رہی چونکہ یہ میرا ایک پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ایک بہت ہی بچکانی متوسط طبقاتی ترجیحات کی بھی تیار کی گئی جس میں ایک طبقے کی بالادستی کا تذکرہ تھا، اور ان کی موٹر کاروں اور پارٹیوں کو ہدف ملامت بنایا جاتا تھا لیکن 1956 میں جب میں بمبئی گئی تو میں نے ان ہی اہل قلم کو فلم انڈسٹری میں شمولیت کی وجہ سے موٹر

کاروں اور ڈنر پارٹیوں والی زندگی بڑے طمطراق سے گزارتے دیکھا۔

ہماری چنداں ممانی اکثر کہا کرتی تھیں اے ہے میں نے فلاں بات سنی یا فلاں چیز دیکھی تو میں قائل ہوئی۔ چنانچہ میں بھی بمبئی میں ان اہل قلم کے دوہرے معیار کو دیکھ کر بہت قائل ہوئی لیکن میرے دیکھتے دیکھتے زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ساز بدلے گئے۔ وہی نامور کامریڈ جو بات بات پر ٹاپ بورژواژی کا تذکرہ استہزائیہ انداز میں کرتے تھے اب انھوں نے کامریڈوں کی یہ اصطلاحات استعمال کرنی بالکل ترک کر دی اور اس دن تو مجھے بہت ہی حیرت ہوئی جب ایک نامور ترقی پسند ادیبہ نے مجھ سے فخریہ کہا کہ ان کی بیٹی کو اس کے منگیتر نے ہیرے کی انگوٹھی دی ہے جس کی قیمت بیس ہزار روپے ہے۔

تو ہمارے یہاں ترقی پسندی کا یہ غلغلہ دال چاول کا وقتی ابال ثابت ہوا۔ دراصل چند دانش وروں، یونیورسٹی کے طالب علموں اور اہل قلم کے انقلابی مضامین یا خیالات کسی ملک میں انقلاب نہیں لا سکتے یا سارا ہندستان اہالیان کیرالہ یا بنگال کی طرح پڑھا لکھا اور باشعور ہو تو تان آ کے ٹوٹی تعلیم پر اور فی الحال تعلیم کا رنگ کیسری ہوتا جاتا ہے... پس چہ باید کرد....

گزشتہ برسوں میں میرے جو انٹرویو لیے گئے ان سے بہ سرعت بدلتے ہوئے حالات کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ میں پہلے بھی یہ کئی دفعہ کہہ چکی ہوں کہ ہمیں اپنا موازنہ مغرب یا جاپان کے اہل قلم سے نہیں کرنا چاہیے۔ وہاں کا ادیب ایک تعلیم یافتہ پبلک کے لیے لکھتا ہے ان کے یہاں آبادیاں بہت کم ہیں اور تعلیم بہت زیادہ... ہمارے یہاں آبادی ایک ارب تک پہنچ گئی ہے اور تعلیم آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے بہت ہی خوش ہو کر نیوکلیئر بم بھی بنا لیا ہے۔ یہ صورت حال جتنی دہشت ناک ہے لوگ اس سے اتنے ہی بے پرواہ ہیں۔ پہلے ہندستان کے ادیب و شاعر چھوٹے چھوٹے مسائل کے لیے بطور احتجاج سڑکوں پہ نکل آتے تھے وہ نسل یا تو خاموش ہو گئی ہے یا اب دنیا ہی سے رخصت ہونے والی ہے۔ ان کی جگہ تیزی سے ایک جنگجو اور منفی قسم کے جارحانہ خیالات والی نوجوان پیڑھی سامنے آ رہی ہے۔ ہمارے اہل دانش نے ابھی اس انتہائی خطرناک صورت حال کا بھی شاید باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا ہے۔ ایسے موقع پر ادب،

آرٹ، فلسفہ یا ان کی خدمت عجب مسخرے پن کی بات معلوم ہوتی ہے۔ فرقہ پرستی کا جنون جس حد تک لوگوں پر طاری ہو چکا ہے اس کا بھی ہمیں صحیح اندازہ نہیں ہے۔ طوفان نوح بڑھیا کے تنور سے نکلے گا؟

میں نے آج سے مدتوں قبل ایک سرسبز، پرفضا، پرسکوں، دلآویز مقام کی سیر کی جسے اجودھیا کہتے ہیں۔ میں ہائی اسکول کا امتحان دینے کے بعد اپنے ماموں کے یہاں فیض آباد گئی ہوئی تھی جہاں وہ چھاؤنی میں انڈین آرمی کے ایک میجر کی حیثیت سے مقیم تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں تعمیر کی ہوئی ان وسیع و عریض نیچی کرسی والی کوٹھیوں کے گرد ایک سے ایک خوبصورت لان اور باغات لہلہا رہے تھے۔ ایک روز ہم لوگ اجودھیا گئے اور رام مندر دیکھا۔ باہر ایک بے حد گھنے چھتنار برگد کے نیچے چبوترے پر ایک ملاجی اطمینان سے بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کے ان کے پاس ایک پنڈت جی بھی آ گئے۔ دونوں کو سیاحوں سے بخشش ملنے کی امید تھی۔ اب مجھے یہ یاد نہیں کہ مندر میں تالا پڑا تھا یا نہیں۔ بہر حال وہ ایک نہایت پرسکوں اور پرفضا مقام تھا۔ ایودھیا، اودھ، رام لکشمن اور سیتا کا دیش۔ میرا بچپن مشرقی اضلاع میں گزرا جو رامائن کی سرزمین ہے جہاں ہر تیسرے آدمی کا نام رام اور تیسری عورت کا نام سیتا ہے۔ ہماری کوٹھی کے مالک سیٹھ سیتا رام تھے جو شہر کے اندر ایک تنگ و تاریک مکان میں رہتے تھے اور ہمارے ایک پنکھا قلی کا نام بھی سیتا رام تھا۔ وہاں ہنود ایک دوسرے کو رام رام کہہ کر سلام کرتے ہیں۔ رام لیلا کے موقع پر دو لڑکے چہرے پر سفید پاؤڈر لگا کر رام اور لکشمن بنتے تھے اور ہمارے ہندو معززین شہر جا کر ان دونوں کو پرنام کرتے تھے۔ رام لیلا کے کرداروں کا روپ دھارن کرنے میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ وہیں پر ہمارے ڈرائیور نے ایک لطیفہ بیان کیا کہ ایک بار کارڈ بورڈ کے پہاڑ کو بڑھئی نے کیلوں کے ذریعہ نہایت سختی سے جڑ دیا تھا۔ کئی لڑکے ہنومان جی بنے تھے۔ ان سب نے باری باری وہ پہاڑ اکھیڑنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ جب ایک مسلمان لڑکے کی باری آئی جو ہنومان جی بنا تھا اس نے آگے جا کر زور سے ایک نعرہ لگایا 'یا علی' اور پہاڑ اکھیڑ دیا۔ بہت تالیاں بجیں۔

چنانچہ 'یا علی' پکارنے والے ہنومان جی کی یہ کلچر بہت اچھی طرح پھل پھول رہی تھی مگر 1947 میں لوگ گڑبڑا گئے۔ پھر بھی ہمارے اضلاع کے دیہات میں یہ تہذیب موجود ہے ابھی تین چار سال قبل میں نے اودھ کے ایک گاؤں میں آدھی رات کے بعد نہر کے کنارے بیل گاڑیاں جاتی دیکھیں جن پر مرصع تعزیے لدے ہوئے تھے۔ محرم آنے والا تھا۔ یہ سارے تعزیے اہل سنت کے گھروں میں دس دن تک رکھے جائیں گے۔ یہ تعزیوں، پیروں، فقیروں اور درگاہوں اور رام لیلاؤں کی کلچر ہماری اصل کلچر ہے اور بڑی نعمت ہے اور اسے ہرگز ہرگز مٹنے نہیں دینا چاہیے۔ نہ یہ بدعت ہے نہ اوہام پرستی، نہ شرک، نہ بت پرستی، یہ محض ہمارے عوام کا تہذیبی سرمایہ ہے۔ جب اسپین یا اٹلی میں کورپس کرسٹی کے جلوس نکلتے ہیں تو ہم پر بہت رعب پڑتا ہے چونکہ وہ گوروں کا مذہب ہے۔ یا جب ویسٹ منسٹر ایبے کے اندر تاج پوشی سے پہلے لاٹ پادری ملکہ الیزابتھ کے سر پر تیل ڈال کر وہ قدیم عبرانی رسم ادا کرتا ہے جس کے ذریعے کنعام و فلسطین کے بادشاہوں کو جس کے بعد تخت نشیں کیا جاتا تھا تو آج کا انگریز لاٹ پادری یعنی Arch-Bishop of Canterbury ملکہ الزبتھ کے سر پر ایک چمچہ تیل انڈیلتے ہوئے مطلق نہیں شرماتا اور سر پر تیل سے مسح کر کے بادشاہ بنانے کی اسی رسم اور اسی لفظ مسح سے مسیح نکلا ہے یعنی مسح کیا جانے والا۔ ہمارے یہاں بھی مسح وضو کے فرائض میں شامل ہے۔ ان کی اور ہماری تہذیبوں کا منبع ایک ہے۔ یعنی ہمارا ابا اور ان کا ایبے (Abbey) اور ایبس (Abbess) بھی لفظ ابا پر مبنی ہے۔ دور حاضر کے اسرائیلی لیڈر کا نام ایبان Eban تھا۔ مسیحی روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ نے مصلوب ہونے کے بعد تکلیف کی شدت سے چلا کر پکارا تھا ابا...ابا...لما سبقطنی یعنی ابا...ابا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ یعنی بہ الفاظ دیگر حضرت عیسیٰ اللہ میاں کو ابا کہتے تھے۔ یعنی یہی نظریہ تثلیث کی بنیاد ہے۔ باپ، بیٹا اور روح القدس۔ تو گویا جب برصغیر کے مسلمان گھرانوں کے بچے اپنے باپ کو ابا کہہ کر پکارتے ہیں تو وہ حضرت عیسیٰ کے ہم زبان ہیں۔ لفظ کہاں سے کہاں تک کا سفر کرتا ہے۔ مذہبی نظریات اور تاریخی فاصلوں سے الفاظ کے معنی بدل گئے اور ان کی دنیائیں مختلف ہو گئیں۔

الزابتھ نام کو لیجیے۔ ایل ایلی الٰہی، اللہ قدیم عبرانی الفاظ ہیں۔ الزابتھ کے لغوی معنی ہوئے اللہ رکھی یعنی ایل-ایلی زبتھ...رکھنا، بیٹھنا۔ یعنی یہ الفاظ ہمارے الفاظ کی دنیا سے بہت قریب ہیں لیکن جس تمدن کی وہ نمائندگی کرتے ہیں ہم سے وہ بہت مختلف مغربی تمدن ہیں۔ اسرائیل کے ایک وزیر کا نام ہی ابا، ایبان تھا۔ اب جو تمدن ابا کے نام کے ساتھ ہمارے آنکھوں کے سامنے آتا ہے وہ خالص ہندستانی (یا پاکستانی) ہے۔ لیکن ابا، ایبان لفظ وہی ہے اس سے منسلک دنیا بالکل ہم سے علاحدہ ہو چکی ہے۔ اسی طرح لفظوں کے معنی بھی بدلتے رہتے ہیں۔ جو الفاظ یا اصطلاحات ہمارے لڑکپن میں مستعمل تھیں وہ اب متروک ہو چکی ہیں۔ ہمارے یہاں کار کو موٹر اور گیراج کو موٹر خانہ کہا جاتا تھا۔ کوٹھی میں پینٹری یا آبدار خانہ ہوتا تھا، باہر احاطے میں موٹر خانہ۔ حال ہی میں، میں نے ایک لڑکی سے پوچھا کہ تمھارا موٹر خانہ کس طرف ہے تو ہنسنے لگی اور بولی موٹر خانہ کیا چیز ہے؟ ہمارے یہاں بیرے کو سردار کہا جاتا تھا وہ سارے ملازموں کا ہیڈ تھا۔ ہمارے آخری سردار غازی پور میں عبدل تھے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی کلچر کے پروردہ تھے اور تھوڑی بہت پکچن انگلش بھی جانتے تھے۔ جب لنچ یا ڈنر کے لیے بلاتے تو فرماتے کھانا میز پر، یہ فقرہ بھی کمپنی کلچر کی باقیات میں شامل تھا اور انھوں نے خود ہی لطیفہ بیان کیا تھا کہ ایک تازہ وارد انگریز افسر نے سمجھا کہ میز پر کا مطلب ہے تیار ہے تو اس نے عبدل کو آواز دی گھوڑا گاڑی میز پر؟ یعنی تیار ہے؟ یہ 'کوئی ہے' کی کلچر تھی۔ خود میں نے بچپن میں اپنے ایک بزرگ عزیز کو کوئی ہے پکارتے سنا یا وہ محض آواز دیتے تھے یہاں آؤ۔ ملازم کا نام لے کر پکارنا کسرِ شان سمجھا جاتا تھا۔ انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے اضلاع میں اپنی سول سروس کے عہدہ داروں کی جو کلچر تخلیق کی وہ ساری دنیا میں منفرد تھی۔ ڈچ، جرمن، فرنچ، نو آبادیوں کی کولونیل آقاؤں نے اپنی محکوم ایشیائی اور افریقی آبادیوں کو باقاعدہ ان پڑھ اور جاہل رکھا جبکہ ایک ہندستانی اس زمانے میں ممبر آف پارلیمنٹ بن گیا اور آکسفورڈ اور کیمبرج ان کے لیے گھر آنگن بن چکے تھے۔ انگریزوں کی یہ کشادہ دلی ان کی لبرل ازم کے نظریے کی مرہونِ منت تھی۔ بے شک انھوں نے یہاں نسل پرستی کا بھی خوب خوب مظاہرہ کیا، بہت سے طعام خانوں اور ریل کے ڈبوں پر لکھا ہوتا تھا فار یورپین

اونلی، لیکن اس کے باوجود وہ تاریخ کے سب سے زیادہ روشن خیال کولونیل آقا ثابت ہوئے۔ انگریزی تعلیم نے ہماری دنیا بدل دی۔ بقول ملک راج آنند اگر شیلے اور کیٹس نہ ہوتے تو ٹیگور بھی نہ ہوتے۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ محکوم اقوام آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنے سابق آقاؤں کی زیادتیاں تو یاد رکھتی ہیں ان کی نیکیاں بھول جاتے ہیں۔ یہی مغلوں کے ساتھ ہوا۔ مغلوں نے جو نیکیاں اس ملک کے ساتھ کیں انھیں کوئی یاد نہیں کرتا۔ انھوں نے طرز حیات میں جو نفاستیں یہاں متعارف کیں ان کو بھی کوئی نہیں پہچانتا۔ اعلیٰ تہذیب کے جو اسباق انھوں نے پڑھائے وہ بھی بھولتے جا رہے ہیں۔ چمن بندی، آداب نشست و برخاست، دسترخوان پر ساتھ بیٹھ کر کھانا تناول کرنا، ماں کو تو کے بجائے آپ سے مخاطب کرنا۔ ماں تو کیا کہہ رہی تھی اور ای جان آپ کیا فرما رہی تھیں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ لیکن یہ فرقہ جو اپنی کلچر کی وجہ سے ممتاز تھا اب نامساعد حالات کا شکار ہو کے اپنی بدتمیزیوں کی وجہ سے جانا جاتا ہے یا اپنے مذہبی جوش کے جا و بے جا اظہار کے لیے۔ دو مرتبہ میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ ایک صاحب چلتی ٹرین کی کوریڈور میں بیٹھ کر وضو کر رہے ہیں اور سارے میں پانی بہا رہے ہیں جس کی وجہ سے دوسرے مسافروں کا آنا جانا مشکل ہو گیا کیا وہ تیمم نہیں کر سکتے تھے؟ نامساعد حالات کیا رفتہ رفتہ انسانوں کا آئی کیو بھی بتدریج کم کرتے جاتے ہیں۔ مجھے اس دن بڑی کوفت ہوئی جب ایک صاحب کی کسی بے وقوفی کی وجہ سے اسپرنٹ کے دفتر میں میرے مہاراشٹرین رفیق کار نے مجھ سے کہا فکر کی کوئی بات نہیں ہم اس کیمونٹی کو کلچر سکھا دیں گے۔ عہد نامہ قدیم میں ایسی ایسی آفاقی صداقتیں موجود ہیں تعجب ہوتا ہے کہ ولادت مسیح سے ایک ہزار سال قبل بھی دنیا کے حالات وہی تھے جو آج ہیں اور اس میں کئی جگہ ان لوگوں کا ذکر آیا ہے جو پہلے سیاسی اقتدار کے مالک تھے اور اب وہ پانی بھرنے والے اور لکڑیاں چیرنے والے بنا دیے گئے۔ Drawers of Water and hewers of wood یہ قدیم واقعہ تاریخ میں بار بار دہرایا گیا ہے اور آج بھی ہمارے اپنے ملک میں اس کے مناظر موجود ہیں۔

سنہ 1953 سے لے کر آج تک جتنے انٹرویو اخبارات و رسائل کے لیے کیے گئے ان میں

سے چند اس کتاب میں شامل ہیں۔ بی بی سی لندن، ماسکو، تاشقند، تہران، ہانگ کانگ، سڈنی، پاکستان اور امریکہ کے مختلف شہروں میں ریڈیو یا پریس کے لیے جو انٹرویو کیے گئے ان کی شمولیت ممکن نہیں تھی پھر بھی جمیل اختر صاحب نے بڑی محنت اور کاوش سے جانے کہاں کہاں سے کھود کر یہ انٹرویوز نکالے جس کے لیے ان کی ہمت کی داد دینی چاہیے۔ دراصل اس قسم کی ادبی مہم کا بیڑا اٹھانا فرد واحد کی اپنی ہمت پر منحصر ہے۔ مولف کی محنت اور اردو ادب کے موجودہ سیاق وسباق پر ان کی گہری نظر یقیناً قابل تعریف ہے۔

جے 140، جل وہار
نوئیڈا، سیکٹر-25

قرۃ العین حیدر
19 اکتوبر 2001

مقدمہ

قرۃ العین حیدر کی کلیات سازی کا کام میں نے ان کی اجازت سے ان کی حیات میں ہی شروع کر دیا تھا۔ افسانوں اور ناولٹ پر مشتمل تین جلدیں اور ایک نیا افسانوی مجموعہ 'قندیل چین' ان کی حیات میں ہی شایع ہو چکا تھا لیکن عینی آپا اس کی خوشی نہ دیکھ سکیں کتاب شایع ہونے کے فوراً بعد خرابی صحت کی وجہ سے داخل اسپتال ہوئیں اور پھر جاں بر نہ ہو سکیں اور اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ ان کے انتقال کے بعد بھی میں اپنے کام سے کبھی غافل نہیں رہا۔ بلکہ اپنے محدود وسائل میں رہ کر کام کرتا رہا۔ اس لیے کہ کوئی ادارہ پروجیکٹ مکمل ہونے پر کتاب تو شایع کر دیتا ہے لیکن بنیادی مآخذ کی تلاش و جستجو کے لیے جو اصراف خطیر ہوتا ہے اس کا بار اٹھانے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہ اردو ادب کی افسوس ناک صورت حال ہے۔ ایسی صورت میں کسی فرد واحد کے محدود وسائل سے کوئی بڑی امید کرنا بعض وقت مایوسی کا سبب ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی فرد واحد انجمن اور ادارے سے بڑھ کر ثابت ہوتا ہے اور اس کا یہی نادر کارنامہ فرد کی انفرادیت کو ادب کے افق پر اجاگر کر کے اس کی الگ شناخت کا باعث ہوتا ہے اور ادبی تاریخ ایسے منفرد جیالوں سے جگمگا رہی ہے۔ ورنہ اردو ادب کی دگرگوں صورت حال میں اس کی ساری وراثت تہہ و بالا ہو جاتی اور سارا سرمایہ تہہ تیغ ہو جاتا۔ لیکن

ادبی ذوق وشوق رکھنے والے افراد نے بے سروسامانی کے عالم میں ایسے محیر العقول کارنامے انجام دیے جس کی نظیر کسی اور زبان کے ادب میں مشکل ہی سے ملے گی۔ بار بار مغرب کا حوالہ دینے اور مغرب کی نقالی سے اردو ادب کی اصناف کو مالا مال کرنے والوں نے مغرب کی طرز فکر اور ان کے طرز عمل کو تحقیق وتنقید کے لیے معیار کیوں نہیں بنایا جس سے اردو ادب کی پس ماندگی کو دور کیا جا سکتا اور اعلیٰ ادب اور اعلیٰ تحقیق وتنقید کے لیے فضا سازگار ہوتی۔ گفت وشنید کی حد سے آگے، عملی طور پر یہ معاملہ کبھی جا بھی سکے گا؟ شاید کبھی ایسا ہوا تو وہ اردو ادب کی خوش حالی کا دن ہوگا۔

قرۃ العین حیدر کی وفات کے بعد ان کی کلیات کو مکمل کرنے کا کام چیلنج سے بھرا ہوا ہے۔ عمر بھر اپنی اور ہندستانی وراثت کے بکھرے ہوئے باب کو مجتمع کرنے والی خاتون کی اپنی وراثت کی محافظت خطرے میں ہے۔ اس بے بسی پر ادب کی رکھوالی کرنے والے ادارے وافراد کیا اپنی آنکھیں خشک کرلیں گے۔ چھوڑی ہوئی دولت پر دعویٰ کرنے والے تو بچاسوں رشتہ دار جس کے نہیں بھی ہوں تو بھی نکل آتے ہیں، لیکن ادبی وراثت کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اس کی اولاد بھی۔ میں نے یہ صورت حال اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ قرۃ العین حیدر جن کے رشتے دار دنیا کے کئی براعظموں میں پھیلے ہوئے ہیں اور قرۃ العین حیدر کا ادبی سرمایہ بھی دنیا کے کئی ملکوں میں پھیلا ہوا ہے، ہندستان اور پاکستان کی حد تک تو میں جانتا ہوں کہ کسی رشتہ دار میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اس عظیم کام کو منصوبہ بند طریقے سے کر سکے۔ ہاں دنیاوی دولت پر قبضہ ان کی زندگی میں ہی ان کی خدمت کرنے والوں نے کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور ان کے مرنے کے بعد وہ تاریخی مکان جس میں مصنفہ نے آخری سانس لی تھی اور جسے انھوں نے اپنے پیسوں سے خریدا تھا، اسے فوراً ہی بیچ ڈالا۔ اس حادثے پر جتنا بھی غم کریں کم ہے۔ انگلستان میں ادیبوں کے محفوظ مکان کا معائنہ کرنے والی خاتون کی اپنی ذاتی وراثت اتنی جلد بے نام ونمود ہو جائے گی، ایسا انھوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔ آج ان کی روح اس واقعہ پر سخت تکلیف محسوس کر رہی ہوگی کہ جس بات کے لیے میں زندگی بھر لڑتی رہی، احتجاج کرتی رہی، آج وہی بات، وہی حادثہ، تاریخ کی وہی المنا کی میرے ہی ساتھ پیش آئی۔ عبرت ناک... عبرت ناک... سروم دکھم دکھم...

•

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

قرۃالعین حیدر اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

''بانو کے مکان کی تاریخی اہمیت کا مجھ کو بے حد احساس تھا۔ گزشتہ ادوار میں اسی مکان کے آس پاس ان زمانوں کے نامور شعراء کے مکانات بھی موجود تھے۔ وہ کیسا پرفسوں زمانہ رہا ہوگا۔ انگلستان، فرانس، جرمنی اور روس کے اہل نظر نے اپنے عہد رفتہ کے مشاہیر کے مکانات کو اسی طرح سجا بنا کے رکھا ہے اور میں یہ رونا ہمیشہ روتی رہتی ہوں کہ مرزا غالب کے مکان میں کوئلے کی دکان کھل گئی۔''

اسی مضمون میں آگے چل کر اس موضوع پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

''راجستھان کے دور اندیش چھوٹے بڑے راجاؤں نے اپنے محلات اور حویلیاں ٹورسٹ انڈسٹری میں شامل کر دی ہیں لیکن لکھنؤ کا قدیم تعمیراتی سرمایہ غائب ہوتا جا رہا ہے۔ میں پہلے بھی یہ نوحہ گری کر چکی ہوں کہ علی گڑھ کے وہ پھوس والے بنگلے جو جان کمپنی نے بنوائے تھے اور انگریزی سرکار نے کالج کے لیے سرسید کی نذر کر دیے تھے، ان کے موجودہ وارثوں کے خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے ان کو نذرِ آتش کر دیا۔

لندن کے ایک میوزیم میں ایک بہت بڑا کمرہ سترہویں صدی کے ساز و سامان سے اس طرح سجایا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مکین ابھی ابھی اٹھ کر باہر گئے ہیں۔ یہ کمرا نشیب میں ہے اور اس پر چھت سے ذرا نیچے چاروں طرف گیلری ہے۔ تماشائی اس گیلری میں کھڑے ہو کر نیچے اس کمرے کی ایک ایک چیز کو بغور دیکھ سکتے ہیں۔

اسی طرح میں نے امریکہ کے ایک عجائب خانے میں گزشتہ کسی صدی کا کمرہ ایسا پایا جس میں ایک متوسط الحال خاندان کا Living Room کے طور پر سجایا گیا تھا جس میں آتش دان کے پاس دادی اماں کی آرام کرسی اور اس کے برابر میز پر ان کی عینک اور سینے پرونے کی ٹوکری بھی موجود تھی۔ انگلستان اور یورپ میں گزشتہ صدیوں کے شاعروں اور ادیبوں کے مکان ان ہی کے ذاتی سامان یا اس کی ہو بہو نقل سے آراستہ

کیے گئے ہیں۔ میں یہ بھی لکھ چکی ہوں کہ روس میں پشکن کے گھوڑے کی
ایال کو جس چوبی کنگھے سے سنوارا جاتا تھا وہ کنگھا بھی محفوظ ہے۔ جس
زمانے میں ہمارے ترقی پسندوں نے ہر پرانی چیز کو منسوب کیا، اس وقت
تک شاید ان میں سے کوئی بندہ روس نہیں گیا تھا۔
چنانچہ عزیز بانو کا مکان بھی لکھنؤ کے چند اور مکانات کی طرح
National Heritage میں شامل کرنا چاہیے تھا۔ میں تو ان کو ضرور یہ
رائے دیتی مگر وہ خود ہی غائب ہو گئیں۔''

قرۃ العین حیدر کا مکان بھی نیشنل ہیریٹج میں شامل ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ تاریخ کی یہ دردناکی شاید انسان کا مقدر ہے۔ تاریخ کے بہاؤ اور وقت کی جبریت کا قہر جب سونامی کی صورت میں نازل ہوتا ہے تو سب کچھ تاخت و تاراج کر دیتا ہے اور انسان محض ایک بے بس تماشائی کی طرح حیرت و استعجاب سے آنکھیں پھاڑے سب کچھ دیکھتا رہتا ہے۔ کبھی تو اس عبرت ناک منظر پر چند آنسو نکل بھی آتے ہیں اور کبھی استعجابی شدت سے آنسو خشک ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کی اس بے بسی اور دردناکی کی گہرائیوں میں بار بار ڈوب کر حقیقت کا ادراک کرانے والی خاتون کو کیا پتہ تھا کہ صدیوں سے دہرائی جانے والی اس کہانی کا انجام اتنا دردناک ہوگا۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل

آج قرۃ العین حیدر کی برسی پر چراغاں کرنے والے بھی نہیں رہے۔ عقیدت کے دو پھول چڑھانا تو دور کی بات ہے۔

مونس ہے بعد مرگ کسی کا جہاں میں کون
دو پھول بھی لحد پہ کوئی دھر نہ جائے گا

کیا قبرستان کا یہ سناٹا بھی ادبی سرگوشیوں میں تبدیل ہو کر انھیں خراج عقیدت پیش کر سکے گا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدم کہ بہار آخر شد

اردو ادب کی جلیل القدر اور عظیم المرتبت مصنفہ لحد میں ضرور خوابیدہ ہے لیکن ان کے چاہنے والے انھیں اتنی جلد فراموش کر دیں گے، اس کا گمان بھی نہ تھا۔ لیکن حقیقت اور سچائی بڑی جابر چیز ہے۔ جب سامنے آتی ہے تو بھرم تار تار کر دیتی ہے۔ آج وہ بھرم تار تار ہو گیا جو داستان طراز تھی۔ وہ خود داستانِ عہد گل ہو گئی۔ تاریخی بصیرت کا رفیع الشان احساس دلانے والی تخلیقی ہستی کا اس طرح ناپید ہونا دوسروں کے لیے زبردست عبرت کا مقام ہے۔ کیا وقت اس حیرت و استعجاب کو کم کر سکے گا؟ ہمیں اس لمحے کا انتظار رہے گا۔

آج قرۃ العین حیدر دانش گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اس تاریخی قبرستان میں جہاں انھوں نے علم و ادب کی عظیم المرتبت ہستیوں، دانشورانِ ملت اور بانیانِ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے درمیان پناہ لی ہے، سے باہم مشاورت ضرور کر رہی ہوں گی کہ آخر یہ ستم ظریفی ہماری قوم میں ہی کیوں ہے۔ تاریخی حامل کی عظیم المرتبت ہستیوں کے درمیان رہ کر بھی اس قدر بے بسی کا احساس کیوں ہو رہا ہے۔ یہ قوم اپنے لعل و گہر کی عظمت کو کب پہچانے گی؟ کب انھیں عزت و توقیر ملے گی؟ میں تو یہاں اس لیے آئی تھی کہ ان لوگوں کے درمیان میں کبھی فراموش نہیں کی جاؤں گی۔ میں نے اپنا سارا ادبی سرمایہ اس دانش گاہ کو اس لیے بخش دیا تھا کہ کم از کم ہر برس یہ لوگ میری لحد پر عقیدت کے دو پھول ہی ڈال کر میری عزت افزائی کریں گے۔ لیکن یہ تو میرا میوزیم (آرکائیو) بنا کر بیٹھ گئے۔ میرے نام کا گیٹ بھی وہاں بنایا جہاں علم و ادب کی ہستیوں کا گزر ہی نہ ہو۔ بھلا اسٹیڈیم سے متصل گیٹ سے میرے نام کی کیا نسبت؟ دانش گاہ کا مین گیٹ جہاں غالب غزل سرا ہیں اگر میرے نام کا ہوتا تو شاید کچھ مناسبت بھی معلومات ہوتی کہ میں وہاں سے شعبۂ اردو پر بھی نظر رکھ سکتی اور وہاں کی ادبی سرگرمیوں پر بھی، پھر تو میری روح بھی خوش ہوتی اور میری ہستی کا وجود اس طرح ریزہ ریزہ نہیں ہوتا۔

تاریخی بصیرت کی حامل ہستیوں کا یہ حشر عبرت ناک ہے۔ غالب کی حویلی کی بازیابی کے لیے صدیوں تک تحریک چلی پھر حکومت نے موقع پرستی کی سیاست سے فائدہ اٹھانے کے لیے واگذاری کی بھی، وہاں تو معاملہ غاصبانہ قبضے کا تھا اس لیے واگذاری ہو گئی۔ یہاں تو مکان

فروخت کر دیا گیا ہے جس کی واگذاری ممکن ہی نہیں۔ تاریخ کی بوالعجیاں بھی عجیب وغریب ہیں۔ عظمت رفتہ پر تاسف کرنے اور آنسو بہانے والی ادیبہ ڈھائی ہزار سالہ ہندستانی تاریخ کے وقوع کو کھنگالنے کے بعد کف افسوس ملنے کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا تو میرا ماضی، میرا عظیم الشان ماضی، میری عظیم الشان روایات کی یاد کر کے اس پر آنسو بہا کر دل کو مطمئن کر لیا۔ یہاں تو ماضی کی عظیم الشان روایات سے حال کا عظیم الشان رشتہ باقی رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن زر پرستی کی حوس میں، ہندستانی تہذیب وثقافت کی بقاوتحفظ کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دینے کے صلے میں انھیں انعام بھی کیا دیا کسی دوسرے نے نہیں خود ان کے اپنوں نے جو ان کے جذبات اور ان کی عظیم الشان تخلیقی وراثت کی قدر وقیمت کو پہچان نہ سکے جو کل تک ہماری عظمتوں کی پہچان تھے اور جس پر انعام واکرام کی بارش ہو رہی تھی اور آج خود ان کے اپنوں نے ان کی وراثت کی پامالی کر کے ان کی عظمتوں کو داغ دار کر دیا ہے۔ اب تو لعنتوں کی بارش ہوگی، مگر کس پر۔ یہ وہ مقام عبرت ہے جس سے ہر کسی کو سبق لینا چاہیے۔

قرۃ العین حیدر پر میں جب بھی قلم اٹھاتا ہوں تو زندگی کے ان کے مشن کے تحت میں بے حد جذباتی ہو جاتا ہوں۔ اور میں قطعاً یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی کی عظمت کو خواہ اس کا اپنا ہی کیوں نہ ہو داغ دار کرے۔ دنیا ان کو عزت کے منڈولے میں بٹھانا چاہتی ہے اور اپنے ہیں کہ قدر کرنا ہی نہیں جانتے۔ ہاں تو بات کلیات سازی کی چل رہی تھی اور موضوع بہک کر کہاں سے کہاں چلا گیا۔ سوال وراثت کی حفاظت کا تھا۔ میں نے اپنے ناتواں کندھوں پر اس بار گراں کو اٹھا تو لیا ہے لیکن کیا وسائل کے بغیر کئی ملکوں میں بکھری ان کی تحریری وراثت کو مکمل طور پر سمیٹنا ممکن بھی ہو سکے گا۔ میرے خیال میں اس کا سیدھا سچا جواب نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی میں یہ کوشش کیوں کر رہا ہوں۔ صرف اس لیے کہ زندگی میں کسی پر اتنا اعتماد آپا نے نہیں کیا جتنا مجھ پر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کلیات کی تدوین جیسے مشکل کام کے لیے خود سے میرا انتخاب کیا اور میں نے ان کی زندگی میں اس اعتماد کو وقار بھی عطا کیا۔ اور کلیات کی تین جلدیں سجا سنوار کے انھیں پیش بھی کر دیں۔ اب سوال آگے کا ہے۔ مجھے اکثر ایسا لگتا ہے کہ وہ مختلف صورتوں میں اپنی تحریروں میں جلوہ گر ہو کر مجھ سے

سوال کرتی ہیں کہ باقی بچا کام کب ہوگا؟ بس یہی بات مجھے کچوکے لگاتی ہے۔ میں نے آپا سے وعدہ کرلیا ہے کہ مجھ سے جہاں تک بن پڑے گا میں اس کام کو ضرور انجام دوں گا۔

ان کے انتقال کو آٹھ سال بیت گئے۔ اس بیچ میں تنکا تنکا جمع کرتا رہا۔ اب جا کر اتنا کچھ جمع ہوسکا کہ آپا کو خراج عقیدت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ شاید میری یہ کاوش علم وادب کے قدر دانوں میں ان کا اعتماد مضبوط کر سکے گی۔ یہ کوشش فرد واحد کی ضرور ہے لیکن یہ کام انسان کو ایک انجمن، ایک ادارہ بنا دیتا ہے۔ خدا کرے میری یہ سعی جمیلہ انھیں شہرت دوام عطا کر سکے اور علم وادب کے سرمایۂ افتخار میں بیش قیمت اضافہ ثابت ہو۔

کلیات کی پہلی چار جلدیں افسانے، ناولٹ اور ایک نیا افسانوی مجموعہ قندیل چین پر محیط ہیں۔ اب کلیات کی پانچویں جلد سے تقسیم کچھ اس طرح ہے۔

Vol. - 5 : رپورتاژ	Vol. - 9 : خاکے
Vol. - 6 : رپورتاژ	Vol. - 10 : انٹرویوز
Vol. - 7 : مضامین	Vol. - 11 : انٹرویوز
Vol. - 8 : مضامین	

اس کے علاوہ ان کے تراجم، بچوں کی کہانیاں، صحافتی مضامین، فلم ریویو، کتابوں پر تبصرے، خطوط اور دیگر دوسری چیزیں۔ یہ سب قصہ اگلے پڑاؤ کا ہے۔ سلسلہ تلاش وجستجو جاری ہے۔ تحقیق اپنی منزل طے کر رہی ہے۔ فی الوقت درج بالا سات جلدیں پیش خدمت ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے انٹرویوز کا یہ مجموعہ میری تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ان کو یکجا کرنے کے لیے اخبارات ورسائل کے فائلوں کی گرد جھاڑنی پڑی اور برسوں کی جہاں گردی اور دشت نوردی کے بعد یہ چیزیں ہاتھ آئی ہیں۔ پھر بھی یہ کہنا کہ تمام چیزیں حاصل ہوگئی ہیں، میرے خیال میں درست نہیں ہوگا۔ ابھی بھی بہت سی چیزیں ایسی ہوں گی جہاں تک میری رسائی کوششوں کے باوجود نہیں ہوسکی ہوگی۔

ان انٹرویوز کو جمع کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ محقق کو تلاش وجستجو کے جاں کاہ

مرحلوں کی اذیت ناکی سے نجات دلائی جاسکے اور ان کا قیمتی وقت ضائع ہونے سے بچایا جاسکے۔ اس لیے کہ قرۃ العین حیدر دورِ حاضر کی سب سے بڑی فکشن نگار قرار پا چکی ہیں اور ان پر تحقیق کا سلسلہ ہندو پاک کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی شروع ہو چکا ہے۔ کچھ تحقیقی کاوشیں مکمل بھی ہو چکی ہیں اور کچھ کتابیں بھی منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ لہٰذا مستقبل کے محقق کی پریشانیوں کو کم کرنے کی یہ ایک حقیر سی کاوش ہے۔

انٹرویوز میں چونکہ مصنف کے ذاتی خیالات اور نقطۂ نظر کا اظہار اور اس کی وضاحت ہوتی ہے اس لیے تحقیق میں اس کی بڑی اہمیت ہو جاتی ہے۔ بہت سے مشکل مسئلوں کا آسان حل یہاں نکل آتا ہے۔ بہت سے الجھے ہوئے نکتے سلجھ جاتے ہیں۔ حالاتِ زندگی اور تخلیقی کاوشوں کی بہت سی وضاحتیں یہاں مل جاتی ہیں۔ تخلیقی سفر کی داستان، تخلیقی محرکات، فلسفۂ زندگی اور فکر و فن پر نت نئے انداز میں بہت سے ان سوالوں کا جواب فراہم ہو جاتا ہے جو بعض وقت محقق کے ذہنوں میں ابھرتے تو ضرور ہیں لیکن جواب نہ ملنے کی صورت میں ادھورے اور تشنہ رہ جاتے ہیں۔

چونکہ انٹرویوز عموماً تین قسم کے سوالوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک تو ادیبوں سے ان کی شخصیت اور فن کے متعلق مختلف زاویوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، دوسرے ادب اور عصری مسائل کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو ہوتی ہے، تیسرے ادبی تحریکات اور ادب کی مجموعی صورتِ حال پر گفتگو کی جاتی ہے۔ کچھ قومی اور عالمی ادبی اور سیاسی تناظر میں بھی بات ہوتی ہے اس لیے کہ ادیب بالواسطہ نہ سہی بلاواسطہ ہی سہی ان معاملات سے ضرور تعلق رکھتا ہے اور اس کی فکر متاثر ہوتی ہے۔ اس طرح کبھی کبھی دلچسپ اور نئی بحثیں بھی چھڑ جاتی ہیں، ادبی اور غیر ادبی تنازعات بھی جنم لیتے ہیں اور بعض ایسی اہم باتیں ہوتی ہیں جو ادبی تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔ عموماً سوالات وہی ہوتے ہیں جن سے عصری ادب کو سامنا ہوتا ہے۔ عصری مسائل کی نوعیت یکساں ہوتے ہوئے بھی مختلف الخیال اور مختلف النظریات ادیبوں کے خیالات مختلف ہوتے ہیں اور مختلف زاویوں سے اس پر روشنی پڑتی ہے لہٰذا عصری ادبی صورتِ حال اور عصری مسائل کی جتنی تفصیلی آگہی ہمیں انٹرویوز سے حاصل ہو سکتی ہے یا ہوتی ہے کسی اور طریقے سے

حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ انٹرویوز میں شاعروں، ادیبوں، فن کاروں اور دانشوروں سے فکر انگیز مکالمات کے ذریعہ وہ باتیں اگلوائی جاتی ہیں جن کا اظہار کسی مضمون یا مقالے یا نجی گفتگو میں بھی ممکن نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے انٹرویو فکر انگیز مکالمات پر مشتمل وہ ادبی دستاویز ہے جس کی اہمیت کسی بھی دور میں کم نہیں ہو سکتی، بلکہ وقت گزرنے کے بعد اس کی اہمیت میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔

انٹرویوز کی اسی اہمیت کے پیش نظر میں نے قرۃ العین حیدر کے انٹرویوز کو یکجا کرنے کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی صورت دے دی۔ اس لیے کہ قرۃ العین حیدر کے نظریات، ان کی شخصیت اور فلسفہ زندگی پر جو تفصیلی معلومات ان انٹرویوز سے حاصل ہوتی ہے، خود ان کی تخلیقات اور تحریروں سے وہ روشنی فراہم نہیں ہوتی۔ وقت، تاریخ اور اپنی تخلیقی کاوشوں، فلسفہ زندگی پر جو فکر انگیز گفتگو قرۃ العین حیدر نے اپنے انٹرویوز میں کی ہے ان کی تفصیلات کہیں اور نہیں ملتی۔ ان پر تحقیق کرنے والا کوئی بھی محقق ان کے انٹرویوز کو پڑھے بغیر صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی ان کی تخلیقی کاوشوں کے بارے میں صحیح رائے ہی قائم کی جاسکتی ہے۔

اس کتاب میں شامل تقریباً تمام انٹرویوز ہند و پاک کے اہم ادبی رسائل و اخبارات میں شایع ہو چکے ہیں۔ صرف شفیع عقیل ایڈیٹر 'جنگ'، کراچی کا انٹرویو ایسا ہے جو کہیں شایع نہیں ہوا ہے اور سب سے پرانا بھی ہے۔ شہزاد منظر مرحوم نے بھی جس وقت اپنا انٹرویو مجھے دیا تھا اس وقت وہ شایع نہیں ہوا تھا لیکن بعد میں وہ بھی شایع ہو گیا۔ شمیم حنفی کا انٹرویو انگریزی میں تھا اسے ترجمہ کیا گیا ہے۔ محمد صادق، راجندر اپادھیائے اور پرویز احمد کا انٹرویو ہندی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

ان تمام انٹرویوز پر روایتی قسم کے عنوانات تھے جیسے قرۃ العین حیدر سے بات چیت، ایک مکالمہ، ایک ملاقات وغیرہ۔ عنوانات مختلف اور اچھوتے ہوں اس خیال سے میں نے تمام انٹرویوز کے عنوانات کی بنیاد قرۃ العین حیدر کے چبھتے ہوئے جملوں کو بنایا۔ اس سے انٹرویوز کے عنوانات کی یکسانیت ختم ہو گئی اور چبھتے ہوئے عنوانات سے ایک نیا پن بھی آ گیا۔ عنوانات اتنے

کھینچ سکتے ہیں کہ انھیں دیکھ کر انٹرویوز کو پڑھنے کی خواہش بے حس اور بے جان قاری میں بھی بیدار ہوگی، حساس قاری کی تو بات ہی الگ ہے۔

انٹرویوز کی تحقیقی اور تاریخی اہمیت مسلم رہے اس خیال سے ہر انٹرویو کے آخر میں رسالے کا نام اور ماہ و سال اشاعت درج کر دی ہے تاکہ سند رہے۔ قرۃ العین حیدر کے لاتعداد انٹرویوز ایسے ہیں جو ملک اور بیرون ملک کے مختلف ممالک میں ریڈیو اور ٹی وی چینلوں کے لیے ریکارڈ کیے گئے ہیں۔ چونکہ یہ تحریری شکل میں موجود نہیں ہیں لہٰذا ان کی شمولیت ممکن نہیں ہو سکی ہے۔ یہ تمام انٹرویوز بھی بے حد اہم ہیں لیکن ان کی دستیابی ایک بے حد مشکل مسئلہ ہے۔ اگر کبھی ممکن ہوا تو اس سمت میں پیش قدمی کی جائے گی۔ فی الحال اطلاعاً عرض ہے۔

'عادت پڑ گئی ہے نقادوں کو ادب میں حکمرانی کرنے کی' یہ عنوان راقم الحروف کے ذریعے لیے گئے انٹرویو کا ہے۔ یہ انٹرویو میری کتاب 'نوائے سروش' کی تیاری کے مرحلے میں 2001 میں لیا گیا تھا۔ ویسے ان تمام انٹرویوز کو پڑھنے کے بعد آپ کو اندازہ ہوگا کہ یکساں نوعیت کے بہت سے سوالوں کے جوابات پر مصنفہ کا نقطۂ نظر شروع سے اب تک ایک ہی رہا ہے۔ زمانے میں انقلابی تبدیلیوں کے رونما ہونے کے باوجود افراد و اشخاص کے رویوں میں ان کی منجمد فکر اور جامد سوچ کی وجہ سے رشتوں میں برتاؤ کی سطح پر جو ایک اڑیل رویہ رہا ہے اس نے سماجی ترقی کی راہ میں کافی رکاوٹیں کھڑی کی ہیں اور بہ سرعت تبدیل ہوتی ہوئی زندگی میں کافی اڑچنیں پیدا کی ہیں۔ زندگی کو دیکھنے، سمجھنے اور برتنے کے دوہرے ماپ دنڈ نے سماجی سطح پر کافی گڑبڑی پیدا کی، سماج میں پھیلے کنفیوژن نے ایک انتشار کی صورت اختیار کر لی۔ یہ صورت حال کسی بھی ملک اور سماج کے لیے فال نیک نہیں کہی جا سکتی ہے۔ انتشار اور افراتفری کی یہ صورت حال ہمیں قرۃ العین حیدر کے فکشن میں ملتی ہے۔ ان کے کردار کنفیوژن کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ انتشار میں بھی مبتلا نظر آتے ہیں اور ایک افراتفری کی فضا ان کے شروع کے افسانوں اور ناولوں میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ سماج کے تھمتے حالات اور بدلتے رخ سے انسانی رویوں میں جو تبدیلی ہوئی بعد کی تخلیقات میں اس کے نقوش ابھر کر سامنے آتے ہیں اور انسانی دکھ درد اور

کرب کی تاریخ نے جو کروٹ بدلی ہے اس کی دردانگیزی کو پوری شدت کے ساتھ قرۃ العین حیدر کی حسیت نے انگیز کیا ہے اور فن کے قالب میں ڈھال کر اردو فکشن کو ایک نئی زندگی بخش دی ہے۔ تاریخ کے جبر کو جس صبر کے ساتھ انھوں نے اپنے فکشن کی بنیاد بنایا ہے، وہ انھی سے مختص ہو کر رہ گئی ہے۔ ان کے فکشن کے اس کمال کو ادب میں دوام حاصل ہو چکا ہے۔

سیاسی منظرنامے کی تبدیلی سے سماجی رویوں میں جو بدلاؤ آیا، افراد و اشخاص کے برتاؤ میں جو فرق پیدا ہوا اس نے انسانوں کی کہانی ایسی بدلی کہ جسے دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ زمین تو زمین آسمان نے بھی ستم ڈھائے ہیں کیا کیا۔ اعلا و بالا سب ادنا و زیر ہوئے اور ذلت مقدر بنی، پستی کو بلندی نصیب ہوئی اور ادنا اعلیٰ بن گئے۔ زہے نصیب، قدرت کے سب کھیل نرالے ہیں۔ جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت دے۔ مقام آہ و فغاں تو بہتوں کا مقدر بنا۔ اکثر نے نصیب کا لکھا سمجھ کر صبر کیا، خون کے آنسو بہا کر رہ گئے۔ ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھنے سے درد کی ٹیس کے سوا اور کیا ملنے والا تھا۔ ہائے وہ کیا دن تھے اور کیا راتیں اور اب ایک وقت کی سوکھی روٹی کو ترستے ہیں۔ رزق کا دینے والا اللہ ہے۔ وہ جب بھی دے گا، دے گا چھپڑ پھاڑ کے....

سماجی حالات اور انسانی رویوں کی یہ کہانی ہمیں سنائی قرۃ العین حیدر نے اپنے فکشن کی زبانی۔ پھر اس پر تفصیلی اور تشریحی روشنی ڈالی اپنے مختلف انٹرویوز میں۔ بہ سرعت بدلتے ہوئے حالات کا اندازہ اور فکر و خیال میں ہوئی تبدیلی کے واضح نقوش ۱۹۵۳ عیسوی سے اب تک کے ان انٹرویوز میں بہت نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ سیاسی زلزلے ذہنوں پر کیا اثرات مرتب کرتے ہیں، سماجی رویوں کے ساتھ ساتھ الفاظ اپنے معانی کس طرح بدلتے ہیں ان تمام باتوں کی تشریحی وضاحت قرۃ العین حیدر کے یہ انٹرویوز پیش کرتے ہیں۔ معاملہ ذہن کے دریچوں کو وا کر کے پڑھنے اور فہم و فراست کی بلندی سے سمجھنے کا ہے۔ اب مکالمہ قاری اور مصنفہ کا براہ راست ہے۔ وہ کہیں اور آپ سمجھیں۔

یہ تمام انٹرویوز گرچہ شائع شدہ ہیں اور مختلف اخبارات و رسائل سے جمع کیے گئے ہیں پھر بھی کتابی صورت میں شائع ہونے سے قبل قرۃ العین حیدر صاحبہ نے ان پر نظر ثانی کی تھی (یہ بات

2001 کی ہے جب 'نوائے سروش' شایع ہوئی تھی) اور بہت سی تبدیلیاں بھی کی تھیں۔ موجودہ حالات میں جو چیزیں غیر ضروری معلوم ہوئیں انھیں حذف کر دیا گیا ہے۔ کہیں کہیں کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔ اس طرح ان تمام انٹرویوز کی اہمیت و افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ اگر حذف و اضافہ نہ بھی ہوتا تو بھی ان انٹرویوز کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

دستاویزی نوعیت کی حامل یہ کتاب ادب کے قارئین، محققین، ناقدین اور اسکالرز کے لیے ایک ایسا بیش قیمتی اور نادر و نایاب تحفہ ہے جس کے لیے وہ میری جتنی بھی ستائش کریں کم ہے۔ شکریے کا لفظ کام کی اہمیت و افادیت کے لحاظ سے بخالت و کنجوسی کی مثال ہوگا۔ ویسے میں صلہ و ستائش کی تمنا کیے بغیر ادب کے طالب علم، قاری اور محققین کی سہولت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے جان جوکھم کا یہ کام میں نے کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر پر کسی بھی نوع کا کام کرنے والے لوگ اس کتاب سے صرف نظر کر کے کوئی اہم ادبی و تحقیقی کارنامہ انجام نہیں دے سکیں گے۔

میں شفیع عقیل اور شہزاد منظر مرحوم کا خاص طور پر شکر گزار ہوں جنھوں نے اپنے غیر مطبوعہ انٹرویوز مجھے دیے جنھوں نے تحقیق کی کئی گتھیوں کو سلجھانے میں میری مدد کی۔ میں ہند و پاک کے ان تمام اشخاص اور ادارے کا بھی شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنھوں نے انٹرویوز کی نشاندہی کی اور ان کی فراہمی میں میری معاونت کی۔

میں قرۃ العین حیدر صاحبہ کا بھی بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری گزارش پر اس کتاب کا پیش لفظ لکھنے کی زحمت گوارا کی (یہ واقعہ نومبر 2001 کا ہے جب وہ باحیات تھیں) جس سے اس کتاب کی اہمیت و افادیت میں اضافہ ہو گیا۔

قرۃ العین کی ان بکھری ہوئی تحریروں کو مجتمع کرنے میں بہت سے افراد اور اداروں نے میری معاونت کی ہے جن کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر نجیب اختر، برادر عزیز کفیل اختر، ڈاکٹر ارشد رضا بھاگلپور، عزیزی جاوید اختر، بزرگ محترم مہر الٰہی ندیم صاحب، برادر مکرم ڈاکٹر عطا خورشید، پروفیسر شافع قدوائی، پروفیسر تحسین فراقی (لاہور)، ڈاکٹر آصف فرخی (کراچی)، صبا اکرام (کراچی)، علی حیدر ملک (کراچی)، پروفیسر مرزا حامد

بیگ (لاہور)، پروفیسر غلام حسین ساجد (لاہور)، پروفیسر علی احمد فاطمی، چودھری ابن النصیر (ایڈیٹر پہچان)، شمع افروز زیدی (ایڈیٹر بیسویں صدی)، ڈاکٹر اطہر مسعود خاں (رام پور) کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ تحقیق کے مشکل مرحلے میں ان تمام لوگوں کا پر خلوص تعاون مجھے ملتا رہا ہے تبھی تنکا تنکا جمع ہو سکا، اور جو رہ گیا ہے وہ بھی انشاء اللہ حاصل ہو جائے گا۔

اداروں میں مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، خدا بخش لائبریری پٹنہ، انصاری لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ، قرۃ العین حیدر آرکائیو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افراد کا بھی شکریہ لازم ہے جن کی پر خلوص معاونت نے تحقیق کے مرحلے کو آسان بنا دیا فرداً فرداً سب کا نام گنوانا ممکن نہیں۔ لیکن ان کے کرم خاص کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

قومی اردو کونسل کا شکریہ بھی ضروری ہے اس لیے کہ ان کے تعاون کے بغیر کلیات کی طباعت کا خواب ادھورا رہتا۔ لہٰذا میں قومی کونسل کے تمام افراد کا جنھوں نے کلیات کی طباعت و اشاعت کے کسی بھی مرحلے میں مدد کی میں فرداً فرداً سبھی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب آخری شکریہ نوجوان دوست تنویر احمد کا جن کی محنت شاقہ سے کلیات کمپوزنگ کے دشوار گزار مرحلے سے گزر کر مکمل ہوئی اور طباعت تک پہنچی۔

بیوی اور بچوں کا شکریہ کیا ادا کروں، ان کی حق تلفی کا مجھے شدید احساس ہے لیکن ملول خاطر نہیں ہوتے۔

جمیل اختر

موبائل:9818318512

ای میل:jameelakhtar786@yahoo.com

جنوری2015

نئی دہلی

ہمارے اکثر ناقدین لکیر کے فقیر ہیں

گفتگو : شمیم حنفی

شمیم حنفی:

آپ کو 1983-1969 کے دوران ہندستانی ادب میں بہتر خدمات کے لیے گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ آپ اپنی پوری تخلیقی زندگی کو کس طرح EVALUATE کریں گی؟

قرۃ العین حیدر:

یہ کہنا مشکل ہے، کیونکہ میں بہت چھوٹی عمر سے لکھ رہی ہوں۔ میں نے بچوں کے رسالے سے لکھنا شروع کیا، اس کے بعد سنجیدہ ادبی مجلوں میں لکھنے لگی جبکہ میں ایک ٹین ایجر ہی تھی۔ مجھے اس وقت بھی کافی ریکوگنیشن ملی، لیکن میں نے ان سب کو بہت زیادہ قابل التفات نہیں سمجھا۔ میں لکھنا ہنسی کھیل سمجھتی تھی۔ وہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا لیکن میں اس کا حصہ نہیں تھی۔ یہی مصیبت تھی۔ میں عام ادبی دھارے سے الگ اپنی راہ پر خوشی خوشی گامزن تھی اور یہی بات لوگوں کے لیے اختلاف کا سبب بنی۔

شمیم حنفی:

آپ دراصل کس بات سے اختلاف کرتی تھیں؟

قرۃ العین حیدر:

میں ایک مخصوص طبقے اور معاشرے کے بارے میں لکھتی تھی، جو میرا ماحول تھا اور جس سے میں سب سے زیادہ واقف تھی اور دراصل یہی وہ ماحول تھا ترقی پسند جس کے خلاف تھے۔ انھوں نے مجھے فیوڈل اور بورژوا طبقوں کا ترجمان کہا۔ ایک ناراض تنقید نگار نے مجھے کھسیانی ہنسی ہنسنے والی اسکولی لڑکی کہا۔ اس وقت وہ لوگ میرے سینئر تھے۔ میں ان سے انتہائی متاثر تھی۔ مثلاً منٹو، عصمت چغتائی، کرشن چندر، بیدی، ترقی پسند تحریک سے میری ہمدردیاں تھیں لیکن مجھے ان کا HOLIER THAN-THOU والا رویہ اور ان کی نعرے بازی پسند نہیں تھی۔

شمیم حنفی:

چند نقادوں نے حال ہی میں یہ تسلیم کیا ہے کہ آپ کی ابتدائی تحریریں نئی حسیت کا نقیب کا درجہ رکھتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

انھوں نے یہ کہنے میں کافی وقت لگایا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شروع کے چند ناقدین کتنے غبی (DUMB) تھے۔ اس وقت بھی میرا خیال تھا کہ میری کہانیاں مختلف ہیں۔ لیکن میں اپنے بارے میں بطور ایک مصنفہ کے سنجیدگی سے غور نہیں کرتی ہوں۔ میں نے شعوری کوشش کے بغیر لکھا، ایک تاثراتی طور پر جس کو بعد میں متعدد ناقدین نے ''شعور کی رو'' کا نام دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے ورجینا وولف کو اس وقت نہیں پڑھا تھا۔ میں نے بعد میں ضرور پڑھا۔

شمیم حنفی:

آپ کا اسٹائل اور وقت اور تاریخ کے ساتھ آپ کا سروکار نے بھی آپ کے چند معاصرین پر اور نئی نسل پر کافی گہرا تاثر چھوڑا ہے جبکہ اگلی نسل (کے مصنفین) نے اپنا رشتہ سامنے کی حقیقتوں سے رکھا تھا۔

قرۃ العین حیدر:

انسانی زندگی سے وابستہ اتنی زیادہ چیزیں ہیں کہ ایک شخص فی الحقیقت نہیں جانتا کہ کہاں سے شروع کیا جائے؟ اور اس طرح اپنے آپ اسکوپ یا کینوس وسیع تر ہو جاتا ہے، آپ تاریخ کی زیادہ چھان بین کرتے ہیں اور تب آپ REALISE کرتے ہیں کہ اس میں اس سے بہت زیادہ ہے جتنا آپ سوچتے ہیں۔ تب آپ سوالات کے کچھ جوابات ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شمیم حنفی:

آپ کو کیا ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ آپ نے ماضی کو جس طرح برتا ہے اس میں رومانیت کا اثر پایا جاتا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

ہاں! ہے......ضرور ہے۔ یہ اتفاقی نہیں تھا کہ یورپ میں انیسویں صدی کے رومانیت پسند بھی ماضی میں دلچسپی رکھتے تھے۔

شمیم حنفی:

لیکن آپ کے ناول تاریخی نہیں ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

وہ تاریخ کے فلسفیانہ پہلو کے بارے میں ہیں۔ کیا ہم سب تاریخ کا حصہ نہیں ہیں؟

شمیم حنفی:

آپ اپنے کس کام کو سب سے بہتر سمجھتی ہیں اور جسے آپ بہ حیثیت مصنف ایک نمائندہ کام کے طور پر پیش کرنا چاہتی ہوں؟

قرۃ العین حیدر:

ہر ناول یا افسانے کی اپنی خصوصیات ہیں، ان کی خوبیاں اور خامیاں ہیں۔

شمیم حنفی:

قاری ان چند کرداروں سے خود کو اکثر IDENTIFY کرنا چاہتا ہے جن کی آپ نے

تخلیق کی ہے۔ کیا مرد اور عورت کردار کے آپ کے برتاؤ میں کوئی فرق بھی ہے؟

قرۃ العین حیدر:

میں کرداروں کو بنیادی طور پر انسانوں کے طور پر، ان کی اپنی CONDITIONING اور ان کی نفسیات کے ساتھ برتتی ہوں۔ عورتوں کو بے شک نہ صرف ہندستان میں بلکہ پوری دنیا میں مصیبت جھیلنی پڑی ہے اور مصیبت میرے سروکار میں سے ایک ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ایک رونے بسورنے والی رائٹر ہوں۔ خدا کے واسطے۔

شمیم حنفی:

آپ کی تحریروں میں آپ کے غضب کے حسِ مزاح کو ناقدین نے بالکل نظرانداز کردیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں! یہ سچ ہے۔ بالکل نظرانداز کردیا ہے۔ کیونکہ ہمارے اکثر ناقدین لکیر کے فقیر ہیں اور وہ ہمارے ابتدائی ناول "آگ کا دریا" سے آگے بڑھتے ہی نہیں۔ وہ وہی گھسی پٹی باتیں لکھتے ہیں۔ مثلاً ناسٹلجیا، ماضی کا رونا اور اس قسم کی چیزیں۔

شمیم حنفی:

پہلے آپ کے جو سروکار تھے ان سے آپ کی حالیہ تحریروں میں کوئی خاص DEPARTURE ہے؟

قرۃ العین حیدر:

نہیں! میرے سروکار وہی ہیں۔ ہم نے حالیہ برسوں میں جو تباہ کن رویے اختیار کیے ہیں ان سے ہر شخص کو سروکار ہونا چاہیے اور معاشروں، ثقافتوں اور لوگوں کے درمیان دانستہ طور پر غلط فہمی پیدا کیے جانے سے میں بہ طور ایک مصنفہ کے بہت پریشان ہوں۔ خلیج دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔

شمیم حنفی:

کیا آپ ہندستان کے موجودہ سیاسی کلچر کے بارے میں لکھ رہی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

میں کھلم کھلا سیاسی ناول نہیں لکھتی۔ ایسے ناول اکثر OUT DATED ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں جو کہانیاں تخلیق کرتی ہوں، کرداروں کی جو افسانوی صورت حال پیدا کرتی ہوں وہ یقیناً ایک مخصوص STATE OF AFFAIRS, GIVEN پیش کرتی ہیں۔ اس طرح آپ ان میں پنہاں مفہوم دیکھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں نے اپنے ناول چاندنی بیگم میں مابعد الطبیعاتی طور پر زمین حاصل کرنے کی خواہش کو پیش کیا ہے۔ بعد میں پیدا ہونے والی تمام پریشانیوں کی جڑ یہی ہے۔ جب ہمارے آباو اجداد درختوں سے کود کر زمین ہتھیانے لگے اور طبقوں، ملکوں اور بادشاہتوں وغیرہ کو قائم کرنا شروع کر دیا۔

اس ناول میں لکھنؤ کے قریب زمین کا صرف ایک ٹکڑا ہے جو ایک کنبے اور اس کی موجودہ اولاد کی ملکیت ہے۔ یہ تقسیم ناول کی کثیر پرتوں والے بیک گراؤنڈ کا ایک حصہ ہے۔

شمیم حنفی:

آپ کا ناول ''کار جہاں دراز ہے'' اردو میں پہلا غیر افسانوی کام ہے اور کہانی آٹھویں صدی میں شروع ہوتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں! ایک مخصوص کنبے کی نسل در نسل کہانی کے ذریعے میں نے کلچر کے ارتقا اور تاریخی اور سماجیاتی ترقی کی تصویر کشی کرنے کی سعی کی ہے۔ اس معاملے میں ہندستانی سویلائزیشن، مغربی ایشیائی اور مغربی دین تھی۔ یہ بے آہنگی اور بے ہم آہنگی کے اجتماعی تجربے کی کہانی ہے۔

شمیم حنفی:

آپ ''گردش رنگ چمن'' کو نیم ڈاکومنٹری کہتی ہیں۔ آپ اس میں افسانوی اور حقیقی دونوں کرداروں کو کس طرح ساتھ لے کر چلی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

میں نے حقیقی کرداروں کو بیک گراؤنڈ میں صرف خاموش فیگرس کے طور پر برتا ہے۔ میں

حقیقی کرداروں سے بات چیت کروانے یا کچھ کروانے کی بددیانتی نہیں کرتی کیونکہ میرا ان پر کوئی اختیار نہیں۔

شمیم حنفی:

''ستاروں سے آگے'' سے لے کر آپ کے تازہ ترین ناول ''چاندنی بیگم'' تک یہ ایک لمبا سفر ہے۔ آپ اس کو کس طرح بیان کرتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

پہلے ایک قہقہہ لگانے والی کم سن لڑکی تھی اور اب ایک قہقہہ لگانے والی سینئر رائٹر ہوں۔

('ٹائمز آف انڈیا' دہلی، 22 جولائی 1990، انگریزی سے ترجمہ)

نقادوں نے خاتون لکھنے والیوں کو اگنور کیا ہے

گفتگو : آصف فرخی (پاکستان)

آصف فرّخی:

اس گفتگو کا آغاز میں افسانے سے کرنا چاہوں گا۔

قرۃ العین حیدر:

جی۔

آصف فرخی:

آپ نے جب لکھنا شروع کیا تو اس وقت اردو میں حقیقت نگاری کا رجحان حاوی تھا بلکہ معاشرتی حقیقت نگاری یا سوشل ریئل ازم جس کو کہنا چاہیے۔ یاد رہے کہ آپ کے افسانوں میں ایک معاشرتی کنسرن ہے یا مسائل کا احساس ہے، لیکن اس وقت کے عام انداز سے مختلف ہیں۔ آپ کے افسانے تو کیا اس وقت خود آپ کو اپنے افسانوں کے اس مروجہ نہج سے ہٹے ہوئے ہونے کا احساس تھا۔ بلکہ اس سوال کو یوں پوچھنا چاہیے کہ یہ احساس کب ہوا۔ آپ نے بہت نوعمری میں لکھنا شروع کیا، تو یہ احساس آپ کو کب ہوا کہ آپ کے افسانے کچھ مختلف ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

بھئی یہ احساس مجھے کچھ نہیں تھا۔ میں بالکل ایک نان سیریس خاتون تھی۔ ایک لڑکی جو کالج میں پڑھ رہی تھی۔ لکھنا میرے لیے ایسے ہی تھا جیسے کوئی اور مشغلہ جیسے کہ ستار بجا رہے ہیں یا جا کر بیڈمنٹن کھیل رہے ہیں۔ اسی طرح بیٹھ کر افسانہ لکھ دیا۔ اب اس افسانہ لکھنے کے لیے یہ نہیں تھا کہ ہم اپنے آپ کو کوئی خاص ادیب سمجھیں۔ بالکل کچھ نہیں، بالکل TOTALLY NON-SERIOUS اب اس کے بعد لوگوں نے خط لکھنے شروع کر دیے کہ فلاں جگہ آپ کا افسانہ چھپا تھا، ایک اور بھیجئے۔ اب اس میں ہوا یہ کہ میں نے پہلے کبھی کہیں اور ذکر کیا ہے، کہ میرا کوئی افسانہ واپس نہیں آیا۔ اگر میرا ایک آدھ افسانہ لوٹ کر آ جاتا تو شاید کچھ ہمت شکنی ہوتی، وہ ہوئی نہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہے، میرے گھر کا ماحول بالکل ادبی تھا۔ بچپن سے میں یہ رسالے دیکھ رہی تھی، "نیرنگ خیال"، "عالمگیر"، "ہمایوں" سارے بڑے بڑے لکھنے والے آتے تھے ملنے کے لیے ابا جان اور اماں کے پاس، تو ادب تو ہمارے لیے بالکل ایک گھریلو...... گھر کی چیز تھی۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ میں بہت سوچ بچار کروں۔ کیا کہتے ہیں جیسے بطخ پانی میں تیرنا شروع کر دیتی ہے ایسے ہی میں نے لکھنا شروع کر دیا۔

آصف فرخی:

اچھا لکھنا تو شروع کر دیا لیکن جب یہ۔

قرۃ العین حیدر:

اور 'پھول' میں لکھا پہلے تو بچپن میں، میں نے "پھول" میں لکھا۔ پھول ایک بچوں کا اخبار تھا اس میں لکھا ہے سب سے پہلے اور اس میں برابر لکھتی رہی۔ اس "پھول" کی داستان یہ ہے کہ ہماری اماں کے خاندانی دوست تھے، مولوی ممتاز علی، جو اماں کے بھائی بنے تھے اور وہ بھائی اس طرح بنے تھے کہ اماں بنت نذر الباقر کے نام سے لکھتی تھیں۔ یہ افسانے لکھ رہی تھیں اور مردوں کے رسالوں میں چھپ رہے تھے۔ ان کے افسانے، کمال تو یہ تھا۔ "مخزن" میں مثال کے طور پر PIONEER قسم کی خاتون تھیں۔ تعلیم نسواں اور آزادی نسواں اور یہ اور وہ اس وقت یعنی اس

صدی کے شروع میں۔ اور ایک خاص ماحول ان کے گھر کا بہت انگریزیت کا تھا، جو اس وقت بڑی غیر معمولی بات تھی۔ مطلب یہ کہ وہ سائیکل چلاتی تھیں گھر کے اندر، باغ میں لیکن بہرحال سائیکل چلاتی تھیں۔ فوٹوگرافر تھیں۔ اپنا ایک اسٹوڈیو بنایا ہوا تھا تصویریں کھینچتی تھیں یعنی جس وقت عورتوں کا تصویر اتروانا ہی منع تھا وہ خود تصویریں کھینچ رہی تھیں۔ تو بہت ہی غیر معمولی خاتون تھیں۔ انھوں نے لکھنا شروع کیا اور لکھنے لگیں "مخزن" کے نورتنوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان میں یلدرم بھی شامل تھے۔ ان نورتنوں میں بنت نذر الباقر بھی تھیں اور وہ ENGLISH SYNDROME انگریزیت کا بہت زور تھا۔ وہ "مس" بنت نہیں، آنسہ نہیں، بلکہ "مس نذر الباقر" لکھا جاتا تھا بلکہ آپ اس کا تجزیہ یہ کیجیے کہ یہ جو ہندستان میں...... میں تو اسے عمرانی نقطۂ نظر سے دیکھتی ہوں کہ یہ ہمارا جو...... ترقی پسندوں نے یہ کہا کہ ہر چیز میں کلاس کلاس...... ایک عجیب و غریب انھوں نے تجزیہ کیا اور انھوں نے بہت سے لوگوں کو بہت سے رائٹرز کو بہت سی تحریکوں کو بغیر سمجھے، بغیر ان کی اسٹڈی کیے، رد کر دیا۔ ان لوگوں نے کسی نے یہ نہیں سوچا کہ یہ جو خواتین نے اتنا بہت سا ادب پروڈیوس کیا۔ اس کی کیا معنویت ہے اور انھوں نے کیسے لکھا؟ جب آپ بات کرتے ہیں WOMEN'S LIB کی تو سب سے بڑا WOMEN'S LIB تو اردو میں شروع ہوا تھا اور خود عورتوں نے کیا تھا۔ اس کا اب کوئی تذکرہ نہیں کرتا۔ بس سب لگے ہوئے ہیں کہ صاحب وہ تو جاگیردارانہ ماحول تھا اور ترقی پسند ادیب، رشید جہاں اور عصمت چغتائی گویا اس سے پہلے سناٹا تھا۔ انھوں نے اردو ادب کی تاریخ کو بہت غلط انداز سے پیش کیا ہے۔

آصف فرخی:

اردو افسانے کی تاریخ جس انداز سے لکھی جاتی ہے، آپ نے اپنے کئی مضامین میں اس کا ذکر کیا ہے اور اختلاف کیا ہے اور اس کا ALTERNATIVE VIEW دیا ہے بلکہ بعض دفعہ تو یہ لگتا ہے کہ SUB-ALTERN VIEW دیا ہے، یہ جو لفظ اب استعمال ہونے لگا ہے، ان لکھنے والیوں نے افسانوی ادب کو DEVELOP کیا اور پریم چند کے لگ بھگ بلکہ تھوڑا آگے پیچھے ہی

یہ کام کیا۔ ہمارے نقادوں نے اس پورے ادب کا ذکر ہی گول کر دیا۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ کیا معاملہ ہوا اور کس لیے؟

قرۃ العین حیدر:

اس لیے کہ ہمارے ہاں اوّل تو زیادہ پڑھا نہیں جاتا۔ ہمارے اکثر نقاد جو ہیں وہ زیادہ پڑھنے کے قائل نہیں ہیں۔ وہ ایک ڈھرّے پر چلتے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو ضروری نہیں سمجھتے کہ آپ ایک OVERALLایک GENERAL VIEWپورے ادب کا لیں۔ وہ کچھ SPECIALIZE کر لیتے ہیں مثلاً ترقی پسند ادب پرSPECIALIZE کر لیا...... جمالیاتی ادب جو کہلاتا ہے،SO CALLED،اس پر کسی نے لکھ لیا..... مگر اس پر بہت کم لکھا گیا ہے اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ان نقادوں نے پڑھی ہی نہیں۔ اب آپ دیکھیے، ہمارے ہاں آج تک جتنے لوگ پی ایچ ڈی کر رہے ہیں یہ کام نہیں کر سکتے...... اگر آپ پرانے ادبی رسالے جمع کریں یعنی بیسویں صدی کے جو موجود ہیں لائبریریز میں لیکن آپ اس صدی سے بھی شروع کریں تو آپ دیکھیں گے کہ افسانے کاDEVELOPMENT کس طرح ہوا۔ ایک صاحب تھے سید محمود بانکی پور، پٹنے کے۔ ان کا کوئی نام نہیں لیتا۔ اچھا، پھر یہ..... اب مجھے اس وقت نام یاد نہیں آ رہا، میں نے بہت افسانے دیکھے، بہت سے ناول دیکھے۔ ایک ناول تھا عجیب و غریب، اس کا نام تھا ''افسانۂ دکن''۔ وہ بھی ایک خاتون کا لکھا ہوا تھا، مجھے اب ان کا نام یاد نہیں آ رہا۔ اور وہ سلسلہ وار چھپا تھا، ایک بالکل چھوٹے سائز کا رسالہ تھا، اس میں بالکل FIRST DECADE OF THIS CENTURYاب کوئی جانتا ہی نہیں۔ افسانے پر ریسرچ کسی نے کی ہی نہیں، تو ہمارے بہت سے گوشے تاریک پڑے ہیں، ہم جانتے ہی نہیں۔

آصف فرخی:

خاص طور پر اس صدی کے پہلے بیس پچیس برس میں جس طرح افسانہ DEVELOPہو رہا تھا، ناول جس طرح لکھا جا رہا تھا۔ آپ کہہ رہی ہیں پی ایچ ڈی کے حوالے سے تو بہت سے غیر اہم یا غیر ضروری لوگوں پر مقالے لکھے گئے لیکن میرے خیال میں کسی نے بھی

مثال کے طور پر محمدی بیگم پر پی ایچ ڈی نہیں کی ہوگی۔ جبکہ ان کو اردو ادب کا ایک غیر معمولی کردار سمجھنا چاہیے۔

قرۃ العین حیدر:

بھئی محمدی بیگم پر تو انگریزی میں کام ہو رہا ہے۔ ایک امریکن لڑکی ہے وہ کھود کھاد کر نکال رہی ہے، وہ کام کر رہی ہے، وہ مجھے امریکہ میں ملی تھی۔ اب اس کا نام یاد نہیں آرہا۔ وہ یہاں آئی، علی گڑھ گئی، لاہور گئی، وہ کام کر رہی ہے یعنی باہر کے لوگ نکال لیتے ہیں ڈھونڈ کر، ہم لوگ پروا نہیں کرتے ہیں۔ ہم لوگ وہی ایک لکیر کے فقیر کہ وہ ترقی پسند ادب اور رشید جہاں اور عصمت چغتائی اور ان سے پہلے سب ROMANTIC تھا اور وہ سب بے کار تھا عجیب و غریب باتیں ہیں۔ اس میں مجھے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ وقار عظیم صاحب جیسے بڑے بڑے نقادوں نے اسی طرح کی باتیں کیں ہیں۔

آصف فرخی:

وقار عظیم تو از کار رفتہ ہو گئے لیکن اب یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہندستان میں فکشن کی بڑی اہم تنقید لکھی جا رہی ہے، فاروقی صاحب ہیں، نارنگ صاحب ہیں، شمیم حنفی صاحب اور وارث علوی ہیں......تو انھوں نے جدید افسانے کے بارے میں واقعی بڑا اہم کام کیا ہے لیکن جدید افسانے کے جو پیش رو ہیں ان کے بارے میں ہر طرف خاموشی ہے......

قرۃ العین حیدر:

بالکل خاموشی، بالکل خاموشی ہے اور ان سے......وہ اپنے متعلق کوئی تنقید بالکل پسند نہیں کرتے، یہ لوگ سب اگر ان سے کہا جائے کہ یہ ہے تو وہ......

آصف فرخی:

عینی آپا، افسانے کا یہ پورا دور......

قرۃ العین حیدر:

یعنی یہاں تک ہوتا ہے، معاف کیجیے میں آپ کی بات کاٹ رہی ہوں، یہاں تک ہوتا

ہے کہ میں اگر کوئی بات کرتی ہوں تو کہتے ہیں کہ ارے آپ کو کیا معلوم افسانے کے بارے میں یا SHE'S NOT A CRITIC۔ مطلب یہ کہ ایک عجیب وغریب سرپرستانہ یا کچھ اور بھی عجیب و غریب ہوتا ہے یعنی ایک قسم کی I WOULD NOT LIKE TO USE THE WORD MAFIA لیکن ایک تنقید کی مافیا ہے۔ اس مافیا کو آپ توڑ نہیں سکتے۔ آپ نے جن لوگوں کا نام لیا ہے یہ مت سمجھئے گا کہ وہ اس مافیا میں شامل ہیں یا میں ان کو کہہ رہی ہوں۔ لیکن تنقید کی ایک مافیا بن گئی ہے۔

آصف فرخی:

ایک رویہ بن گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یہ بالکل ایک رویہ بن گیا ہے۔

آصف فرخی:

عینی آپا، مجھے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے افسانے کے جس تشکیلی دور کا ذکر کیا وہ نقادوں کے لیے ہو نہ ہو، آپ کے اپنے فکشن کے لیے بڑا اہم تھا اور اس کے اثرات کو آپ نے جذب کر کے آگے DEVELOP کیا......

قرۃ العین حیدر:

بھئی میں نے ABSORB کیا یا نہیں کیا، یہ تو میں نہیں جانتی، لیکن ظاہر ہے کہ میں پڑھتی تھی، بچپن سے میں وہ رسالے پڑھتی تھی۔ مجھے اب تک یاد ہے اتنا ایک خوب صورت افسانہ تھا، مجھے اس کا نام یاد نہیں آرہا IT WAS A FANTASTIC STORY۔ گورکھپور سے کوئی رسالہ نکلتا تھا، اس میں وہ چھپا تھا۔ اب نہ مجھے اس کا نام یاد ہے نہ اس کے رائٹر کا نام یاد ہے۔ اب اس طرح کے افسانے ہیں کہ اگر آپ بیٹھ کر دیکھیے..... اگر آپ واقعی ایک مکمل تاریخ مرتب کرنا چاہیں افسانے کی تو آپ کو اس کے لیے پوری ایک کھٹی کھدائی پڑے گی پی ایچ ڈی والے اسٹوڈنٹس کی کہ وہ پرانے رسالے نکالیں اور یہ کام ہونا چاہیے، وہ پرانے رسالے نکالیں لائبریریز

سے، ہندستان جا کر اور یہاں اور اس میں وہ دیکھیں کہ کہاں کہاں افسانے چھپے ہیں یعنی انیسویں صدی میں، اس صدی کے شروع میں، پریم چند سے پہلے اور پریم چند کے ساتھ ایک PARALLEL افسانے کا دھارا چل رہا تھا۔ ہوا کیا ہے کہ ہمارے ہاں ایک بس پریم چند کی دھاک بیٹھ گئی، ROMANTICS میں حجاب امتیاز علی کا نام ہو گیا کہ وہ لکھتی ہیں اور جو بے شمار لکھا ہے لوگوں نے، وہ ریسرچ کا موضوع ہو سکتا ہے۔ کسی نے کام ہی نہیں کیا ہے ان پر۔

آصف فرخی:

اس طرح کا کوئی انتخاب بھی نہیں کیا گیا ہے کہ عام پڑھنے والوں کے سامنے ہوتا تو لوگ اس کے حوالے سے پھر مزید تلاش و جستجو کرتے۔

قرۃ العین حیدر:

کوئی انتخاب نہیں ہے اور ان افسانوں میں آپ کو ایسے ایسے GEMS ملیں گے۔ میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ ایسی ایسی چیزیں ملیں گی، میں نے تو خیر بہت کم، جو بھی میں نے دیکھا علی گڑھ یونیورسٹی کی لائبریری میں پورا ذخیرہ ہے۔ مگر NO BODY CARES۔ ہندستان میں بہت بڑی لائبریریز ہیں، جامعہ کی لائبریری ہے، علی گڑھ کی لائبریری ہے، دلی یونیورسٹی ہے، باہے یونیورسٹی ہے، حیدرآباد میں تو میں گئی نہیں ہوں کسی یونیورسٹی کو دیکھنے کے لیے۔ یہ بس وہ چند چیزیں ہیں ان ہی کو REPEAT کیے جا رہے ہیں، اس کے بارے میں لکھتے لکھتے تھکتے نہیں۔

آصف فرخی:

اور کوئی نئی بات بھی کہتے۔

قرۃ العین حیدر:

اور کوئی نئی بات بھی نہیں کہتے۔

آصف فرخی:

ہم نے جہاں سے یہ بات شروع کی تھی وہ تھے آپ کے افسانے اور یہ کہ وہ اس وقت کے مروجہ انداز سے ہٹے ہوئے تھے۔ آپ نے اسی زمانے میں اپنا ایک افسانہ بھیجا احمد ندیم قاسمی

کے مرتب کردہ ایک مجموعے میں اور اس کے ساتھ اپنے بارے میں سوالوں کے جواب بھی دیے۔ ''نقوش لطیف'' نام کی کتاب میں یہ شامل ہے۔ اس میں آپ نے لکھا ہے کہ کرشن چندر آپ کے محبوب مصنف ہیں۔ لیکن آپ کی تحریر سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ آپ نے ان سے کچھ اثر قبول کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

بھئی دیکھیے وہ زمانہ تھا کہ کالج میں ہم پڑھتے تھے۔ کالج میں جب ہم پڑھتے تھے تو وہ کرشن چندر کا دور تھا۔ وہ ایک عجیب وغریب زمانہ تھا۔ کالج کے سب طالب علم کرشن چندر کو پڑھتے تھے، لڑکے، لڑکیاں، نوجوان...... وہ اس دور کا ایک سمبل بن گئے تھے۔ تو ہم بھی اس میں شامل تھے اور ہمارا خیال تھا کہ واقعی وہ بہت بڑے رائٹر ہیں۔ انھوں نے بعض چیزیں بہت اچھی لکھی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں اور بڑی غیر معمولی۔ انھوں نے ایک نئی تکنیک شروع کی، مثال کے طور پر ''ان داتا'' میں۔ بھئی وہ ہر چیز بڑی اچھی، بڑی نئی، بڑی انوکھی لگتی تھی۔ AND HE WAS A PIONEER۔

آصف فرخی:

مگر انھوں نے آخر میں جا کر بہت معمولی، بہت کمزور کہانیاں لکھی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

اب وہ تو خیر بعد کی بات ہے، وہ بعد کی بات ہے۔ اگر انسان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہو تو HE SHOULD STOP WRITING۔ عصمت آپا نے اتنی اچھی کہانیاں شروع میں لکھیں اور آخر میں ان کی کہانیاں کمزور تھیں۔ یہ ناول ان کا بہت کمزور تھا ''معصومہ'' تو پھر نہیں لکھنا چاہیے۔ ONE SHOULD STOP۔ لیکن بھئی اس وقت کرشن چندر کو، بیدی کو ان لوگوں کو بہت پسند کیا جاتا تھا اور THEY WERE TREND SETTERS۔

آصف فرخی:

اچھا ''معصومہ'' مجھے پسند ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ واقعی ٹرینڈ سٹر تھے۔

میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ کے افسانوں پر ان کا زیادہ اثر نہیں پڑا۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں، اثر تو میرے ہاں کسی کا نہیں تھا۔ میں تو بالکل نہیں جانتی اثر ہے کہ نہیں ہے۔ تھوڑا بہت تو ضرور ہوگا لیکن میں تو بالکل اپنے طریقے سے...... میں تو جیسے لکھ رہی تھی وہ لکھ رہی تھی، اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اب مثال کے طور پر بعد میں معلوم ہوا، دھوم مچی کہ صاحب STREAM OF CONSCIOUNESS ہے اور کیا کہتے ہیں اسے...... تجریدی افسانہ، صاحب آپ لوگ جس چیز کو تجریدی افسانہ کہہ رہے ہیں اور انور سجاد کو اور ان لوگوں کو امام مان رہے ہیں۔ I STARTED WRITING THIS KIND OF WAY BACK, WHEN, I WAS IN MY SECOND OR THIRD YEAR OF COLLEGE۔ نقاد اس کا ذکر نہیں کرتے ہیں۔ جو مجھے شکایت ہے نقادوں سے کہ ان کو پروا نہیں ہے کہ وہ تھوڑا سا اور پڑھیں۔

آصف فرخی:

نقادوں نے تو خیر اور بھی بہت سی زیادتیاں کی ہیں۔ آپ کے فکشن کے ساتھ یہ زیادتی کرتے ہیں کہ مغرب سے کوئی سانچا لے آتے ہیں، مثلاً ''شعور کی رو'' یا ورجینا وولف اور اس سانچے میں زبردستی آپ کو فٹ کرنا چاہتے ہیں اور جب آپ وہاں فٹ نہیں ہوتی ہیں تو THEY BEGIN TO HACK AWAY AND THEY EITHER SAW YOUR HANDS OFF OR CHOP YOUR FEET۔ کہ ارے صاحب ان کو ''شعور کی رو'' پر مکمل مہارت نہیں ہے۔ اب یہ کون پوچھے کہ یہ کس نے کہہ دیا؟ آپ ''شعور کی رو'' اس طرح تھوڑا ہی لکھ رہی ہیں کہ مغرب کے کسی ڈھلے ڈھلائے سانچے پر پوری اترے یا جس طرح کوئی انگریزی کا آدمی لکھے گا۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے جو نقاد ہیں انھیں زیادہ پڑھنے کا شوق نہیں ہے۔ THEY JUST WANT TO WRITE اب آپ مجھے بتائیے کہ میں نے جس چیز کو آپ تجریدی افسانہ کہہ رہے ہیں وہ میں نے ''پرواز کے بعد'' اور اس طرح کے میرے افسانے

"ستاروں سے آگے" میں جو چھپے ہیں وہ میں نے لکھے تھے جب میں کالج میں تھی۔ AND THEY WERE SPONTANEOUS WRITING, YOU KNOW WHAT I MEAN? یہ نہیں کہ بیٹھ کر سوچ رہے ہیں کہ ہمیں اس طرح لکھنا ہے۔ JUST SPONTANEOUS WRITING JUST WROTE AS I THOUGHT۔ وہ تھیں۔

آصف فرخی:

یعنی آپ نے شعوری طور پر تجربہ نہیں کیا تھا۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں نہیں۔ کیسے کرتی تجربہ:؟ شعوری طور پر تجربہ کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ DID NOT HAVE ENOUGH WISDOM عقل کچی تھی۔ AS A TEEN-AGER, I WAS JUST WRITING۔ یہ تو بڑی سیدھی سادی بات ہے یعنی کوئی بھی شخص جو ہے اس ایج میں کوئی بھی لڑکا یا لڑکی لکھنے بیٹھے گا تو وہ تجربے تو نہیں کرے گا۔ وہ تو اپنا SPONTANEOUS لکھے گا۔

آصف فرخی:

لیکن ان افسانوں کے بعد پھر آپ کے ہاں تبدیلی آتی ہے۔ "شیشے کے گھر" کے بعد جو افسانے ہیں، ان میں خاصی تبدیلی ملتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

وہ تو MATURITY آئے گی تو یہ ہوگا۔ MATURITY نہیں آئے گی؟

آصف فرخی:

لکھنے والا آپ جیسا ہوگا تو آئے گی ورنہ ہمارے بہت سے لکھنے والوں پر عمر بھر نہیں آتی۔

قرۃ العین حیدر:

MATURITY تو آنی چاہیے۔ اب وہ کہتے ہیں کہ صاحب، یہ جو افسانہ آپ نے لکھا ہے ویسا نہیں ہے جیسا آپ نے پہلے لکھا تھا۔ ارے بھئی یہ جو بیچ میں پچیس سال کا وقفہ ہے تو کچھ تو بدھی آئی (قہقہہ)۔ شروع میں جو لکھا وہ بچکانہ چیز ہے اور ہمیں اس پر اصرار نہیں ہے کہ اس کو بڑا افسانہ یا عظیم

افسانہ نما ہے۔ بھئی THIS IS THE SPONTANEOUS OUT-POURING OF A TEENAGER, AS SIMPLE AS THAT اس میں کوئی اچھا ہوگا، کوئی بُرا ہوگا، اپنا ہوگا۔

آصف فرخی:

وہ چاہے بڑا افسانہ ہو یا نہ ہو، وہ مختلف ضرور ہے۔ اور اردو افسانے کا جو ڈھرّا رہا ہے اس سے بالکل مختلف تھا۔

قرۃ العین حیدر:

بالکل مختلف تھا۔ اور اس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔ مجھے اب تک یاد ہے ایک مضمون لکھا تھا ممتاز شیریں نے۔ اس مضمون کا نام تھا "منفرد افسانہ نگار" پڑھا ہے آپ نے؟

آصف فرخی:

جی ہاں۔

قرۃ العین حیدر:

وہ انھوں نے لکھا تھا، میرے خیال میں 1947 میں یا شاید

آصف فرخی:

وہ "نیا دور" کے دورِ ادارت کے زمانے کا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں، 1947 یا 1948 میں لکھا تھا۔ اس خاتون نے ان افسانوں کا تجزیہ کیا تھا جو میں اس وقت لکھ رہی تھی اور اس میں یہ لکھا تھا...... اس کا عنوان ہی تھا ایک منفرد افسانہ نگار۔ وہ آپ مجھے ڈھونڈ دیجیے۔

آصف فرخی:

وہ مضمون موجود ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اچھا۔ اس کمال کا مضمون...... کہاں سے وہ خاتون اس چیز کو لے کر آئی اور اس چیز کو پہچانا۔

آصف فرخی:

مضمون تو وہ ٹھیک ہے لیکن ممتاز شیریں نے ایک گڑبڑ یہ کی، جو انھوں نے اپنے افسانوں کے ساتھ بھی کیا کہ انھوں نے ورجینا وولف کا ایک ہوّا کھڑا کر دیا یا سریندر پرکاش کی زبان میں یوں کہیے کہ آپ کی کھیتی پر ورجینا وولف کا بجوکا بنادیا، اور نقاد اس بات کو لے دوڑے......

قرۃ العین حیدر:

اچھا۔

آصف فرخی:

تو مجھے اس پر بھی اعتراض ہے کہ یہ گڑبڑ کردی۔

قرۃ العین حیدر:

اب خیر وہ گڑبڑ انھوں نے کی ہوگی، مجھے وہ مضمون پوری طرح یاد بھی نہیں ہے۔ آپ مجھے نکال کر دیجیے کہ میں دوبارہ دیکھوں۔ مجھے اب اس کا عنوان یاد رہ گیا ہے اور میں نے اس وقت تک ورجینا وولف کو پڑھا ہی نہیں تھا۔ جب ہر ایک طرف سے یہ سنا کہ پڑھو ورجینا وولف، ورجینا وولف تب میں نے پڑھا۔

آصف فرخی:

تو پھر اب اسے پڑھا تو کیسا لگا؟

قرۃ العین حیدر:

ارے ہاں، ہاں...... I WON IT۔ تو پھر میں نے واقعی ان کے اسٹائل میں لکھنے کی کوشش کی۔ TO THE LIGHT-HOUSE ان کا پہلا ناول تھا جو میں نے پڑھا اور وہ مجھے یاد ہے کہ میں نے یہاں کراچی آکر پڑھا تھا۔ میں اس سے بہت پہلے سے لکھ رہی تھی۔ TO THE LIGHT-HOUSE اور پھر THE WAVES۔ یہ میں نے "تھامس اینڈ تھامس" سے کتابیں خریدی تھیں۔ اس سے بہت پہلے سے میں ان اسٹائل میں لکھ رہی تھی۔ لیکن پہلی دفعہ ورجینا وولف کو یہاں پڑھا اور یہ کتابیں پڑھیں۔ اور میں یہ سب انٹ سنٹ لکھ رہی ہوں، اس سے وہ

تین سال پہلے سے، چار سال پہلے سے۔ اس کا تو خیر کوئی مسئلہ ہے...... یہ ضروری نہیں ہے...... ہمارے ہاں ایک پرابلم ہو گیا ہے کہ لوگ اتنے مرعوب اور متاثر ہیں مغرب سے کہ ہر چیز کا موازنہ کرتے ہیں۔ صاحب وہ ٹی ایس ایلیٹ مغرب کا اور ن م راشد انڈیا کے بلکہ پاکستان کے یعنی آپ ہر چیز میں یہ کیوں ظاہر کرتے ہیں کہ آپ کا کوئی نہ کوئی EQUIVALENT وجود ہے وہاں یا وہاں کا EQUIVALENT آپ ہیں۔ بذات خود آپ اپنی کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ لہٰذا آپ جو ہیں اچھا، اگر ترجمے ہی کی بات ہے تو بے چارے عسکری صاحب نے ایک اور پرابلم کھڑا کر دیا۔ انھوں نے فرنچ سیکھ لی تھی۔ وہ فرنچ کے حوالے دیتے تھے۔ اب ہر شخص تو فرنچ جانتا نہیں ہے۔ ایک تو ان کا بہت رعب پڑ گیا تھا لوگوں پر، بہت پڑھے لکھے آدمی تھے۔

آصف فرخی:

آپ کی ملاقات تھی ان سے؟

قرۃ العین حیدر:

ہاں ہاں۔ بات ہی نہیں کرتے تھے وہ میری تو ان سے بہت ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ میں تو ان سے ایسی ہی انٹ سنٹ باتیں کرتی تھی۔ وہ جی، جی ہاں کہہ کر خاموش ہو جاتے تھے۔ وہ یہاں ملتے تھے مجھے ''تھامس اینڈ تھامس'' میں یہاں آتے تھے۔ HE WAS A REAL SCHOLAR ABSOLUTELY REAL SCHOLAR۔ مگر یہ کہ بات نہیں کرتے تھے...... ہما شما ہم چھٹ بھیّوں سے وہ کیا بات کرتے کہ یہ کون بے وقوف ہیں، بکری کوئی آ گئی ہے گھاس چرنے (قہقہہ) میرا خیال ہے وہ زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ یا کرتے ہوں گے۔

آصف فرخی:

ان کی زندگی کے آخر زمانے میں، میں ان کے ہاں جایا کرتا تھا۔ میں جب ان سے کسی کتاب کے بارے میں پوچھتا تھا تو وہ مجھ سے کہتے تھے کہ نماز پڑھو۔ میں ان سے جوئس اور پروست کے بارے میں پوچھتا تھا وہ یہی کہتے تھے کہ ان کا کیا ہے، نماز پڑھو۔ پھر ایک دفعہ مجھ سے کہا تھا کہ ''آگ کا دریا'' لا کر دو کہ میں دیکھوں اس میں کیا ہے جو تم اس کا اتنا ذکر کرتے ہو۔

مگر یہ نوبت نہیں آئی اور ان کا انتقال ہو گیا۔

قرۃ العین حیدر:

پھر انھوں نے وہ پڑھا؟

آصف فرخی:

نہیں پڑھا۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں پڑھا ہو گا۔ ہاں تو یہ تو ہے...... ان میں ایک بے چارے، اب میں ان کے بارے میں زیادہ جانتی نہیں ہوں۔ ایک دفعہ میرے ہاں آئے بھی تھے۔ ایک امریکن کے ساتھ۔ اچھا، وہ اگر ملتے بھی تو کوئی FOREIGNER اگر آجاتا تھا، انگریز یا امریکن رائٹر تو اس سے بات کر لیتے تھے۔ وہ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے تو ہم کیا چیز تھے۔ ہم ان سے یہ انٹ سنٹ اڑایا کرتے تھے کہ عسکری صاحب فلانی بات عسکری صاحب فلانی بات۔ وہاں جواب میں ہوں، جی، ہوں، جی...... (قہقہہ) بس یہ بات ہوتی تھی۔

آصف فرخی:

ابھی ذکر ہو رہا تھا آپ کے افسانوں کا۔ آپ کے بعض افسانے پڑھ کر یہ لگتا ہے کہ آپ کا اصل میدان افسانے سے زیادہ ناول ہے یعنی جب وسعت ملتی ہے تب آپ خوب ایک لحاظ سے وہ فارم آپ کو بہت سوٹ کرتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ہو سکتا ہے۔

آصف فرخی:

کیا آپ کو خود بھی یہ احساس ہوتا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

میں نے مختصر افسانے بہت لکھے ہیں۔ ''کارمن'' ان میں سب سے RECENT ہے

شاید۔ بہت لکھے ہیں میں نے۔ یہ بھی میرے خیال میں ایک متھ بن گئی ہے کہ اصل میدان ناول ہے یا ناولٹ ہے۔ مختصر افسانے بہت لکھے ہیں۔ مطلب لکھے ہیں۔ مطلب یہ کہ 'ستاروں سے آگے' سے آپ شروع کیجیے اور پھر ان کے بعد...... یہی تو ہوگیا۔ اس پر تو افسوس ہے کہ میرا ذکر کرتے ہیں نقاد تو صرف ناولٹ یا ناول کے حوالے سے۔ میرے افسانوں کے یہ مجموعے ہیں 'ستاروں سے آگے' ایک مجموعہ 'شیشے کے گھر' دوسرا مجموعہ 'پت جھڑ کی آواز' تیسرا مجموعہ تو اب تین مجموعوں میں افسانے ہی افسانے ہیں اور ان کے علاوہ بے شمار افسانے ہیں جو کہ میں نے شامل ہی نہیں کیے یا مجھے ملے نہیں۔

آصف فرخی:

رسالوں میں بہت بکھرے ہوئے ہیں اور ان میں سے بعض بہت اچھے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

تو وہ مجھے ملے ہی نہیں۔ تو پھر یہ کیسے کیا جاتا ہے کہ افسانے میں میرا تذکرہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک اور نقادوں کی دھاندلی ہے کہ افسانے کے میدان سے میرا نام نکال دیا۔

آصف فرخی:

نقاد یہ کر نہیں سکتے؟

قرۃ العین حیدر:

یہ انھوں نے کیا ہے۔ وہ صرف ناول کا ذکر کرتے ہیں اور ان میں سے بھی فقط ''آگ کا دریا'' بس۔ اچھا اسٹائل کی بات نہیں کرتے، مثال کے طور پر جو میرا ناول 'سفینۂ غم دل' ہے جو کہ میں نے I WAS TWENTY-FIVE میری 25 کی AGE تھی تب میں نے لکھا ہے۔

آصف فرخی:

عینی آپا: آپ تو اس وقت بہت بڑی جینئس ہوں گی۔ (قہقہہ) آپ نے انیس برس کی عمر میں ''میرے بھی صنم خانے'' لکھا اور پھر یہ......

قرۃ العین حیدر:

ذرہ نوازی ہے آپ کی (قہقہہ) جینئس وینئس کوئی نہیں، نہ ہم لکھنے میں کوئی توپ ہیں۔ نہیں 25 کی عمر میں، بلکہ 24 کی عمر میں ہم نے یہ لکھا۔ اچھا "سفینۂ غم دل" یہ ناول کمزور ہے۔ ITS ONLY A KIND OF A RE-HASH OF "میرے بھی صنم خانے" پڑھا نہیں آپ نے شاید؟

آصف فرخی:

پڑھا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

تو آپ مانیں گے کہ IT'S ONLY A-RE-HASH OF "میرے بھی صنم خانے"۔

آصف فرخی:

مجھے آپ کی کتابوں میں وہ سب سے کم پسند ہے۔

قرۃ العین حیدر:

تو وہ RE-HASH ہے لیکن اس کے اسٹائل پر کسی نے غور نہیں کیا، اس کی جو نثر ہے، اس پر غور نہیں کیا۔ BECAUSE I THINK THAT PROSE STYLE DESERVES TO BE MENTIONED۔ اس کا جو اسٹائل ہے، لکھنے کا انداز اس کو کسی نے نوٹس نہیں کیا۔ اس میں مثلاً یہ کہ جیسے وہ شاعرانہ نثر لکھی جاتی ہے وغیرہ تو شاعرانہ واعرانہ تو مجھے پتا نہیں کہ ہے یا نہیں I THINK THAT IT'S PROSE STYLE WAS WORTH MENTIONING. IT HAS BEEN... IGNORED. AS A NOVEL OTHERWISE ITS POOR، کیونکہ اس میں وہی چیزیں ہیں، وہی جاگیردارانہ ماحول اور وہ سب جو "میرے بھی صنم خانے" میں تھا، جو پہلے تھا وہی اس میں آ گیا ہے۔

آصف فرخی:

وہ ساری چیزیں آپ نے یوں کہنا چاہیے کہ TRANSFORM بلکہ TRANSCEND

کی ہیں ''آگ کا دریا'' میں۔ایک پورا موضوع،ایک پورا عہد اس کو آپ نے یہ پایہ تکمیل تک پہنچا دیا اس کتاب میں......

قرۃ العین حیدر:

آگ کا دریا میں؟

آصف فرخی:

جی ہاں! یعنی پہلے دو ناولوں میں جو دائرہ بننا شروع ہوتا ہے وہ ''آگ کا دریا'' میں مکمل ہو جاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

بھئی، I CAN'T SAY, YOU SEE MY PROBLEM, WHICH VERY FEW PEOPLE WILL UNDERSTAND, MY PROBLEM HAS ALWAYS BEEN THE RE-CREATION OF A CERTAIN... RE-CREATING A CERTAIN MILIEU, AND ATMOSPHERE SENSE OF A PLACE.. ایک ایسی چیز ہے جو ہمارے ہاں بہت حاوی ہے اردو افسانے میں اور وہ میرے ہاں بھی ہے۔آپ کو اس قسم کا احساس مغربی ناولوں میں اتنا نہیں ملے گا۔SENSE OF PLACE کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ناولسٹ یا ہمارے افسانہ نگار جو ایک چیز کو DESCRIBE کرتے ہیں یا ایک جگہ کو،وہ قصبہ ہو یا شہر ہو یا مکان ہو یا بازار ہو،تو وہ اس میں ڈوب کر لکھتے ہیں،رچ جاتے ہیں پھر لکھتے ہیں، THEY ARE A PART OF THAT PLACE OR THAT PLACE IS PART OF THEIR PSYCHE. ہیں نا؟ یہ چیز آپ کو ویسٹ میں اتنی نہیں ملے گی۔ویسٹ کا جو آدمی ہے وہ ماحول ضرور DESCRIBE کرتا ہے BUT HE IS MORE CONCERNED WITH THE HUMAN RELATIONSHIPS, MOTIVATION، نفسیاتی مسائل......وہ یہ نہیں بتاتا کہ روٹی کس طرح رکھی ہوئی ہے ڈلیا میں یا وہ چڑیا جو بیٹھی ہوئی تھی آنگن میں وہ کیسے پھدک رہی تھی یا بیلے کا پھول کیسا تھا؟ یہ چیزیں جو ہیں،یہ جزئیات بہت اہم ہیں......

مغرب والے اپنے انداز میں لکھتے ہیں، ان کا اپنا ماحول ہے جو الگ ہے۔
THEY DON'T HAVE THAT KIND OF RELATIONSHIPS WITH THINGS, WHICH WE HAVE. THEY HAVE THEIR OWN RELATIONSHIPS. میرا اپنا یہ خیال ہے کہ ہم لوگ جو...... میں نے جو...... آپ دیکھیے کہ سارے ہندستانی ناولوں میں SENSE OF PLACE مل جائے گا۔ پریم چند کے ہاں ہے۔ چھوٹے بڑے معروف غیر معروف ہر ناولسٹ کے ہاں چیزوں کا ایک DESCRIPTION ملے گا جو کہ بہت...... جس کے ساتھ وہ جڑا ہوا ہے لکھنے میں۔ وہ چیز ہمارے ہاں ہے اور وہ SENSE OF PLACE & ATMOSPHERE اردو میں شروع سے چلا آ رہا ہے۔ آپ دیکھیے کہ سرشار میں ہے۔ سرشار کو ہمارے ہاں...... یہ بات بہت لمبی ہو جائے گی لیکن میں سمجھتی ہوں کہ سرشار کو ہمارے ہاں اسٹڈی نہیں کیا گیا۔ وہ کتنا بڑا GIANT تھا۔ اس کے ناولوں کے PORTIONS آج نکال کر دیکھیے کہ اس نے کس طرح DESCRIBE کیا ہے چیزوں کو اس طرح اس نے مناظر کو DESCRIBE کیا ہے، کس طرح اس نے RELATIONSHIPS کو پیش کیا ہے۔ وہ اتنا عمدہ ہے، ''سیر کہسار'' میں پڑھیے یہ اور وہ......

آصف فرخی:

''فسانۂ آزاد''......

قرۃ العین حیدر:

ہیں، کیا؟ ہاں، 'فسانۂ آزاد' تو ہے ہی۔ چار جلدیں ہیں، 'سیر کہسار' دیکھیے۔ اس پر تو برسوں کام کیا جا سکتا ہے۔ وہ اتنا بڑا GIANT تھا۔ اس کو اگنور کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں کسی نے اس کو اہمیت نہیں دی، اس کی ضخامت کو دیکھ کر لوگ ڈر گئے۔ وہ عجیب و غریب رائٹر ہے اس کے ایک ایک چیپٹر میں آپ کو نئی دنیا ملے گی۔ فکشن کا اسٹائل، اس کے DESCRIPTIONS، وہ عجیب و غریب چیز ہے۔ بہرحال ہمارے ہاں SENSE OF PLACE سرشار میں ملتا ہے کہ لکھنؤ کے ایک محلے میں صبح کس طرح ہوتی ہے، کہارنیں کیا کرتی ہیں، تنبولین کیا بات کرتی ہیں،

وہ ایک ایک چیز کو پیش کرتا ہے اور وہ اس کہارن اور تنبولن کا جو چوکھا ہے، فریم، وہ اس کو پینٹ کرتا ہے تو وہ SENSE OF PLACE بہت اہم ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ میرے ہاں بھی یہ تھوڑا بہت ہے۔

آصف فرخی:

یہ اس SENSE OF PLACE کا آپ نے ذکر کیا، مجھے آپ کے ہاں جو چیز بہت اہم معلوم ہوتی ہے وہ SENSE OF TIME ہے اور وہ بعض دفعہ اتنا حیران کرتا ہے...... ایک تو یہ کہ جو لوگ آپ دکھاتی ہیں یا جن مقامات کو لکھتی ہیں، وہ ایک سے زیادہ زمانوں میں موجود ہوتے ہیں یا آج جو ہے اس کے پیچھے ایک اور آج نکلا چلا آرہا ہے......

قرۃ العین حیدر:

نہیں، وہ تو خیر ہے اور TIME پر تو بہت لکھا گیا ہے میرے متعلق۔ لیکن آپ دیکھیے کہ میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے، میں نے اس میں I HAVE TRIED TO DESCRIBE, NOT ONLY THE ATMOSPHERE BUT THE PHYSICAL PRESENCE OF THINGS. پہاڑ ہوں، الموڑہ، مسوری، نینی تال، دہرہ دون...... لکھنؤ، کراچی، لندن...... وہ ایک MYSTICAL رشتہ ہوتا ہے انسان کا ایک جگہ سے۔ اس کو آپ...... اور اس MYSTICAL رشتے کے لیے ضروری ہے چند اور چیزوں کو ہونا۔ مطلب یہ کہ اب میرا یہ رشتہ پیکنگ سے نہیں ہو سکتا (ہنسی) میں پیکنگ میں جا کر رہوں تو شاید ہو جائے دو چار سال بعد۔ لیکن وہ ایک ہوتا ہے اس کو بھی آپ کسی اور طرح DESCRIBE نہیں کر سکتے۔

آصف فرخی:

آپ نے ابھی اپنے افسانوں کا ذکر کیا، اس میں "پت جھڑ کی آواز" جو افسانہ ہے، یہ بڑا عمدہ ہے اور آپ کے پچھلے افسانوں سے یکسر مختلف ہے۔

قرۃ العین حیدر:

میں نے اس کا ذکر کیا ہے کہ وہ کتاب میں نے بہ طور چیلنج لکھی تھی۔

آصف فرخی:

لیکن وہاں سے آپ کے افسانوں کا ایک نیا موڑ آجاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

تو میں نے سوچا کہ چلو، اب اسی طرح لکھتے ہیں۔

آصف فرخی:

اچھا یعنی آپ کو خود یہ انداز پسند آیا۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں، میں نے کہا کہ چلو لکھتے ہیں۔ مجھ سے ضیا محی الدین نے کہا تھا کہ آپ اس طرح نہیں لکھ سکتیں۔ میں نے کہا، اچھا میں لکھتی ہوں۔ تو یہ مجھ سے ضیا محی الدین نے کہا تھا اور شاید سلمیٰ نے کہا تھا، سلمیٰ صدیقی نے تا کہ تم اس طرح نہیں لکھ سکتیں۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص دوسرے شخص کی طرح لکھے۔ ہر ایک کا اپنا اپنا انفرادی اسٹائل ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ بھی ایک چیز ہے کہ بھئی آپ فلاں کی طرح نہیں لکھتیں۔ کیوں لکھیں ہم فلاں کی طرح؟ ہم فلاں کی طرح نہیں ہیں۔ ہماری اپنی کوئی شخصیت ہے، ہمارا اپنا VALUE SYSTEM ہے ہمارا اپنا ایک APPROACH ہے، ہمارا اپنا قلم ہے تو ہم فلاں کی طرح کیوں لکھیں گے؟

آصف فرخی:

لیکن "پت جھڑ کی آواز" میں وہ پورا دور ختم ہو جاتا ہے، وہ پنکی، ٹوٹو، شوشو...... جس کو پوم پوم ڈارلنگ کہا گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

پنکی، ٹوٹو، شوشو جو تھا اس کو تو میں نے جان کر اس میں ختم کیا ہے، اس میں تو میں نے جان بوجھ کر جس ماحول سے میں زیادہ مانوس نہیں تھی، اس کو پیش کیا ہے۔

آصف فرخی:

اور بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اچھا "پت جھڑ کی آواز" میں وہ ہے نا......ایک مڈل کلاس مسلم گھر کے اندر جو ہو رہا ہے......اچھا، اس میں ایک بہت دلچسپ چیز ہے جو میں نے "کار جہاں دراز ہے" میں بھی لکھا ہے کہ میں تین چار ماحول جو ہیں، سوشیولوجیکل...... ہاں SOCIOLOGICAL کہئے۔ تین ماحول، ان میں I AM EQUALLY AT HOME ایک تو ہے SO-CALLED UPPER CLASS اور ANGLICISED ایک ہے بالکل SOLID مسلم مڈل کلاس۔ اور ایک ہے باہر کا ماحول۔ تو یہ جو مڈل کلاس ہے ہمارا، اس کا تجزیہ نہیں کیا گیا ہے کہ ہمارا جو اردو ادب تھا وہ طبقاتی تھا۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے جو لکھنے والے تھے THE MOSTLY CAME FROM VERY RESPECTABLE MIDDLE-CLASS کیونکہ مڈل کلاس ہی نے تعلیم، بلکہ تعلیم کے PIONEER وہ ہی تھے۔ اور جب ڈپٹی نذیر احمد نے لکھنا شروع کیا تو وہ بھی "شرفا" کی لڑکیوں کے لیے تھا۔ اصل چیز "شرفا" تھے، نوکر چاکر تو انسان ہی نہیں سمجھے جاتے تھے۔ وہ تو شامل نہیں تھے اس میں۔ جیسے ہماری والدہ کی پھوپھی تھیں اکبری بیگم، ان کا ناول تھا "گودڑ کا لال"......اس میں انھوں نے یہ کیا ہے کہ اس میں مسلم مڈل کلاس تھی، اپر کلاس تھی، نواب زادیاں تھیں اور مہریاں، مامائیں یہ بھی تھیں۔ اچھا، اس ناول کو پڑھا نہیں گیا۔ میرے خیال میں "گودڑ کا لال" ایک بہت ہی مکمل ناول ہے۔ آپ نے پڑھا ہے؟

آصف فرخی:

جی نہیں، میں نے تو نہیں پڑھا۔

قرۃ العین حیدر:

تو آپ ضرور پڑھیے، عجیب و غریب ناول ہے۔ اچھا، ہماری اماں جو تھیں وہ بہت صاحب آدمی تھیں۔ بالکل میم صاحب تھیں، ان کے ہاں ڈرائنگ روم بہت تھا، پیانو تھا، وہ خود ستار بجاتی تھیں۔ لیکن انھوں نے ایک ناول لکھا تھا جس کا نام تھا "آہ مظلوماں" اس میں انھوں نے بالکل 1918 میں وہ ناول لکھا تھا، اس میں انھوں نے یہ تکنیک برتی تھی......اب دیکھیے

ہمارے ہاں یہی تو ہے کہ ہمارے نقاد کو اور ناولسٹ کو علم ہی نہیں ان کتابوں کا THEY DON'T KNOW THESE BOOKS THEY HAVE NOT HEARD OF THESE BOOKS ''آہِ مظلوماں'' میں ایک ALTERNATIVE کی تکنیک برتی ہے انھوں نے۔ ایک گھرانا دکھایا ہے غریب، لوئر مڈل کلاس۔ ایک گھرانہ دکھایا ہے اپر مڈل کلاس جسے کہیے، نوابی ٹائپ کا ALTERNATE CHAPTERS میں ان کی کہانی بیان کی ہے اور ان دونوں کہانیوں میں کردار آپس میں نہیں ملتے۔

آصف فرخی:

اچھا۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں، IT'S A DOCU-DRAMA. IT'S A DOCUMENTRY WAS PUBLISHED IN 1918. AND SHE WROTE IT IN 1918 اس میں انھوں نے جزئیات نگاری کی ہے ایک لوئر مڈل کلاس گھرانے کی، باورچی خانے میں بیٹھ کر ناشتہ ہو رہا ہے، چنگیری میں نکالتی ہیں، کھاٹ پر بیٹھ کر وہ کھانا کھاتے ہیں۔ بالکل خالص لوئر مڈل کلاس گھرانا اور اس کے بعد اگلے CHAPTER میں ڈرائنگ روم اور بیرے۔ عجیب و غریب ناول ہے۔ AND IT WAS PUBLISHED IN 1918 تو میں نے چونکہ خود وہ دونوں ماحول دیکھے، وہ ماحول میں نے اس طرح دیکھا، میں نے ذکر کیا ہے اس میں کہ نہٹور میں جو ہمارا تھا وہ بھی کچھ تھا فیوڈل قسم کا۔ اماں کا جو تھا، وہ تھا نوابی DEPRIVED, DISPLACED GENTRY تو یہ جو DISPLACED GENTRY تھی اس کو بڑا COMPLEX ہوتا ہے کہ WE HAVE LOST EVERY THING تو میں نے ان کا وہ بھی ماحول دیکھا ہوا ہے۔ تو وہ سب میرے دماغ کے HINTER-LAND میں ہے اور جب میں لکھتی ہوں تو وہ سب اس میں آجاتا ہے۔ THERE FORE I FEEL IT۔ اب نقادوں نے میرے لیے یہ لکھا ہے کہ صاحب یہ تو صرف ڈرائنگ روم کی باتیں کرتی ہیں۔ WHICH IS NOT TRUE۔ میں نے اتنا لکھا ہے مڈل کلاس ماحول

کے اوپر بہت لکھا ہے۔

آصف فرخی:

یہ ماحول کہیں کہیں ''آگ کا دریا'' میں بھی آتا ہے۔ ''آگ کا دریا'' اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت عمدہ کتاب ہے لیکن ہمارے نقاد اس میں اٹکتے بہت ہیں، اس سے آگے دیکھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں نہیں، اس کے آگے نہیں دیکھتے۔ پڑھا ہی نہیں ہے انھوں نے میری جو SHORT STORIES ہیں، وہ کسی نے نہیں پڑھا۔ بس ایک ''سیتاہرن'' کے علاوہ اب مجھے اس وقت خود یاد نہیں آ رہا کئی لکھی ہیں میں نے۔

آصف فرخی:

ہاؤسنگ سوسائٹی بڑی اہم تحریر ہے۔

قرۃ العین حیدر:

''ہاؤسنگ سوسائٹی'' ہے اس کے علاوہ بھی میں نے ''اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو'' ہے۔ اچھا اب ''اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو'' بالکل SOLID لوئر طبقہ SO-CALLED محنت کش طبقہ لکھنؤ کا گلیوں میں رہنے والیاں، ڈومنیاں، میراثنیں۔ میں نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

آصف فرخی:

اس طبقے کے بارے میں آپ نے بار بار لکھا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یہ مجھے HAUNT کرتا ہے۔

آصف فرخی:

یہ عورتیں جو ON THE FRINGE OF RESPECTABLITY اور جن کا مقام متعین نہیں ہے معاشرہ میں۔

قرۃ العین حیدر:

یہ مجھے HAUNT کرتی ہیں، I KNOW THEM اور I KNOW THEM !
BECAUSE OF وہی جو بیک گراؤنڈ میں نے آپ کو بتائی۔ وہ آئی تھیں گانے کے لیے اور یہ سب بچپن سے مجھے یاد ہے۔ مجھے وہ خاتون یاد ہیں.....ایک عورت آئی تھی، میں نے اس کے بارے میں لکھا بھی ہے، اس نے ایک روپیہ اماں سے مانگا۔ دلائی اوڑھے آتی تھی رات کو۔ ''بیگم صاحبہ، ایک روپیہ دو''۔ اماں نے اسے ایک روپیہ دیا۔ اماں نے پوچھا ''کیا کرتی ہو'' جی کچھ نہیں۔ اماں نے پوچھا ''تمھارا میاں کیا کرتا ہے۔ کہنے لگی، میاں نہیں ہے'' اماں نے کہا، بیوہ ہو۔ مسکرا کر چپ ہوگئی پھر کہنے لگی، ہمارے ہاں شادیاں نہیں ہوتیں'' اتنے میں اماں کے ایک رشتے کے چچا آگئے، کہنے لگے، یہ تو یہاں کی بڑی مشہور طوائف تھی۔ اور یہ ایک روپیہ لے لیتی ہے بھیک مانگ کر، پھر اس سے چرس پیتی ہے تو چمپا کے بارے میں جو میں نے لکھا ہے آخر میں، وہ اسی کو دیکھ کر لکھا ہے۔

تو مطلب یہ کہ.....اس طرح ہوتا ہے۔ بھان متی کا پٹارہ ہوتا ہے انسان کا ذہن، طرح طرح کی چیزیں یاد رہتی ہیں، کیریکٹرس یاد آتے ہیں۔

آصف فرخی:

ان طویل افسانوں میں یا مختصر ناول ہی کہنا بہتر ہوگا ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' مجھے بہت پسند ہے۔ ایک تو کراچی کو TRANSITION کے PHASE میں بڑی مہارت سے لکھا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

حالانکہ یہ سب اس وقت شروع ہوا ہی تھا۔ یہ RAT RACE کا آغاز تھا اس وقت۔ اب تو بہت آگے چلی گئی ہے RAT RACE۔

آصف فرخی:

پہلے یہ شاید ایک شہر کا سمبل تھا، اب تو پورے ملک کی علامت معلوم ہوتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اچھا............

آصف فرخی:

'ہاؤسنگ سوسائٹی' کے ساتھ جس کتاب کا ذکر کیا جا سکتا ہے وہ ہے "سیتاہرن" اس کی مرکزی کردار سیتا بھی خوب ہے۔ مختلف لوگوں کے ساتھ جاتی ہے لیکن ہر ایک کے ساتھ جسم و ذہن کے پورے خلوص کے ساتھ۔ انگریزی محاورے میں اس کا دل سونے کا SHE HAS A HEART OF GOLD۔ وہ ہر ایک کے ساتھ SINCERE ہے۔

قرۃ العین حیدر:

SHE HAS A HEART OF GOLD BUT SHE IS JUST AN EXPLOITED, MODERN, LIBERATED WOMAN کیونکہ میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں اس طرح کی لڑکیوں کو دیکھ کر کہ آپ اپنے کو کتنا ہی LIBERATED سمجھیں اور LIBERATED ہو جائیں لیکن EVENTUALLY EVEN IN YOUR LIBERATION YOU ARE EXPLOITED BY MEN وہ اپنے آپ کو سمجھتی ہیں کہ ہم LIBERATED ہو رہے ہیں، ہم ماڈرن ہیں، ہم آزاد ہیں لیکن وہ آزاد نہیں ہیں۔ THEY ARE AGAIN AT THE MERCY OF MEN وہ مرد چاہے ان کو چھوڑ دیں چاہے ان کو EXPLOIT کریں، چاہے ان سے شادی کریں اس کو نہ چھوڑیں۔ AT THE END THEY ARE AGAIN IN THE SAME SITUATION AS A WOMAN WHO HAS BEEN BLATANTLY EXPLOITED BY MEN اس چیز کو ہماری خواتین تیار نہیں ہیں ماننے کے لیے۔ جب وہ بہت لبریشن میں آجاتی ہیں تب بھی EVENTUALLY THEY ARE BEING MANIPULATED BY ME. THEY ARE NOT LIBERATED.

آصف فرخی:

عینی آپا آپ کی یہ بات بہت غور طلب ہے۔ کل بھی آپ نے اسی طرح کی ایک بات کہی تھی جس پر میں بعد میں سوچتا رہا۔ آپ نے ہماری ایک محترم دوست کے حوالے سے کہا تھا کہ وہ مردوں سے برابری کا دعویٰ اس لیے کرتی ہیں کہ وہ مردوں کو برتر سمجھتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں بالکل مردوں کی EQUALITY ہے کہ آپ ان کی طرح بیٹھیں، ایسے ٹانگیں کر کے، ایسے سگریٹ پئیں، پھکڑ قسم کی باتیں کریں، تو آپ یہ ظاہر کر رہی ہیں کہ YOU HAVE ACHIEVED A KIND OF METAPHYSICAL MANHOOD. (قہقہہ) اور کیا؟ بھئی خاتون تو اس طرح نہیں بیٹھے گی اور نہ اس طرح BEHAVE کرے گی۔ اس کے اندر نہیں ہے یہ چیز خاتون میں، عورت میں ایک بنیادی RESTRAIN ہوتا ہے، یا ایک حیا ہوتی ہے یا ایک SENSE OF PROPORTION ہوتا ہے، ہر عورت میں ہوتا ہے، وہ اگر نہیں ہے آپ میں یا آپ نے خود ہی اس کو چھوڑا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ YOU ARE TRYING TO COPY MEN ہیں ناں؟ تو عورت ہونے میں عورت سمجھنے میں اپنے آپ کو یہ عورت کی طرح BEHAVE کرنے میں مضائقہ کیا ہے؟

آصف فرخی:

نہیں، مضائقہ کیا ہوگا اگر یہ کسی کے لیے نیچرل ہے تو ٹھیک ہے اور آپ خاتون ہیں تو جو چیز آپ کے لیے نیچرل ہے۔

قرۃ العین حیدر:

تو پھر بالکل نیچرل ہے۔ لیکن اگر وہ یہ سمجھتی ہیں کہ خاتون کی طرح BEHAVE کرنے سے وہ بیک ورڈ بھی جائیں گی...... یہ مسئلہ ہو گیا ہے ناں یہ بات ہے۔

آصف فرخی:

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے شاید۔ ہمارے ہاں عورت کا ایک STEREO TYPE لوگوں کے ذہنوں میں آ جاتا ہے اور یہ ادب میں بھی ہوتا ہے۔ نقاد بھی یہ کرتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

صاحب! مرد نقادوں کی تو آپ بات ہی چھوڑ دیجیے۔ مرد نقاد جو ہیں ہمارے ہاں وہ زیادہ تر ایسے ہیں THEY ARE MALE CHAUVINISTS. MOST OF THEM۔ بہت کم

ایسے ہیں جو اس طرح نہیں سوچتے۔ یا پھر اگر ہیں تو وہ پھر یہ کہ سرپرستانہ انداز ہوگا خواتین کے لیے۔ یا یہ ہوگا کہ وہ HOSTILE ہوں گے۔ یا پھر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ بالکل اپنے آپ کو بغیر کسی PREJUDICE کے ENGAGE کریں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بہت کم نقاد ایسے ہیں جو پوری SINCERITY کے ساتھ لکھیں خاتون لکھنے والی پر۔ کم از کم میری حد تک تو یہ ہوا کہ یا تو مجھ سے HOSTILE ہیں کہ میں، بہت بر خود غلط ہوں کہ ان کے خیال میں، تو وہ یا تو مجھ سے HOSTILE ہیں، یا پھر وہ مجھے IGNORE کرتے ہیں۔ اور یا پھر وہ..... ٹھیک ہے، بہت سے لوگوں نے لکھا مجھ پر BUT NONE OF THEM HAVE... TRIED TO UNDERSTAND بس یہ کہتے ہیں کہ ہاں، انھوں نے کتابیں بہت پڑھی ہوئی ہیں، وہ مغربی کتابیں، بہت پڑھی ہیں...... مطلب یہ کہ وہ ایسی PETTY جزئیات میں چلے جاتے ہیں، جو میں نے لکھا کوئی اس کو نہیں دیکھتا۔

آصف فرخی:

جزئیات سے زیادہ بعض دفعہ ذاتیات میں چلے جاتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

ذاتیات میں بہت جاتے ہیں۔ بہت جاتے ہیں، اس کا TEXT سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پھر آج کل وہ ایک نئی چیز اور بھی تو آ گئی ہے کہ رائٹر کو نہ پڑھیے، رائٹر کے پورے بیک گراؤنڈ کو پڑھیے۔ آج کل یہ بھی تو ایک نیا ٹرینڈ ہے۔ یہ ساختیات وغیرہ کیا ہیں؟ نقادوں کو ایک نیا مشغلہ چاہیے۔ THEY SHOULD HAVE SOMETHING TO WRITE ABOUT۔

آصف فرخی:

آپ نے جو بیک گراؤنڈ کا ذکر کیا تو آپ نے جتنی تفصیل کے ساتھ اپنا بیک گراؤنڈ لکھا ہے بلکہ صدیوں پیچھے جا کر شروع کیا ہے، ''کارِ جہاں دراز ہے'' میں یہ تو ایک بالکل مختلف قسم کا تجربہ ہے۔ اس پر بعض لوگوں کو یہ اعتراض بھی ہے کہ انھوں نے اپنے خاندان کو بہت GLORIFY کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اس کے لیے میں اس کے علاوہ کیا کہہ سکتی ہوں کہ یہ NON-FICTION NOVEL میں نے لکھا۔ لوگ اس کو نہیں سمجھ سکتے ہیں تو میرا اس میں کیا قصور ہے، آپ بتائیے؟ (قہقہہ) کتنی آسان بات ہے کہ آپ یہ بتائیے کہ آپ کے دادا نے یہ کیا اور آپ کے نانا نے یہ کیا تو اس کو کون پڑھے گا؟ لیکن جو کچھ آپ کے دادا یا نانا نے کیا اس کو افسانوی رنگ میں لکھیں۔ افسانے کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں کوئی مبالغہ شامل ہو جائے لیکن آپ اس کو DESCRIBE کرنے میں، آپ کا جو اسٹائل ہے وہ پیش کرتا ہے کہ نانا صبح کو اٹھ کر حقہ پی رہے تھے۔ اب نانا کے صبح کو اٹھ کر حقہ پینے کے ساتھ وہ پورا ماحول ہے، آپ نے وہ پیش کر دیا تو بات دوسری ہو گئی۔

آصف فرخی:

یہ تو NARRATIVE کا تجربہ ہو گیا۔

قرۃ العین حیدر:

یہ تو سیدھی سادی بات ہے۔ لوگوں کو اس میں کیا پرابلم ہوا؟ بھئی میں نے یہ کہا کہ صبح کو اٹھ کر بڑھیا نے دروازہ کھولا اور وہ نکل کر آئے اور وہاں مرغیاں گھوم رہی تھیں اور انھوں نے یہ کہا تو WE ARE DESCRIBING A MODERATE HOUSE HOLD۔ اس میں کیا قباحت ہے؟ اس میں پرابلم کیا ہے؟ ایسا میں نے کہہ دیا ہے؟ پرابلم کیا ہے، میری سمجھ میں نہیں آیا۔

آصف فرخی:

مشکل یہ ہوتی ہے ان نقادوں کو، اگر آپ کے پورے ادبی کیریئر کو دیکھا جائے تو آپ ایک تخلیقی دائرہ قائم کرتی ہیں، پھر خود ہی اس دائرے کو توڑ کر آگے نکل جاتی ہیں، ایک نئے تجربے اور اس کے نئے اظہار کی طرف۔ آپ کے پورے کیریئر میں DEVELOPMENT اور GRWOTH کا احساس ہوتا ہے لیکن ہمارا نقاد اس طرح GROW نہیں کرتا، وہ بالکل مانوس چیزوں سے آگے بڑھ کر دیکھنے اور ایک نیا ویژن حاصل کرنے کے عمل سے بار بار نہیں گزر سکتا۔ وہ

آپ کی ابتدائی کتابیں جو ہیں، ''آگ کا دریا'' ہے خاص طور پر اس پر DISCOURSE قائم کرنے کے لیے بنیادی LANGUAGE ہی نہیں FORMULATE کر سکا۔ جبکہ آپ کا تخلیقی سفر نئی منزلوں کی طرف جاتا رہتا ہے، مثلاً ''آگ کا دریا'' میں کرداروں کی نفسیات یا تجربے کے پیچھے جو احساس ہے وہ HISTORICITY کا ہے، ان کا EXPERIENCE تاریخ میں اتر کر مکمل ہوتا ہے......

قرۃ العین حیدر:

ہاں، وہ تو ہے۔

آصف فرخی:

لیکن ''گردشِ رنگِ چمن'' میں تاریخ کے مقابلے میں یہ سفر اندر کی طرف ہوتا ہے اور کرداروں کے انفرادی تجربے کے پیچھے جو DIMENSION ہے وہ METAPHYSICAL ہے، آپ اس کے اتنے قریب پہنچ گئی ہیں کہ لگتا ہے کہ اس کو چھوئیں گی۔ یہ کتاب ایک مختلف قسم کا تجربہ ہے۔ کچھ اس کے بارے میں بتائیے۔

قرۃ العین حیدر:

یہ دیکھیے نا، انسان گرو کرتا ہے اور نئی باتیں سوچتا ہے۔ YOU CAN'T GO ON WRITING THE SAME THING OVER AND OVER AGAIN۔ آپ نئی بات لکھیں گے، آپ کو نیا تجربہ ہوگا، وہ لکھیں گے۔ اب میں اودھ کے دیہات میں گئی۔ میں بھیا سے ملی جن کا میں نے اس میں تذکرہ کیا ہے۔ میں نے یہاں وہ ماحول دیکھا جس کا تذکرہ صوفیا کی کتابوں میں پڑھا ہے۔ کس طرح لوگ بیٹھتے ہیں، آ کر، کس طرح باتیں ہوتی ہیں، کس طرح دیگیں چڑھتی ہیں، کس طرح ایک خاص ماحول ہوتا ہے۔ وہ ماحول میں نے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ دنیا بھی ہندستان میں موجود ہے اور گاؤں گاؤں میں موجود ہے اور جس ہندستان کا تذکرہ ہم پڑھتے ہیں اخباروں میں کہ فساد ہو رہے ہیں اور ہندو نے مسلمانوں کو مار دیا اور مسلمان نے ہندو کو مار دیا اور کلچر کی بات ہو رہی ہے، وہ یہاں آ کر پتا چلتا ہے کہ IT IS

اب REALLY NOT THERE. IT IS NOT THERE. IT DOES NOT EXIST. WHAT CAN YOU DO ABOUT IT? اس چیز کو آپ بیان کریں تو کوئی ماننے کو تیار نہیں ہے

آصف فرخی:

یہ آپ کے پچھلے کام کو دیکھتے ہوئے بالکل ایک مختلف تجربہ ہے۔

قرۃ العین حیدر:

تجربہ یہ ہے کہ:

THAT WORLD HAD LIVED. BUT NOBODY BOTHERS TO SEE IT AND THAT WORLD EXISTS IN MOST VILLAGES AND SMALL TOWNS OF INDIA, FROM THE NORTH RIGHT DOWN TO THE SOUTH, UNLESS WHENEVER IT IS FOULED UP BY THE POLITICIANS. THE WORLD IS THERE.

آصف فرخی:

اسی طرح نقاد "چاندنی بیگم" میں بہت الجھے ہیں۔ اس میں کردار سے زیادہ زمین کی ملکیت کا مسئلہ اہم ہے بلکہ کردار اس کی علامت ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں اور کیا۔ مگر کیوں یہ لوگ کیوں نہیں سمجھتے؟ زمین اور زمین کی ملکیت ایک بڑی بھاری حقیقت ہے ہماری سوسائٹی میں۔ یہ کیوں نہیں سمجھتے؟

آصف فرخی:

شاید انھوں نے نام سے دھوکا کھایا کہ یہ ایک انفرادی کردار پر مرتکز ہے جبکہ ذرا غور سے دیکھا جائے تو آپ زمین کے POSSESSION کی بات کر رہی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

POSSESSION کی بات کر رہے ہیں اور "چاندنی بیگم" REPRESENTS A CERTAIN DOMINATED ASPECT OF WOMANHOOD. SHE IS IN

SEARCH OF PROTECTION. SHE GETS IT. AND THEN SHE DOES NOT GET IT WHICH IS A... اب اس پر خواتین بہت اعتراض کریں گی اور لبریٹیڈ خواتین۔ BASICALLY IN OUR SOCIETY A WOMAN IS IN SEARCH OF PROTECTION AND RECOGNITION AND ASSERTION OF HERSELF. ٹھیک ہے؟ اب وہ چاہے کوئی ماڈرن رائٹر، ماڈرن پوئٹ ہو...... یہ جو ماڈرن شاعرات اس طرح کی بات کر رہی ہیں، WHAT ARE THEY TRYING TO PROVE? THEY ARE TRYING TO PROVE THEIR EQUALITY WITH MEN ابھی جو میں نے بات کی آپ سے، یعنی انھیں اپنے عورت ہونے کا اس طرح احساس ہے کہ جیسے یہ کوئی INADEQUATE بات ہے، اور ہم وہی کریں گے جو مرد کرتے ہیں۔ یہ جو SYNDROME ہے یا یہ جو احساس کمتری ہے، یہ بنیادی طور پر موجود ہے۔ ہمارے معاشرے کی عورت میں۔ یہ موجود ہے اور نہیں نکلتا۔ نکل جائے گا کچھ عرصے کے بعد شاید۔ اس احساس کمتری کو CRUSH کرنے کے لیے یا NEUTRALIZE کرنے کے لیے جو WOMEN'S LIB شروع میں ہوا تھا، ہندستان میں، وہ پہچان گیا تھا اس مسئلے کو۔ AND THEY TRIED TO OVERCOME THIS SENCE OF INADEQUACY IN WOMAN [illegible] نے کہا کہ ہم اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں۔ ہم کو مردوں سے اس طرح کی برابری نہیں چاہیے۔ WE WANT OUR OWN INDEPENDENCE IN OUR OWN CONTEXT, IN OUR OWN FRAME WORK AND THIS WE MUST GET ٹھیک ہے؟ اور اس میں کامیاب رہیں وہ۔

آصف فرخی:

یہ کس دور کی خواتین کے بارے میں کہہ رہی ہیں آپ؟

قرۃ العین حیدر:

جس دور کی خواتین نے شروع کیا تھا یہ لبریشن کا موومنٹ ہندستان میں، بالکل شروع

سے، اس صدی کے شروع سے اور اس میں وہ کامیاب رہیں۔ اب دیکھیے ناہندستان میں اتنی لڑکیاں، عورتیں اور پاکستان میں بھی کالج جارہی ہیں، یونیورسٹی جارہی ہیں۔ اب لڑکیوں کا کالج جانا غیر معمولی بات سمجھی ہی نہیں جاتی۔ IT'S PART OF LIFE۔ پہلے نہیں تھا۔ تو ان خواتین نے اس کے لیے کوشش کی۔ وہ اسکول گئیں، کالج گئیں، انھوں نے مشکلات کا سامنا کیا۔ ان کے لیے لوگوں نے باتیں بنائیں مگر انھوں نے اپنا کام کیا۔

آصف فرخی:

میں گفتگو کا رخ ایک اور جانب کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے ادبی کیریئر میں ایک بات بہت اہم رہی ہے اور وہ یہ کہ آپ نے تخلیقی کام کے ساتھ ساتھ ترجمے پر زور دیا۔ اس طرح آپ نے زبان کو ENRICH کیا اور بیانیہ کے نئے سانچے ڈھالے......

قرۃ العین حیدر:

بھئی، ترجمے کا مسئلہ یہ ہے کہ بچپن میں، میں نے 'پھول' میں لکھنا شروع کیا۔ کہانیاں وغیرہ۔ اور اسی زمانے میں ترجمے کرنا شروع کردیا تھا۔ اسی زمانے میں جب میں نے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ میں نے 'ایلیس ان ونڈر لینڈ' کا ترجمہ کیا جو SERIALIZE ہوا 'پھول' میں۔ یہ غالباً 39 کی بات ہوگی۔ اس کو میں نے مختصر کر کے لکھا۔ میں اس وقت تیرہ، چودہ سال کی ہوں گی جب میں نے یہ ترجمہ کیا۔ اچھا اس کے بعد میں نے کئی کہانیاں ترجمہ کیاں۔ میرا ایک مضمون تھا جو پہلی مرتبہ ''تہذیب نسواں'' میں چھپا تھا۔ وہ یہ تھا کہ مسز وجے لکشمی پنڈت نے ایک مضمون لکھا تھا THE STORY OF A PINK CARPET جب وہ کانگریس کی طرف سے لوکل گورنمنٹ بنی تھی تو اس میں منسٹر ہوئی تھیں، تو انھوں نے لکھا تھا کہ کس طرح میں دفتر گئی اور پردے بدلوائے، قالین نیا ڈلوایا اور پھول لا کر لگوائے۔ میں نے اس مضمون کا ترجمہ کیا جو ''تہذیب نسواں'' میں چھپا۔ پھر میں نے بعد میں تو بہت ترجمے کیے ہیں۔ میں نے روسی ناولوں کے ترجمے کیے، انگریزی سے۔ مکتبہ جامعہ نے مجھ سے بہت ترجمے کروائے روسی کتابوں کے اور بچوں کے لیے بہت ترجمے کیے ''شیر کے بچے''، ''لومڑی کے بچے''، ''بہادر گھوڑا'' یہ اور یہ (ہنسی) بے شمار کیے ہیں مجھے بہت

پسند تھے۔ مجھے ترجمہ کرنا اچھا لگتا ہے۔

آصف فرخی:

کیوں؟

قرۃ العین حیدر:

IT'S A VERY CREATIVE THING، اس میں بہت CREATIVITY ہے۔
ہاں، YOU ARE CREATING SOMETHING DEIFFERENT FROM A DEIFFERENT LANGUAGE. IT'S A VERY IMPORTANT THING.

آصف فرخی:

ہمارے ہاں ترجمے کو دوسرے درجے کا کام سمجھا جاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

غلط ہے۔ IT'S A VERY CREATIVE THING۔ اس کو تو آپ دوسرے درجے کا کام سمجھ ہی نہیں سکتے۔ میں نے ایک تو "پورٹریٹ آف اے لیڈی" کا ترجمہ کیا تھا۔ پھر ایلیٹ کا ایک ترجمہ کیا۔ ترجمے میں نے بہت کیے ہیں۔ I ENJOY TRANSLATIONS۔

آصف فرخی:

اس طرح آپ نے مضامین بھی لکھے ہیں۔ فکشن کے ساتھ ساتھ یہ فکشن پر مقالے بھی بہت اہم ہیں۔ کچھ مقالے سفر کے حوالے سے ہیں اور بعض مضامین فکشن کی تنقید پر ہیں جن کو پڑھ کر مجھے لگتا ہے کہ جتنی بڑی آپ فکشن رائٹر ہیں، اسی حساب سے فکشن کی بہت اہم ناقد بھی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

ان مقالوں کا لوگوں نے کچھ نوٹس نہیں لیا (ہنسی) نوٹس نہیں کیا۔ تو ٹھیک ہے۔

آصف فرخی:

بعض مضامین میں تو آپ نے نقادوں کے چھکے چھڑا دیے......

قرۃ العین حیدر:

اسی لیے نوٹس نہیں لیا۔ وہ جو نقادوں کی ایک مافیا ہے وہ اس مافیا کو توڑنا نہیں چاہتے۔ میں نے پرواہ بھی نہیں کی I COULD'T CARE LESS ۔ میرے لیے ادب اوڑھنا بچھونا نہیں ہے کہ میں اس کے لیے پریشان بیٹھی رہوں کہ ہائے اس نے میرا نوٹس نہیں لیا، ہائے اس نے یہ کیا (ہنسی) I TAKE IT ALL IN MY STRIDE, I DON'T CARE۔

آصف فرخی:

ہاں، یہ میں نے کئی بار نوٹ کیا کہ آپ اپنے کام کے بارے میں کچھ بے نیازسی ہیں بلکہ آپ کا اس بارے میں رویہ کچھ LIGHT HEARTED سا ہوتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

LIGHT HEARTED، بلکہ مجھے کوفت ہوتی ہے۔ I FEEL VERY EMBARASSED بہت فنی لگتا ہے کہ اپنے بارے میں کیا لکھوں، میں اور میرا فن اور میں یہ کرتی ہوں اور میری فنی تخلیق کا یہ ہوا..... بھئی مجھے یہ باتیں بہت بوگس لگتی ہیں۔ YOU WILL NEVER CATCH ME TALKING LIKE THIS۔ البتہ اگر آپ کوئی سوال کریں کہ آپ نے فلاں چیز کیسے لکھی؟ اس کا میں جواب دے دوں گی۔ لیکن اب میں خود بیٹھ کر کہوں کہ جب میں نے فلاں ناول لکھا تھا تو میرے اوپر یہ کیفیت طاری ہوئی اور میں نے یہ کیا۔ بھئی یہ سب بوگس باتیں ہیں۔ لوگ یہی کرتے ہیں۔ میں بوگس اور HYPOCRITE لوگوں کو برداشت نہیں کرسکتی۔ لیکن کچھ لوگ ہیں اس طرح کے۔

آصف فرخی:

ادب میں بھی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

ادب میں بھی ہیں۔ جیسے اور سب جگہ ہیں، ویسے ادب میں بھی ہیں۔

(2)

آصف فرخی:

عینی آپا، آپ کے اردو افسانے پڑھ کر کسی دل جلے نے تبصرہ کیا تھا کہ ان کی انگریزی بہت اچھی ہے۔ کیا آپ نے کبھی انگریزی میں لکھنے کے بارے میں سوچا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

(ہنستے ہوئے) بہت لکھا ہے میں نے۔ بہت لکھا ہے اور میں تو انگریزی ہی میں لکھتی ہوں اب بھی میری تو بے شمار چیزیں انگریزی میں ہیں۔

آصف فرخی:

لیکن جو آپ کا بنیادی کام ہے فکشن، وہ......

قرۃ العین حیدر:

بنیادی کام ہے لیکن بمبئی میں IMPRINT کی ایڈیٹر رہی ہوں، تو میں نے پانچ سال اس میں لکھا انگریزی میں۔ میں ریویو کرتی تھی، تھیٹر، سنیما، کتابیں، وہ میرا ہر مہینے کا کام تھا، BESIDES BOOKS جو کہ میرا صفحہ تھا۔ پھر میں ''ویکلی'' میں رہی تو میں نے اس میں برابر لکھا۔ کبھی میں سوچتی ہوں کہ میرے جتنے مضامین ہیں انگریزی میں، میں ان کا انتخاب کروں۔ بہت لکھا ہے میں نے، ویکلی میں لکھا ہے، بے حد لکھا ہے، بے شمار مضامین لکھے ہیں۔

آصف فرخی:

میرے سوال کا مقصد تھا کہ آپ نے انگریزی کو اپنے ادبی افسانہ کی زبان بنانے اور فکشن کا جو ORIGINAL کام آپ نے کیا ہے، اس کو انگریزی میں لکھنے کے بارے میں سوچا؟

قرۃ العین حیدر:

فکشن کا اوریجنل کام؟

آصف فرخی:

یعنی جیسے احمد علی نے انگریزی میں ناول لکھا......

قرۃ العین حیدر:

نہیں نہیں، دیکھیے احمد علی وغیرہ نے لکھا ہے لیکن لکھنا تو پہلے انھوں نے اردو ہی سے شروع کیا، پھر انھوں نے انگریزی میں لکھا۔ میں نے تو انگریزی میں لکھا ہے فکشن......میری کہانیاں ساری میں نے تو خود انگریزی میں ترجمہ کی ہیں یا ان کو ری رائٹ کیا ہے 'فائر فلائز ان دی مسٹ' انگلش میں ناول ہے میرا۔ پھر کہانیوں کا مجموعہ ہے "THE SOUND OF FALLING LEAVES" وہ انگریزی میں ہے۔ RIVER OF FIRE بھی انگریزی میں ہے...... 'آخر شب کے ہم سفر' کا بھی میں نے لکھا ہے وہی فائر فلائز ان دی مسٹ......تو میں نے تو بہت لکھا ہے، میری یہ کتابیں انگریزی میں چھپ چکی ہیں۔

آصف فرخی:

ان دنوں خاص طور پر ہندستان میں انگریزی میں لکھے جانے والے فکشن کا بہت دور دورہ ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک نیا اور بہت منفرد دور ہے، تو اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

قرۃ العین حیدر:

بھئی، اچھا لکھا جا رہا ہے۔ انگریزی تو وہاں کی چودھویں یا پندرھویں سرکاری زبان ہے۔ مطلب ONE OF THE NATIONAL LANGUAGES OF INDIA۔ یہ CONSTITUTION میں ہے یہاں شاید نہیں ہوگی کنسٹی ٹیوشن میں۔ لیکن وہاں انگریزی پندرہ سرکاری زبانوں میں سے ایک ہے، وہاں انگریزی کا پورا پریس ہے اور بہت بڑا پریس ہے۔ بہت اچھے اخبار رسالے نکلتے ہیں، اخبار بہت نکلتے ہیں، ان کے ویکلی اور سنڈے ایڈیشن ہوتے ہیں۔ بھئی وہاں یہ ہے نا کہ انگلش LINK LANGUAGE ہے، جو یہاں اتنی نہیں ہے، یہاں اردو لنک لینگویج ہے اور یہاں میرے خیال میں انگلش کا اتنا چلن نہیں ہے۔ وہاں بہت ہے۔

خاص طور پر ساؤتھ انڈیا میں۔ آپ کو عوام عام طور پر انگلش بولتے ملیں گے۔ ساؤتھ میں۔ انگریزی کا تو وہاں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

آصف فرخی:

یہ بڑا مختلف قسم کا واقعہ ہوا کہ انگریزی اقتدار کے اتنے عرصے کے بعد وہاں انگریزی فکشن میں ایک ایسی تخلیقی رو آئی اور اس وقت ساری دنیا میں انڈین رائٹنگ ان انگلش کی بات ہو رہی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

بہت اہمیت ہے اب تو انگلش کی اور انگلش میں جو ایک INDO-ANGLIAN FACTOR ہے، وہ تو ایک باقاعدہ رجحان ہے اور اس کی بہت اہمیت ہے۔ بہت لکھا جا رہا ہے، خاص طور پر رویدمہتا ہے اور کون کون ہیں۔ خواتین بہت لکھ رہی ہیں۔

آصف فرخی:

جو لکھا جا رہا ہے اس میں یقیناً بہت سی چیزیں عمدہ بھی سامنے آ رہی ہیں لیکن گڑبڑ والی بات یہ ہے کہ اس کو ISOLATE کر کے دیکھا جائے۔ سلمان رشدی نے جو انتھولوجی مرتب کی ہے انڈین رائٹنگ ان انگلش کی، جس کے دیباچے میں انھوں نے کہا کہ انگلش میں لکھا جانے والا یہ ادب بہتر ہے ہندستان کی باقی زبانوں کے ادب سے، دیسی زبانوں کے ادب سے شاید محض اس لیے کہ وہ انگریزی میں ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں، انھوں نے لکھا ہے کہ بہتر ہے...... ایک تو سلمان رشدی کو شاید یہ شوق ہے کہ وہ چونکا دینے والی بات کریں اور ایسی بات کریں جس پر بحث ہو۔ ایک تو یہ میرے خیال میں ان کا نفسیاتی پرابلم ہے اور دوسری بات یہ کہ انھوں نے پڑھا کہاں ہے؟ انھوں نے تو ہندستان کی زبانوں میں جو لکھا جا رہا ہے وہ انھوں نے پڑھا کہاں ہے؟ بھئی تامل میں، بنگالی میں، ملیالم میں خاص طور پر پھر پنجابی میں، گجراتی میں، ہر زبان میں بہت اچھا لکھا جا رہا ہے۔

آصف فرخی:

انھوں نے صرف منٹو کی تعریف کی ہے اور کچھ ایسا لگتا ہے کہ پارٹیشن کے اتنے عرصے کے بعد اس وقت کا جو افسانہ نگار لوگوں کو بہت اہم نظر آتا ہے وہ منٹو ہے۔ منٹو کی یہ جو کہانیاں ہیں، خاص طور پر پارٹیشن کے حوالے سے جو کہانیاں ہیں، ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

قرۃ العین حیدر:

بھئی منٹو بہت اچھا افسانہ نگار تھا۔ منٹو نے کیا کیا ہے، اتنا لکھا گیا ہے کہ میں اور مزید کیا کہوں۔ لیکن منٹو کو پورے ایک عہد کا یا پوری ایک زبان کا یا ایک پورے کلچر کا واحد SPOKESMAN بنانا تو غلط ہے کہ فقط منٹو ہی منٹو تھا۔ وہ اس میں ہوا یہ ہے کہ ایک تو اس کے موضوعات جس طرح کے تھے ان کو لوگ بہت پسند کرتے تھے، فوراً INTERESTING لگتا تھا۔ زبان اچھی تھی، چٹخارے دار بات لکھتے تھے۔ کہانی کہنے کا انھیں فن آتا تھا SO HE BECAME IMMENSELY POPULAR IN OTHER LANGUAGES تو منٹو کی اہمیت کو میں کم نہیں کر رہی ہوں، منٹو بہت اہم ہیں لیکن منٹو کے علاوہ اردو میں، اس دور میں اور بھی بہت اچھے افسانہ نگار ہیں۔ لیکن باہر کے لوگوں کے لیے منٹو HAS BECOME THE SYMBOL OF ALL THIS یہ ہوا ہے۔ ترجمہ بھی اس کا بہت ہوا ہے۔ پھر ہمارے ہاں کمزوری ایک یہ ہے اور جو ذہنیت ہماری ابھی تک ہے انگریزی سے یا گورے سے متاثر ہونے کی یا مرعوب ہونے کی کہ اگر کوئی انگریزی بولنے والا، امریکن یا انگریز اردو والا کسی کو TAKE-UP کر کے اردو کے رائٹر کو اور اس کے بارے میں لکھے تو ہمارے ہاں سب اس سے بڑے رعب میں آتے ہیں کہ صاحب فلانے انگریز نے یہ لکھا ہے۔ اس سے یہ ہوا منٹو کے لیے بھی...... چونکہ منٹو کو بہت پڑھا گیا باہر کی زبانوں میں بھی کہ وہ ایک SYMBOL بن گیا۔ میں نے یہ دیکھا ہے، نام میں نہیں لوں گی، چند ایک خواتین ہیں، اردو میں بھی لکھتی ہیں اور امریکن ہیں، ان کا یہاں بہت رعب ہے۔ بہت زیادہ رعب ہے ان کا کہ انھوں نے یہ کہا تو یہ ہماری افسوسناک ذہنیت ہے۔ ہمیں تو بڑا افسوس ہے۔ AND I FEEL VERY EMBARASSED AT THIS۔

آصف فرخی:

آپ ذکر کر رہی ہیں اس وقت کے افسانوں کا۔ منٹو کے ساتھ کرشن چندر، بیدی اور عصمت چغتائی تو خیر آپ سے سینئر تھے۔ آپ کے تقریباً ہم عمر یا آپ کے فوراً بعد آنے والے لوگوں میں آپ کو کون سے لکھنے والے اہم معلوم ہوتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

بھئی یہ دونوں بہنیں بہت اچھا لکھتی تھیں، ہاجرہ اور خدیجہ۔ اچھا لکھتی تھیں، بہت اچھا لکھتی تھیں۔ اب مجھے اور اس وقت کے لوگ یاد نہیں آ رہے ہیں۔ لیکن ایک رائٹر تسنیم سلیم چھتاری تھیں انھوں نے بہت کم لکھا۔ لیکن وہ بھی اچھا لکھتی تھیں۔ ممتاز شیریں اچھی CRITIC تھیں۔ ان کو اچھا افسانہ نگار تو کہنا ذرا مشکل ہے۔ انھوں نے لکھا اور انھوں نے ساؤتھ انڈیا کے مسلمانوں کی زندگی پیش کی وہ اپنی جگہ دلچسپ ہے لیکن گرفت نہیں ہے ان کے ہاں کہانی میں۔

آصف فرخی:

ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کی کہانیاں آپ کو یاد آ رہی ہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' ان کی کہانیوں سے زیادہ بہتر ہے، ان کی بعض کہانیاں تو ایسی ہیں کہ پڑھنے میں بالکل معمولی لگتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

اچھا میں نے بھی ان کی کہانیاں بہت زمانے سے نہیں پڑھیں لیکن میرے خیال میں وہ اچھا لکھتی تھیں۔ ''آنگن'' بہت اچھا ہے۔

آصف فرخی:

''آنگن'' واقعی اچھا ہے۔ آپ کو یہ ناول پسند ہے؟

قرۃ العین حیدر:

ہاں، بہت پسند ہے۔ بڑا ستھرا ناول ہے۔ بہت COMPACT ہے۔

آصف فرخی:

اسی زمانے کی کہانیوں میں جیلہ ہاشمی کی بعض کہانیاں یاد آتی ہیں۔آپ نے ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ان کی کہانی ''بن باس'' مجھے بار بار یاد آتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

جیلہ ہاشمی کی بعض کہانیاں بہت اچھی ہیں۔وہ بھی اچھا لکھتی تھیں۔''بن باس'' مجھے اس وقت یاد نہیں آرہی لیکن بعض کہانیاں اچھی ہیں بلکہ جب جیلہ ہاشمی نے شروع کیا ہے لکھنا تو 'نیادور' میں ان کی کہانی آئی چھپنے کے لیے۔جمیل جالبی نے مجھ سے کہا کہ بھئی ایک بہت اچھی نئی لکھنے والی ہے،اس کی کہانی آئی ہے اس کو عینی بی بی آپ بھی پڑھیے گا۔میں نے پڑھا تو مجھے بہت پسند آئی تھی۔اس طرح ان کو بالکل شروع سے ہم نے پڑھا۔اچھا لکھتی تھیں۔افسوس کہ نہ رہیں۔ پھر بانو قدسیہ کی ایک کہانی ''دشت وفا کی ہرنیاں'' مجھے یاد ہے۔

آصف فرخی:

اچھا،اس دور کے اہم اور ممتاز افسانہ نگاروں میں انتظار حسین کا نام بھی آتا ہے۔انتظار صاحب کے بعض موضوعات وہ بعض جگہ آپ کے موضوعات سے مماثلت رکھتے ہیں،حالانکہ ان کا اپروچ مختلف ہے،تو انتظار صاحب کے افسانوں کے بارے میں آپ کیا رائے رکھتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

بھئی،انتظار صاحب کا یہ ہے......ایک تو میرا اصول ہے کہ میں اپنے معاصرین کے بارے میں کوئی رائے ظاہر نہیں کرتی اور جب بھی کرتی ہوں تو ان کی تعریف ہی کرتی ہوں۔میں ان کو RUN-DOWN نہیں کرتی۔میں سمجھتی ہوں کہ یہ بڑی غیر مہذب بات ہے کہ آپ اپنے معاصرین کو RUN-DOWN کریں۔یہ کوئی CIVILIZED بات نہیں ہے۔حالانکہ میرے معاصرین میرے خلاف بہت لکھ چکے ہیں۔BUT THAT DOESN'T MATTER۔انتظار صاحب کو میں اچھا رائٹر سمجھتی ہوں،بہت غیر معمولی ہیں۔ان کی تکنیک اور اسٹائل بالکل منفرد ہے۔اس کو بالکل اسی طرح بعض لوگوں نے لکھنے کی کوشش کی ہے۔جیسے خالدہ اصغر،انھوں نے اس طرح لکھنے کی کوشش کی،انھوں نے بہت اچھا لکھا ہے۔خالدہ حسین اب جن کا نام ہے تو

انتظار حسین نے اپنا ایک CULT بھی بنایا۔ وہ اچھے رائٹر ہیں۔ میں نے ہمیشہ ان کی تعریف کی ہے۔ ایک دفعہ میرا اوران کا ساتھ ہوا تھا جرمنی میں۔ جہاں جہاں وہ گئے اور مجھے اورانھیں بلایا گیا تو میں نے ان کا تعارف کرایا اور میں نے ہر جگہ ان کی بہت تعریف کی۔ ہر محفل میں، میں نے ان کو INTRODUCE کیا۔ لیکن مجھے بعد میں یہ معلوم ہوا، پتا نہیں یہ کہاں تک غلط ہے یا صحیح ہے کہ انتظار صاحب نے مجھے RUN-DOWN کیا۔ مجھے اس سے بڑا دکھ ہوا۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں آپ کی تعریف کر رہی ہوں تو آپ میری تعریف کریں۔ یہ انجمن توصیف باہمی نہیں ہے۔ لیکن ان کو مجھے RUN-DOWN نہیں کرنا چاہیے تھا اگر انھوں نے ایسا کیا۔ یہ بہر حال اپنا اپنا مزاج ہے۔

آصف فرخی:

ان کے ابتدائی افسانوں میں ہجرت ایک موضوع یا مسئلہ بنتی ہے اور کسی نہ کسی شکل میں ان کی تازہ ترین تحریروں میں موجود ہے۔ اس مسئلے کے ادبی رخ کے بارے میں آپ کیا کہتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

اس موضوع میں گویا انھوں نے SPECIALIZE کرلیا۔ اب وہ ہجرت جو ہے، اس کو پچاس سال ہو گئے۔ بعض چیزیں ہوتی ہیں جن کی ایک دائمی اہمیت ہوتی ہے، LITERARY VALUE ہوتی ہے۔ وہ ایک تجربہ تھا اور اس کو انھوں نے لکھا۔ لیکن اس کے بعد اور موضوع انھیں شاید نہیں ملے۔

آصف فرخی:

موضوع سے زیادہ ان کے ہاں تکنیک میں تبدیلی نظر آتی ہے۔ خاص طور پر وہ کہانیاں جو انھوں نے اساطیر کے حوالے سے لکھی ہیں۔ وہ آپ کو کیسی معلوم ہوتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

اچھا وہ ہندو اساطیر کی طرف ان کی واپسی مجھے خاصی BORING لگتی ہے۔ پتا نہیں وہ

ہندو MYTHOLOGY میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہیں، جبکہ وہ اس کے بارے میں اتنا زیادہ جانتے بھی نہیں ہیں۔ اس سے ان کا مقصد کیا ہے؟ ہندستان کے لیے تو اس چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ NON-MUSLIM طبقہ اس کو پڑھے تو ان کے لیے اس میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ حالانکہ ان MYTHS کو بطور ایک SYMBOL پیش کیا ہے۔ ہیں نا؟ جو کچھ بھی کیا ہے انھوں نے اس کا فلسفیانہ WHATEVEN لیکن وہ...... وہاں کے لیے نہیں ہے۔ وہ لوگ تو خود اس کے آگے بڑھ گئے ہیں، THEY ARE FED-UP OF THAT MYTH، ان کے لیے اس میں کچھ معنویت نہیں ہے۔ کربلا کا استعارہ انھوں نے بہت استعمال کیا ہے۔ اب کربلا کا استعارہ بھی مسلمانوں کے لیے کوئی خاص نئی چیز نہیں ہے۔ بھئی، یہ دشت کربلا یا حسینؓ کی پیاس یہ تو مسلمانوں کے لیے ان کے کلچر کا ایک حصہ ہے...... IT'S A PART OF THEIR PSYCHE۔

آصف فرخی:

یہ استعارہ تو ہمارے ہاں شاعری میں دوبارہ بڑے زور شور سے آیا۔

قرۃ العین حیدر:

شاعری میں بھی آیا ہے AND YOU NEED NOT BE A SHIA TO HAVE THE RESPONSE TO THIS WHOLE THING تو وہ...... بہرحال اس کو انھوں نے REVIVE کیا ہے یا جو کچھ بھی کیا ہے، ٹھیک ہے، اپنی جگہ پر اچھا ہے۔ INTERESTING ہے...... لیکن اب وہ کربلا کے سمبل کو بہت طریقے سے پیش کرتے ہیں مختلف لوگ مختلف طرح سے کربلا جو ہے وہ گویا EXTREME ANGUISH اور دکھ کی جو انتہا ہو جاتی ہے انسانی تجربے میں، اس کا وہ نچوڑ ہے۔ ٹھیک ہے، دشت کربلا، حسینؓ کی پیاس، بچوں کا قتل، اہل بیت کے جلے ہوئے خیمے...... اس کی پوری ایک IMAGERY ہے۔ وہ ایک انتہا سے زیادہ پوری انسانی زندگی کی جو TRAGEDIES ہیں THAT SYMBOLISM SUMS IT UP تو ٹھیک ہے؟ تو اس کے لحاظ سے ظاہر ہے، بہت بڑی چیز ہے وہ۔ اور وہ سمبل ایسا ہی ہے جیسے رامائن

کے بن باس میں۔ بن باس اب ایک محاورہ ہو گیا ہے، ہے ناں؟ اردو میں یہ کہتے ہیں کہ اگر پانی نل میں نہیں آ رہا ہے گھر میں تو کہا جاتا ہے کہ بھئی آج تو کربلا ہوگی۔ تو یہ تو ہماری COLLECTIVE PSYCHE میں شامل ہے۔ اب اس کو انھوں نے مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے، مختلف طریقوں سے اپروچ کیا ہے، ITS VERY INTERESTING، بہت کم لوگوں نے اس کو موضوع کے طور پر کیا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے۔ افسوس کہ وہ کہیں چھپا نہیں، غیر مسلم ادیب تھے جنھوں نے کربلا پر پورا PLAY لکھا تھا۔ مشہور رائٹر تھے مجھے اب ان کا نام یاد نہیں آ رہا، انھوں نے آ کر میرے والد کو وہ پلے سنایا تھا جو کربلا پر تھا۔ پتا نہیں اس کا کیا ہوا۔

آصف فرخی:

آپ کے والد کے ہم عصر ہوں گے۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں، اس زمانے کے رائٹر تھے۔ بھئی کربلا تو اب NATIONAL COLLECTIVE PSYCHE کا حصہ ہے۔

آصف فرخی:

وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن وہ کربلا ہو یا رامائن ہو یا مہابھارت ہو، اہم چیز تو یہ ہے کہ MYTH کو استعمال کر کے لکھنے والے نے بنایا کیا؟ صرف اس کی RE-TELLING سے تو بات نہیں بنتی، اس میں کچھ اور بھی چاہیے۔ انتظار صاحب کی بعض کہانیوں میں MYTH کی بازگوئی کا عنصر حاوی رہتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ہوسکتا ہے بازگوئی ہو لیکن کہیں کہیں پر تو یہ IT ALL SOUNDS FUNNY۔ اب یہ جو قافلے آتے ہیں پاکستان میں جو ایک بہت بڑا COLLECTIVE تجربہ تھا، واقعی وہ ہجرت کا تجربہ تھا، یعنی لاکھوں کی تعداد میں پاکستان میں انڈیا سے آئے REFUGEES۔ اس کو انھوں نے ایک شکل دی، ایک LITERARY تجربے کے طور پر ایک HUMAN EXPERIENCE

کے طور پر پیش کیا، وہ اپنی جگہ پر اہم تھا۔ ہندستان میں جو ہندو اور سکھ یہاں سے گئے ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے اس طرح لکھا ہے۔ آپ کچھ پڑھتے ہیں اگر ہندی وغیرہ کے ترجمے، اس طرح کی چیز وہاں پر ہوئی ہے، یہ مجھے نہیں معلوم مگر وہاں پر اس کا تنا بڑا IMPACT نہیں ہے، جہاں تک میں سمجھتی ہوں۔ حالانکہ وہاں پر بھی اتنا بڑا EXODUS ہوا، جتنے یہاں سے وہاں گئے۔ اسی طرح وہاں سے یہاں آئے، لیکن اس بات کو مسلمانوں نے اس ہجرت سے CONNECT کیا جو ایک اسلامی CONCEPT ہے۔ اس میں کچھ مذہبی ثواب بھی ہے، سنت رسول ہے، مطلب اس کا ایک مذہبی CONNOTATION ہے نا بہت بڑا؟

آصف فرخی:

جی ہاں، بالکل ہے۔

قرۃ العین حیدر:

وہاں والوں کے لیے ہجرت کے CONCEPT کی میرے خیال میں کوئی مذہبی اہمیت نہیں ہے۔ تو وہ ہوتو ہو گیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ذاتی، انفرادی، جو تجربے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں سندھی ہندوؤں نے ضرور لکھا ہوگا، سندھ سے جو ہندو گئے ہیں انھوں نے بہت لکھا ہوگا اور جو بنگال سے گئے ہیں، انھوں نے بہت لکھا۔ بنگالیوں نے لکھا۔ میرے خیال میں بنگالیوں نے خوب لکھا ہے اور بنگال کے ہندو پر جو بیتی ایسٹ پاکستان میں، اس کے بارے میں بنگال میں لکھا گیا۔ ہم لوگوں کے ہاں افسوس یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ یک طرفہ ہجرت ہوئی یا یک طرفہ TRAGEDY تھی اور یہ بالکل نہیں سوچتے کہ یہ TRAGEDY ان کے لیے بھی اتنی ہی بڑی تھی۔ اس کو لوگوں نے بالکل، یہاں پر کم از کم، بالکل نظر انداز کر دیا گیا کہ یہ ہجرت کی ٹریجڈی اور یہ KILLINGS کے لیے بھی اتنا ہی اہم، اتنا ہی خوف ناک اجتماعی تجربہ تھا یا INDIVIDUAL تجربہ تھا، اس کے بارے میں ہم لوگ بالکل نہیں سوچتے جو سندھی یہاں سے گئے وہ تو اب تک سندھ کو اپنا وطن سمجھتے ہیں۔ ہاں ابھی میں پڑھ رہی تھی ''ذکر ایاز'' اس میں ہے کہ سندھی کے بہت بڑے شاعر تھے شیخ ایاز انھوں نے لکھا اپنے کسی دوست، کوئی ہندو دوست تھا ان کا اس کے بارے

میں، شیام جس کا نام تھا......

آصف فرخی:

نارائن شیام جو سندھی کے شاعر تھے۔

قرۃ العین حیدر:

تو انھوں نے لکھا کہ نارائن شیام میں تمھیں کیسے گولی ماروں:؟ تو میں نے پڑھا کہ یہاں اس پر بڑا اعتراض کیا گیا کہ کیوں لکھا۔ تو جب اس طرح پڑھے لکھے لوگ بھی اس تجربے کو یا نفرتوں کے اس سلسلے کو یا اس پورے سلسلے کے بارے میں اس طرح سوچیں اور جب آپ اس سلسلے کو POSITIVE انسانی رویے سے دیکھیں YOU ARE CONSIDERED ANTI-NATIONALIST یہ بڑی عجیب بات ہے۔ اب وہ ٹھیک ہے کہ جنگ کے زمانے میں کوئی انگریز کسی جرمن نازسی کی تعریف کرتا تو اس کو سمجھا جاتا تھا کہ غدار ہے لیکن یہاں کوئی اس طرح کی جنگ نہیں ہوئی۔ یہاں پر تو ایک پوری PSYCHE بن گئی ہے CONFRONTATION کی، ایک پوری نفسیات ہے۔ تو یہ بات میں سمجھتی ہوں اچھی نہیں ہے PSYCHE کے لیے یعنی انسانیت شخصیت کی NORMAL GROWTH کے لیے یہ کہ آپ پہلے سے ایک STAND POINT بنا کر شروع کردیں کہ ہمیں یوں لکھنا ہے، ایک اسٹینڈ بنالیں۔ ایک VIEW-POINT آپ بنالیں اور اس کے بعد آپ کے جو سارے رویے ہیں دوسرے انسانوں کے بارے میں، ان کو اپنے STAND POINT سے ترتیب دیں LINK-UP کریں تو پھر وہ بڑی یک طرفہ کارروائی ہو جاتی ہے۔ آپ کا ذہن کھلا نہیں رہتا۔

آصف فرخی:

مگر ہمارے ہاں اس طرح کی یک طرفہ کارروائی بہت ہوئی ہے اور ادبی تنقید کے نام پر ہوئی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں، تنقید میں بھی ہوئی ہے اور ویسے بھی ON THE WHOLE ہم لوگوں کے ہاں

ایک CONFRONTATION...... یہاں پر CONFROTATION کا رویہ یا CO-EXISTENCE کا نہیں ہے۔ میرا پورا مسئلہ ہے کہ میں...... یہ بڑا کلیشے لگے گا بہت، بہت HACKNEYED CLICHE، لیکن نہیں۔ کلیشے ہوتا ہی HACKNEYED ہے۔ لیکن میرا مطلب ہے HACKNEYED ترا! کہ آپ جو ہیں...... WHY CAN'T YOU EXIST PEACEFULLY WITH OTHER PEOPLE? آپ کیوں نہیں کوشش کرتے کہ آپ دوسرے آدمی کا بھی پوائنٹ آف ویو دیکھیں، سمجھنے کی کوشش کریں، کیوں نہیں کر سکتے؟ اور اگر نہیں کر سکتے تو LEAVE THEM ALONE آپ ان سے بھڑیں کیوں؟ یہ چیز جو ہے، یہ بڑا بنیادی امن پرستی کا رویہ ہے، بہت بنیادی۔ اس میں کوئی ایسی لمبی چوڑی بات نہیں ہے۔ بڑا اچھا اس نے کہا تھا، بے چارے ابن انشا مرحوم نے کہ مجھے کسی حکیم کے پاس جا کر نسخہ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ امن اچھی چیز ہے (ہنسی)۔ یہ تو ظاہر بات ہے۔ بڑی اچھی بات کہی تھی اس نے کہ صاحب آپ کہیں کہ لڑائی وڑائی اور نفرت بُری بات ہے۔ یہ تو ظاہر ہے اس میں آپ ایسی کیا خاص بات کہہ رہے ہیں۔ یہ تو UNDERSTOOD ہے۔

آصف فرخی:

یہ بات آپ دونوں ملکوں کے سیاق و سباق میں کہہ رہی ہیں۔ پچھلے دنوں آزادی کے پچاس برس کا جو شور اٹھا تو اس میں پارٹیشن لٹریچر اور اس وقت کی جو فضا تھی، پھر اس کے بعد جو CONFRONTATION کی صورت بنی بلکہ میں تو کہوں گا کہ دونوں طرف کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی، تو ان چیزوں کو EXPLORE کیا گیا لیکن یہ سوال ایسے ہیں کہ اب تک قائم ہیں، یہ ISSUES ابھی تک کھلے ہوئے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

وہ اس لیے کھلے ہوئے ہیں کہ ہم لوگ...... WE ARE LIVING WITH THEM اور ہم لوگ خود نہیں سوچتے بلکہ جو رویے ہمارے سیاست داں بنا گئے ہیں، ہم ان کو FOLLOW کر رہے ہیں۔ یہ مسئلہ ہو گیا ہے تا کہ ہم یہ نہیں سوچتے، ہم اپنی طرف سے خود نہیں سوچتے۔ ہم نے

جو رویے INHERIT کیے ہیں یا جو رویے ہماری سوسائٹی نے ہم پر لادے ہیں، ہم ان کو FOLLOW کرتے ہیں۔ اگر آپ الگ سے سوچیں تو یا تو آپ کو ECCENTRIC کہا جائے گا یا آپ کو ANTI-NATIONAL یا آپ کو کہا جائے گا کہ YOU ARE TRYING TO BE DIFFERENT TO ATTRACT ATTENTION لیکن کوئی یہ نہیں سوچتا کہ آپ بھیڑ چال سے الگ بھی تو کچھ سوچ سکتے ہیں، کوئی نہیں دیکھتا۔

آصف فرخی:

افسوس کی بات یہ ہے کہ ادیب بھی نہیں سوچتے۔

قرۃ العین حیدر:

ادیب بھی نہیں سوچتے، میں ادیبوں ہی کی بات کر رہی ہوں۔ میں عوام کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ عوام تو ہیں بے چارے، جدھر موڑ دیے گا ادھر مڑ جائیں گے۔ ادیب نہیں سوچتے۔

آصف فرخی:

لیکن ہمارے لیڈروں کے ساتھ بھی مشکل آئی یعنی وہ جن کے پیچھے عوام چلتے آئے ہیں اور زیادہ تر ادیب بھی۔ جیسا کہ آپ نے "آخرِ شب کے ہم سفر" میں دکھایا ہے کہ جب لیڈر اپنے نظریات سے DISILLUSIONMENT کا شکار ہوئے تو وہ بہت زیادہ مادہ پرست ہو گئے۔ یہ عجیب و غریب PHENOMENON ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یہ عجیب و غریب PHENOMENON اس لیے ہے کہ ہم لوگ بنیادی طور پر تہی دست سوسائٹی رہے ہیں۔ DEPRIVED سوسائٹی۔ ہمارے ہاں عام طور پر جو ہمارا LEVEL تھا وہ غربت کا تھا۔ اور اس میں جب آزادی کے بعد فراوانی آئی، پیسہ آیا تو ظاہر ہے کہ آپ دیکھیے کہ ہمارے ہاں، جن لوگوں کے پاس بھی پیسہ نہیں تھا، ان لوگوں کے پاس بھی آ گیا پیسہ۔ بہت سے لوگ تھے جن کے پاس پہلے بھی نہیں تھا، اب بھی نہیں ہے، جو MAJORITY ہے۔ لیکن جن کے پاس نہیں تھا اور ان کے پاس آ گیا، THEY WANTED TO RETAIN THAT

PROPERTYاور اس خوشحالی کو رکھنے کے لیے اپنے پاس STATUS QUO ضروری تھا، لہٰذا اگر آپ اس سماج کو بدلنے کی بات کرتے ہیں تو ان کو ڈر لگتا ہے کہ یہ خوشحالی تو ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ کیونکہ عام طور پر ہمارے ہاں، سوائے......آپ تو آزادی کے بہت بعد کی پیدائش ہیں، آزادی سے پہلے ایک محدود طبقہ تھا مڈل کلاس یا اپر مڈل کلاس جس کے پاس وہ ساری چیزیں تھیں جو آج آپ کے عام طور پر لوئر مڈل کلاس اور ورکنگ کلاس میں بھی نظر آتی ہیں کہ ان کے پاس ہیں۔ کیونکہ ایک تو معیار زندگی بڑھ گیا ہے۔ جھگی جھونپڑی والے کے پاس بھی ٹیلی ویژن آ گیا ہے، ٹھیک ہے؟ بچے اسکول جا رہے ہیں۔ IT IS A REVOLUTION OF RISING EXPECTATIONSاور یہ جو ہے وہ...... NOT AN ACTUAL REVOLUTION, BUT A REVOLUTION OF RISING EXPECTATIONS یعنی کہ آپ کا جو غریب کاری گر ہے وہ بھی یہ سوچتا ہے کہ میرا لڑکا کالج میں پڑھ لے اور اچھا، وہ پڑھتا ہے۔ وہ ولایت بھی جا سکتا ہے اسکالرشپ پر۔ پرانا نظام تہہ و بالا ہو گیا سارا سسٹم۔ تو اس سے پھر......اس میں جو DEPRIVED طبقے تھے ظاہر ہے ان کے پاس پیسہ آ گیا۔ بہتوں کے پاس آ گیا۔ اب آپ دیکھیے یہاں پر، ہندوستان میں دیکھیے، پاکستان میں دیکھیے، یہ جو بے انتہا، بے شمار مکانات، کوٹھیاں، دو منزلہ گھر بنے ہیں، یہ کیسے بن گئے؟ پہلے یہ کلاس بہت محدود تھی۔ اول تو آبادی اتنی نہیں بڑھی تھی اور آبادی کے ساتھ وسائل اتنے نہیں آئے تھے، اتنا پیسہ نہیں آیا تھا، اتنے نئے ذریعے نہیں آئے تھے آمدنی کے......اب میں لکھنؤ کی بات کرتی ہوں جو میں نے اپنے بچپن کا دیکھا ہے یا لڑکپن کا اور اس کے بعد کا کہ ایک محدود طبقہ تھا جو سول لائنز میں رہتا تھا۔ ایک محدود طبقہ تھا جو شہر کے اندر رہتا تھا لیکن اچھے مکانوں میں رہتا تھا۔ اور زیادہ تر طبقہ غریبوں کا، جو کاری گر تھے یا خانگی ملازم یا دکان دار تھے۔ وہ گویا آپ کی لوئر کلاسز کہلاتے تھے۔ اور وہ اپنی جگہ پر ایک بہت بڑا......ایک طبقے سے دوسرے طبقے میں آپ MOBILE نہیں تھے۔ مطلب یہ اس وقت ممکن نہیں تھا کہ جو ڈرائیور ہے میرا اس کا لڑکا تعلیم حاصل کر کے بی اے۔ ایم اے کر کے یہاں کرسی پر آ کر بیٹھ جائے گا۔ نہیں بیٹھ سکتا تھا وہ یہاں آ کر۔ وہ ڈرائیور کا لڑکا ہے تو ڈرائیور ہی

بنے گا یا کلینر بنے گا یا خانساماں بن جائے۔ آزادی کے بعد یہ ہوا کہ یہ بالکل تفریق...... اس کا BREAK DOWN ہو گیا جو بہت اچھی بات تھی۔ اس لیے کہ دو آبادیوں کا تبادلہ ہوا اور جو نئے وسائل، نئے ذریعے پیدا ہوئے...... بھئی، یہ بہت بڑا انقلاب ہے۔ یہ SILENT REVOLUTION ہے۔ یعنی وہ طبقہ جو تھا، جو غریب یا کاری گر طبقہ تھا، ان کو یہاں آ کر اور انڈیا میں بھی نئے مواقع ملے، پڑھنا شروع کیا، پڑھا لکھا...... مطلب یہ کہ پورا ایک نیا سماج، ایک نیا سسٹم بن گیا۔ اچھا، مگر اس میں بھی پھر یہ ہوا کہ جو بالکل نیچے تھے وہ تھوڑا سا اوپر آ گئے، لیکن اس کے ساتھ ایک NOUVEAU RICH کلاس پیدا ہو گیا اور اس NOUVEAU RICH کلاس نے پرانے جاگیردار طبقے کو REPLACE کر دیا۔ تو وہ آپ کا جو سسٹم تھا اس میں زمیں دار کے بجائے نیا سرمایہ دار اس کی جگہ آ گیا اور EXPLOITATION کا لیول وہی رہا یا پھر اور بڑھ گیا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ POSITIVE بات ہوئی...... ITS ALL SO COMPLICATED یہ ہوا کہ جو کاری گر طبقہ تھا اس میں سے لڑکوں نے تعلیم حاصل کی تو وہ نئی مڈل کلاس بن گئے جو نئی مڈل کلاس تھی انھوں نے اور مواقع حاصل کیے تو وہ اپر کلاس میں چلے گئے۔ ایک نیا عنصر ہمارے ہاں آیا، جو پہلے تھا ہی نہیں، وہ بلیک منی کا تھا۔ اس بلیک منی نے تو آپ کی کائنات تہہ و بالا کر دی یعنی اب آپ دیکھیے کہ جو STANDARD OF LIVING اس وقت لوگوں کا ہے، یہ ہمارے زمانے میں ہمارے زمیں داروں کا بھی اتنا نہیں تھا۔ بالکل نہیں تھا، یعنی ایک زمیں دار یا ایک نواب، جسے ہم نواب کہتے ہیں مطلب چھوٹے LAND-OWNER کا LAVEL یعنی والیان ریاست نہیں بلکہ ان سے کم، ان کے ہاں دو موٹریں ہوں گی، دو تین بگھیاں ہوں گی، ایک بڑا سا گھر ہوگا، دس بارہ ملازم ہوں گے، THEY WERE SUPPOSED TO BE UPPER-CLASS اب آپ کا اس لیول کا ایک AVERAGE سرمایہ دار اس سے بہتر لیول پر رہتا ہے۔ اس کے پاس پانچ چھ موٹریں ہوتی ہیں۔ اس کے ہر لڑکے کے پاس ایک گاڑی ہوتی ہے۔ ہے نا؟ تو وہ جو اپر کلاس تھی جس کا تعلق زمین دار طبقے سے تھا جو اپر کلاس سول سرونٹ تھا۔ وہ تو کہیں بہت پیچھے رہ گیا۔ آپ کے آج کل کے جو معیار زندگی ہیں، اس میں بہت پیچھے رہ گیا بے چارہ، تو اتنا بڑا انقلاب ہے جو اس

جنریشن کے بچوں نے، جو اس کلاس کے بچے ہیں جو کہ باہر جاتے ہیں اپنے HOLIDAYS کے لیے، سوئٹزرلینڈ جاتے ہیں۔ پہلے اس کے EQUIVALENT کلاس کے بچے زیادہ سے زیادہ مسوری چلے جاتے تھے۔ اب جو بچے ہیں اس نئی PROSPEROUS کلاس کے وہ عام طور پر باہر پڑھتے ہیں۔ وہ انڈیا یا پاکستان میں نہیں پڑھتے۔ تو اتنا بڑا یہ انقلاب ہے کہ اس نے نفسیات بدل دی ہے لوگوں کی۔ ٹھیک ہے؟

آصف فرخی:

جی ہاں۔ بالکل۔

قرۃ العین حیدر:

نفسیات بدل دی ہے۔ اچھا، اس کی عکاسی ادب میں نہیں ہوئی۔ ادب میں اس طرح نہیں ہوئی۔ بڑی STEREO TYPE قسم کی ہوئی ہے کہ آپ نے یہ جو نئے امیر ہیں، یہ نئے دولت مندان کا مذاق اڑا لیا۔ اس طرح کرشن چندر کا ایک بے انتہا مبالغہ آمیز افسانہ تھا کہ فلاں صاحب کے گھر میں چھ سوئمنگ پول ہیں اور پندرہ کتے ہیں اور بیس گاڑیاں ہیں، اس قسم کا کچھ تھا، WHICH IS NOT TRUE ضرور نہیں کہ کسی کے گھر میں یہ سب ہو، تو وہ ان لوگوں کی ایک قسم کی غیر حقیقی عکاسی تھی، جو آپ نے پیش بھی کیا ادب میں تو یہ سب کچھ REALISTIC نہیں تھا۔

آصف فرخی:

REALISTIC بھی نہیں تھا اور اس پوری صورت حال کا زیادہ تجزیہ نہیں کیا گیا۔

قرۃ العین حیدر:

تجزیہ نہیں کیا گیا اور ادب سے اس طبقے کا کوئی تعلق نہیں ہے، کوئی رابطہ نہیں ہے۔ وہ پڑھتے ہی نہیں۔ اب میں نے یہاں دیکھا ہے، بہت سے گھروں میں دیکھا ہے، یہاں پر بھی اور وہاں بھی، بہت شاندار گھر ہیں مگر کتابیں نہیں ہیں۔ NO BOOKS AT ALL۔ کیوں نہیں ہیں؟ ایک تو یہ WORLD WIDE ہے، ساری دنیا میں ہو رہا ہے کہ آپ کا جو تعلق تھا، رابطہ تھا چھپے ہوئے لفظ سے، وہ ختم ہو گیا ہے۔ آپ کا سابقہ ہو گیا ہے اب امیج سے۔ الیکٹرونک میڈیا سے،

ریڈیو کی آواز سے اور ٹی وی کی امیج سے۔ تو پڑھنے کا جو سلسلہ تھا کہ بچے پڑھتے تھے، وہ ختم ہو گیا۔ اب یہ آپ لے کر آئے ہیں ''پھول'' تو ''پھول'' اخبار ہر ہفتے آتا تھا اور بچے بہت ذوق وشوق سے اس کو پڑھتے تھے۔ اس میں لکھتے تھے۔ بمبئی سے ایک رسالہ نکلتا تھا ''پشپا'' انگریزی میں۔ اس زمانے میں وہ بڑا مشہور تھا بچوں کا، مجھے یاد ہے کہ میرے ایک ماموں نے میرے نام جاری کر دیا تھا۔ وہ ہر مہینے آتا تھا، تو میرے لیے ''پشپا'' آتا تھا جس دن بمبئی سے، وہ میرے لیے عید ہوتی تھی۔ آل انڈیا چلڈرنز ایسوسی ایشن ایک چیز تھی جس کا ہیڈ کوارٹر سکھر میں تھا۔ سندھ میں، بالکن جی باری، اس کا نام بھی سندھی تھا، بالکن جی باری۔ اس کا ہیڈ کوارٹر یہاں تھا اور اس کا یہ رسالہ نکلتا تھا ''پشپا'' بمبئی سے۔ تو پورا ایک نیٹ ورک تھا بچوں کا، انگریزی داں بچوں کا جو اس میں لکھتے تھے۔ اس میں مسلمان بھی تھے، ہندو بھی تھے، سکھ بھی تھے، عیسائی اور بھی تھے۔ اچھا پھر ''پھول'' تو خیر تھا ہی، ''پھول'' تھا ''نبات'' تھا تو یہ رسالے تھے اور اس طرح پانچ چھ سال کی عمر سے بچے کا رابطہ چھپے ہوئے لفظ سے بن جاتا تھا۔

آصف فرخی:

یہ رسالے تو لگتا ہے کسی پرانے زمانے کی بات ہیں۔ وہ رابطہ ختم ہو گیا۔

قرۃ العین حیدر:

وہ رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ اب VISUAL ہو گیا ہے۔ وہ ہر چیز VISUAL صورت میں دیکھتے ہیں۔ اس سے میں سمجھتی ہوں IMAGINATION جو تھا بچوں کا، وہ ختم ہو گیا۔

آصف فرخی:

یہ اصل نقصان ہوا ہے چھپے ہوئے لفظ سے بچھڑنے کا۔ یہ بہت بڑا فرق پڑا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

میرے خیال میں۔

آصف فرخی:

IMAGINATION بھی ختم ہو گیا تو پھر ان کی MEMORY کیسی رہے گی؟ میموری تو

آپ کے لیے خاص طور پر اہم ہے......ایک انتہائی اہم ذہنی عمل ہے بلکہ آپ سے اسی حوالے سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کراچی میں جتنا عرصہ رہیں تو کیا آپ کو یہ شہر اب بھی یاد آتا ہے اور اس وقت کی کیا باتیں یاد آتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

بھئی اس وقت کی باتیں تو مجھے یہ یاد آتی ہیں کہ زندگی زیادہ آسان تھی، STATUS کا لوگوں کو سودا نہیں ہوا تھا۔ یہ چیز مجھے سب سے زیادہ یاد آتی ہے۔ اور یہ تھا کہ ہمارے رشتے دار تھے جو سب ہندوستان کے مختلف حصوں سے آ کر یہیں بس گئے تھے۔ کچھ پیر الٰہی بخش کالونی میں سیٹل ہوئے، کچھ لارنس روڈ پر سیٹل ہوئے جہاں جہاں جس کو مکان ملا وہاں رہا۔ کچھ کو بڑی کوٹھیاں ملیں۔ لیکن سب ہر ہفتے ایک دوسرے سے ملتے تھے اور اسٹیٹس کا تو خیر ویسے بھی خاندانوں میں نہیں ہوتا ہے یہاں بھی نہیں تھا۔ لیکن کوئی اتنا وہ نہیں تھا، یہ احساس نہیں تھا کہ صاحب، ہم پی آئی بی کالونی میں رہتے ہیں تو یہ کوئی INFRA-DIG بات ہے۔ میرا خیال ہے اب لوگوں میں شاید یہ زیادہ آ گیا ہے۔

آصف فرخی:

یہ تو ہوا خاندان۔ اس کے علاوہ آپ دفتر میں بھی کام کرتی رہیں......

قرۃ العین حیدر:

دفتر کا بڑا FRIENDLY ماحول تھا۔ اور بہت ہی......ایک بڑی دلچسپ بات یہ تھی اور بڑی تعجب خیز بات تھی کہ مسلم سماج میں خواتین نے کبھی اس طرح حصہ نہیں لیا کہ ساتھ دفتروں میں کام کریں، لیکن میں واحد خاتون تھی جو وہاں پر کام کر رہی تھی۔ ایک مجھ سے پہلے تھیں جن کی جگہ پر میں وہاں آئی تھی، مسرت جہاں تیموری۔ وہ امریکہ چلی گئی تھیں۔ پھر وہ واپس آ گئیں، لیکن وہاں کوئی کسی قسم کا احساس نہیں تھا کہ ہم مردوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ وہ نہایت مہذب، نہایت شائستہ لوگ تھے......کچھ لگتا ہی نہیں تھا کہ فرق ہے اور یہ تعجب خیز بات ہے کیونکہ ان میں زیادہ تر لوگ وہ تھے جو کہ ایک SEGREGATED معاشرے سے آئے تھے۔

آصف فرخی:

کراچی کے دنوں کا کوئی ایسا خاص واقعہ جو آپ کو خاص طور پر HAUNT کرتا ہو؟

قرۃ العین حیدر:

مجھے اب تک اچھی طرح یاد ہے اور میں نے لکھا بھی ہے کہ میری نظروں کے سامنے ایک لڑکے کو مارا گیا۔ دسمبر 1948 کی بات ہے۔ گرینڈ ہوٹل میں ہم رہ رہے تھے، اوپر کی منزل پر ہمارا فلیٹ تھا۔ میری بھابھی اور میں، ہم لوگ اوپر کھڑے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ایک سندھی ہندو لڑکا جو نیچے کے کسی فلیٹ میں رہتا تھا صبح کے وقت تیار ہو کر کالج جانے کے لیے نکلا۔ ڈی جے کالج میں پڑھتا ہوگا۔ وہ باہر نکلا ہی ہوگا کہ لوگ جمع ہو گئے، ایک دم سے معلوم نہیں کہاں سے نکل کر آ گئے۔ لاٹھیاں لے کر آئے تھے اور اس کو مارنا شروع کر دیا۔ THEY BEAT HIM TO DEATH وہ قتل نہیں تھا۔ وہ MURDER ہوتا ہے کہ آپ کسی کو شوٹ کر دیں۔ HE WAS BEATEN TO DEATH وہ PULP بن گیا۔ مجھے اب تک یاد ہے اس نے چارخانے کا کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے ہاتھوں میں جو کتابیں تھیں وہ پرزہ پرزہ ہو کر بکھر گئیں۔ کالج جا رہا تھا۔ وہ مجھے اب تک یاد ہے۔

آصف فرخی:

کراچی کے دنوں کا احوال لکھتے ہوئے آپ نے اپنے دوستوں کے گروپ کا ذکر کیا ہے جو انگریزی میں لکھتے تھے......

قرۃ العین حیدر:

بھئی وہ ایک بہت اچھا گروپ تھا۔ ایک فرائیڈے کلب ہوا کرتا تھا۔ یہاں پر ایک صاحب تھے ستو قریشی، جن کے والد ڈاکٹر قریشی علی گڑھ میں میڈیکل آفیسر تھے، علی گڑھ یونیورسٹی میں۔ ہمارے والدین کی ان سے اس وقت سے دوستی تھی۔ ان کی اولاد یہاں پر تھی۔ ایک سے ایک ذہین لڑکا تھا۔ ایک ستو قریشی تھے، وہ ایئر کاٹیج میں رہتے تھے۔ وہ ایئر فورس میں تھے۔ ایک بیٹا تھا، عمر قریشی، کرکٹ کا مشہور COMMENTATOR ایک تھا انور قریشی، وہ میرا

آپ کے لیے خاص طور پر اہم ہے......ایک انتہائی اہم ذہنی عمل ہے بلکہ آپ سے اسی حوالے سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کراچی میں جتنا عرصہ رہیں تو کیا آپ کو یہ شہر اب بھی یاد آتا ہے اور اس وقت کی کیا باتیں یاد آتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

بھئی اس وقت کی باتیں تو مجھے یہ یاد آتی ہیں کہ زندگی زیادہ آسان تھی، STATUS کا لوگوں کو سودا نہیں ہوا تھا۔ یہ چیز مجھے سب سے زیادہ یاد آتی ہے۔ اور یہ تھا کہ ہمارے رشتے دار تھے جو سب ہندوستان کے مختلف حصوں سے آ کر یہیں بس گئے تھے۔ کچھ پیر الٰہی بخش کالونی میں سیٹل ہوئے، کچھ لارنس روڈ پر سیٹل ہوئے جہاں جہاں جس کو مکان ملا وہاں رہا۔ کچھ کو بڑی کوٹھیاں ملیں۔ لیکن سب ہر ہفتے ایک دوسرے سے ملتے تھے اور اسٹیٹس کا تو خیر ویسے بھی خاندانوں میں نہیں ہوتا ہے یہاں بھی نہیں تھا۔ لیکن کوئی اتنا وہ نہیں تھا، یہ احساس نہیں تھا کہ صاحب، ہم پی آئی بی کالونی میں رہتے ہیں تو یہ کوئی INFRA-DIG بات ہے۔ میرا خیال ہے اب لوگوں میں شاید یہ زیادہ آ گیا ہے۔

آصف فرخی:

یہ تو ہوا خاندان۔ اس کے علاوہ آپ دفتر میں بھی کام کرتی رہیں......

قرۃ العین حیدر:

دفتر کا بڑا FRIENDLY ماحول تھا۔ اور بہت ہی......ایک بڑی دلچسپ بات یہ تھی اور بڑی تعجب خیز بات تھی کہ مسلم سماج میں خواتین نے کبھی اس طرح حصہ نہیں لیا کہ ساتھ دفتروں میں کام کریں، لیکن میں واحد خاتون تھی جو وہاں پر کام کر رہی تھی۔ ایک مجھ سے پہلے تھیں جن کی جگہ پر میں وہاں آئی تھی، مسرت جہاں تیموری۔ وہ امریکہ چلی گئی تھیں۔ پھر وہ واپس آ گئیں، لیکن وہاں کوئی کسی قسم کا احساس نہیں تھا کہ ہم مردوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ وہ نہایت مہذب، نہایت شائستہ لوگ تھے......کچھ لگتا ہی نہیں تھا کہ فرق ہے اور یہ تعجب خیز بات ہے کیونکہ ان میں زیادہ تر لوگ وہ تھے جو کہ ایک SEGREGATED معاشرے سے آئے تھے۔

آصف فرخی:

کراچی کے دنوں کا کوئی ایسا خاص واقعہ جو آپ کو خاص طور پر HAUNT کرتا ہو؟

قرۃ العین حیدر:

مجھے اب تک اچھی طرح یاد ہے اور میں نے لکھا بھی ہے کہ میری نظروں کے سامنے ایک لڑکے کو مارا گیا۔ دسمبر 1948 کی بات ہے۔ گرینڈ ہوٹل میں ہم رہ رہے تھے، اوپر کی منزل پر ہمارا فلیٹ تھا۔ میری بھابھی اور میں، ہم لوگ اوپر کھڑے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ایک سندھی ہندو لڑکا جو نیچے کے کسی فلیٹ میں رہتا تھا صبح کے وقت تیار ہو کر کالج جانے کے لیے نکلا۔ ڈی جے کالج میں پڑھتا ہوگا۔ وہ باہر نکلا ہی ہوگا کہ لوگ جمع ہو گئے، ایک دم سے معلوم نہیں کہاں سے نکل کر آ گئے۔ لاٹھیاں لے کر آئے تھے اور اس کو مارنا شروع کر دیا۔ THEY BEAT HIM TO DEATH وہ قتل نہیں تھا۔ وہ MURDER ہوتا ہے کہ آپ کسی کو شوٹ کر دیں۔ HE WAS BEATEN TO DEATH وہ PULP بن گیا۔ مجھے اب تک یاد ہے اس نے چارخانے کا کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے ہاتھوں میں جو کتابیں تھیں وہ پرزہ پرزہ ہو کر بکھر گئیں۔ کالج جا رہا تھا۔ وہ مجھے اب تک یاد ہے۔

آصف فرخی:

کراچی کے دنوں کا احوال لکھتے ہوئے آپ نے اپنے دوستوں کے گروپ کا ذکر کیا ہے جو انگریزی میں لکھتے تھے......

قرۃ العین حیدر:

بھئی وہ ایک بہت اچھا گروپ تھا۔ ایک فرائیڈے کلب ہوا کرتا تھا۔ یہاں پر ایک صاحب تھے ستو قریشی، جن کے والد ڈاکٹر قریشی علی گڑھ میں میڈیکل آفیسر تھے، علی گڑھ یونیورسٹی میں۔ ہمارے والدین کی ان سے اس وقت سے دوستی تھی۔ ان کی اولاد یہاں پر تھی۔ ایک سے ایک ذہین لڑکا تھا۔ ایک ستو قریشی تھے، وہ ایئر کانج میں رہتے تھے۔ وہ ایئر فورس میں تھے۔ ایک بیٹا تھا، عمر قریشی، کرکٹ کا مشہور COMMENTATOR ایک تھا انور قریشی، وہ میرا

کولیگ تھا۔ بے حد ذہین تھا BRILLIANT CONVERSATIONALIST، اس نے شادی کی تھی ایک پارسی لڑکی سے، ماکودھنجی بائے سے۔

آصف فرخی:

جو ماکی قریشی کے نام سے مشہور ہوئیں، انگریزی کی شاعرہ......

قرۃ العین حیدر:

بڑی اچھی شاعرہ، بہت اچھی شاعرہ...... پھر ایک بوبی فاروقی تھا۔ وہ بڑا اچھا لکھتا تھا۔ اس پر اس وقت اسلام کا جوش طاری ہوا تھا۔ اس زمانے میں اس نے ISLAMIC CONSTITUTION پر ایک کتاب لکھی تھی۔ ان کی والدہ ہندو تھیں کے پی ایس کے مینن کی بہن اور ان کے والد جنرل فاروقی آئی ایم ایس کے رکن تھے اور پھر یہاں پاکستان آرمی کے میڈیکل چیف تھے۔ تو ایک بوبی فاروقی تھا۔ بوبی نے شادی کی تھی ایک سندھی لڑکی سے جس کی ماں انگریز تھیں۔ پھر اس کے علاوہ یونس سعید تھا، جس نے وہ رسالہ VISION نکالا تھا۔ یونس سعید، بوبی فاروقی، کمال احمد فاروقی...... ایک صاحب تھے نصیر احمد فاروقی...... پتا نہیں کہاں ہیں آج کل، سنا ہے برازیل میں رہتے ہیں۔ پھر ایک صاحب تھے...... پھر کولیگ بڑے اچھے تھے، اللہ بخش راجپوت، ناصر شمسی بڑے اچھے آرٹسٹ۔ پھر مس تیموری تھیں جو اب بھی یہاں ہیں۔ یہ ہم لوگوں کا گروپ تھا۔ ہم لوگ دوپہر کو جاتے تھے کافی ہاؤس، جو یہاں تھا بندر روڈ پر۔ وہاں پر مل کر کھانا کھاتے تھے۔ بہت اچھا گروپ تھا۔ بڑے اچھے DISCUSSION ہوتے تھے، اس وقت بلکہ بڑی اچھی ایک LIBERAL فضا تھی۔ میرے خیال میں یہ فضا ختم ہوئی ہے، مارشل لا کے ساتھ۔

آصف فرخی:

یہ جو آپ لوگوں کا SMART SET تھا اور یہ جو اس شہر کی فضا تھی، وہ اب آپ کی تحریر میں پڑھنے کو ملتی ہے، ایک کہانی کی طرح۔ یونس سعید کے افسانوں کا مجموعہ اور ویژن کی بہترین تحریروں کا انتخاب میں نے فٹ پاتھ پر سے پرانی کتابوں میں سے خریدے۔ ان کا ذکر بھی اب سننے میں نہیں آتا جیسے یہ کسی اور زمانے کے لوگ ہوں۔

قرۃ العین حیدر:

کوئی نہیں یاد کرتا انھیں۔ یاد کرتا ہے کوئی؟ یہ لوگ اور ان کا سارا ادب بالکل نقش برآب...... اس نے ایک رسالہ نکالا تھا یہی ویژن بلکہ جب وہ اس رسالے کی پہلی کاپی لے کر آیا تو مجھے اب تک یاد ہے کہ اس پر جہاں لکھا تھا VISION میں نے لے کر قلم اس پر لکھا بلرڈ ویژن BLURRED، بہت اچھا تھا اس کا رسالہ اور لکھنے والے اس میں تھے، اس وقت کا جو گروپ تھا انگریزی میں لکھتے تھے...... خواتین کم تھیں۔ اچھا وہ تھا اور پھر فرائیڈے کلب میں ایسے عمدہ DISCUSSION ہوتے تھے، اتنی عمدہ MEETINGS ہوتی تھیں، بڑے BRILLIANT لوگ اس میں شامل تھے۔

آصف فرخی:

یعنی انگریزی لکھنے والا کا ایک پورا گروپ تھا، جو اس کے بعد غائب ہو گیا اور انگریزی WRITING پاکستان میں اس طرح نہیں پنپ پائی جس طرح ہندستان میں ہوئی بلکہ ایک زمانے تک تو صرف احمد علی تھے جن کا نام لیا جاتا تھا۔ یہاں کراچی میں احمد علی سے بھی ملاقات ہوتی تھی آپ کی؟

قرۃ العین حیدر:

احمد علی سے میری ایک آدھ بار ملاقات ہوئی۔ احمد علی ہمارے یعنی ہمارے اماں کے خاندان کے لوگوں کو جانتے تھے اور ان سے بہت دوستی تھی ہمارے نانا کے زمانے سے۔ دہرہ دون میں تھے وہ۔ تو پھر ان کی شادی ہوئی بلقیس سے جو عسکری (ابن سعید) کی سالی تھیں، تو یہ لوگ تھے۔

آصف فرخی:

آپ کو ان کا ناول کچھ یاد آتا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

کس کا؟

آصف فرخی:

احمد علی کا TWILIGHT IN DELHI

قرۃ العین حیدر:

TWILIGHT IN DELHI۔ مجھے یاد ہے۔ اس کا پھر "دلی کی شام" کے نام سے ترجمہ بھی ہوا تھا۔ وہ اس وقت کے لیے نئی چیز تھی، ناول کا مجھے یہ یاد نہیں کیا تھا۔ احمد علی کا ایک افسانہ کلاسیک ہے اور وہ ہے "ہماری گلی"۔ اس کے علاوہ مجھے ان کی تحریریں یاد نہیں آ رہی ہیں۔ یہ ناول اب مجھے یاد نہیں آ رہا ہے۔

آصف فرخی:

ناول تو خیر وہ ٹھیک ٹھاک ہے، اب تو یہ سارے ناول جو ہیں..... کہتے ہیں انگریزی میں ہندستانی ناول کا تصور سلمان رشدی نے بدل دیا۔ آپ نے اس کے ناول پڑھے ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

نہیں پڑھے۔

آصف فرخی:

دلچسپ بات یہ ہے کہ جب وہ اتنا رسوائے زمانہ نہیں ہوا تھا، اس کی وہی کتاب چھپی تھی MIDNIGHTS CHILDREN اور وہ یہاں کراچی آیا تھا تو میں نے ہی اس کا انٹرویو کیا تھا اور اس سے پوچھا تھا کہ آپ ناول میں تاریخ کو سمونے کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں تو HAVE YOU READ QURATULAIN HYDER? تو اس نے پوچھا کہ WHO IS HE?

قرۃ العین حیدر:

(ہنستے ہوئے) THEN I AM RETURING THE COMPLIMENT۔

آصف فرخی:

انگریزی کے لکھنے والوں میں آپ کو ہنری جیمز کے اسلوب سے کوئی خاص مناسبت محسوس ہوئی جو آپ نے اس ناول کا ترجمہ کیا؟

قرۃ العین حیدر:

ہوا یہ تھا کہ کلیم الرحمٰن نے مجھ سے کہا کہ آپ ایک کتاب کا ترجمہ کر دیجیے۔ انھوں نے دو تین کتابیں لا کر دیں۔ ان میں سے میں نے یہ پسند کر لی۔ انھوں نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ ایک سیدہ نسیم ہمدانی تھیں، جو شاگرد تھیں عسکری صاحب کی، ایک کتاب ان سے ترجمہ کروائی۔ ایک کتاب عسکری صاحب نے ترجمہ کی "بڑھا گوریو" ایک انھوں نے مجھ سے کہا آپ ترجمہ کر دیجیے۔ اس میں کوئی ایسی وہ نہیں تھی کہ مجھے...... لیکن مشہور یہی ہو گیا کہ میں ہنری جیمز کی بہت شائق ہوں۔ مجھے کوئی بھی کتاب دیتے میں ترجمہ کر دیتی، کیونکہ مجھے ترجمہ کرنا اچھا لگتا ہے۔ AS I TOLD YOU، کوئی اور کتاب بھی دیتے تو میں ترجمہ کر دیتی۔

آصف فرخی:

جیمز کے علاوہ انگریزی ناول نگاروں میں آپ کو کون پسند ہیں جن کو آپ بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

ارے بھئی بہت ہیں۔ بہت ہیں اور اتنا ہی لمبا قصہ ہو جائے گا۔ بہت سارے پسند ہیں۔ ہنری جیمز اور یہ...... بہت سارے جتنے ماڈرن ناولسٹ ہیں وہ خاص طور پر پسند ہیں اور ان سے پہلے کے بھی پسند ہیں۔

آصف فرخی:

جو اردو کے نئے لکھنے والے ہیں، خاص طور پر جو لوگ افسانہ لکھ رہے ہیں، ان میں سے کچھ کی چیزیں آپ نے پڑھی ہوں گی، ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے بنتی ہے؟

قرۃ العین حیدر:

بھئی وہ تھوڑا سا لکھتے ہیں، پھر نقاد ان کا دماغ خراب کر دیتے ہیں۔

آصف فرخی:

ایسا کیوں ہوتا ہے، یہ کیا بات ہے؟

قرۃ العین حیدر:

اب یہ تو آپ نقادوں سے پوچھیے۔ لکھتے ہیں یہ نئے افسانہ نگار اور لکھنے کے بعد اپنے آپ کو بہت طرّم خاں سمجھنے لگتے ہیں۔ اس میں یہ ہے کہ میرے خیال میں نقادوں نے اپنی ٹولیاں بنائی ہوئی ہیں۔ ایک نقاد ہے وہ چاہتا ہے کہ اس کے بھی شاگرد ہوں جس طرح مصحفی وغیرہ کے ہوتے تھے۔ ایک نقاد ہے اس کی ایک جماعت ہے جو اس کے پیچھے چل رہی ہے، تو وہ جو کہے گا، یہ لوگ اس کی تعریف کریں گے، اس کے لیے خط لکھیں گے، اس نے کسی اور کے بارے میں کچھ کہا تو CONTROVERSY شروع ہوگی، پھر دونوں طرف کے شاگردوں کی فوجیں آجائیں گی میدان میں۔ یہ وہی ہمارا جو چلا آرہا ہے سلسلہ اس روایت کا، اس کی ہے۔

آصف فرخی:

یہ ادب سے زیادہ سیاست ہے اور اس کا اصل مسئلہ POWER ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یہ POWER کا مسئلہ ہے۔ یہ LEADERSHIP کا مسئلہ ہے۔

آصف فرخی:

لیڈرشپ کی وہ شکل جو ڈکٹیٹرشپ ہے۔

قرۃ العین حیدر:

بالکل، ڈکٹیٹرشپ کا مسئلہ ہے، لیڈرشپ کا مسئلہ ہے۔ اور چونکہ میں نے لیڈری نہ کی نہ مجھے شوق ہے، اس لیے میں بالکل بے نیاز رہی اس چیز سے کہ کوئی مجھے کیا کہتا ہے یا لکھتا ہے، کون کس پارٹی میں ہے، میں کسی پارٹی میں نہیں ہوں، IT HAS NEVER BOTHERED ME، میں نے پروا ہی نہیں کی۔ مگر لوگ جو ہیں THEY ARE VERY CONCERNED۔ وہ سوچتے ہیں کہ ہم نے یہ کتاب لکھی، اس پر لکھا گیا، اس پر یہ ہوا وہ سب بھی کرتے ہیں۔ یہ ان کے لیے پاور کا مسئلہ ہے۔

آصف فرخی:

آپ نے بتایا تھا کہ کراچی میں آپ کی ملاقات شیخ ایاز سے بھی ہوئی تھی۔ شیخ ایاز نے اپنی ڈائری میں آپ سے ایک ملاقات کا ذکر کیا ہے کہ وہ "سیتاہرن" کا ترجمہ کرنا چاہتے تھے اور آپ نے معاوضے کا مطالبہ کیا تھا۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ میں نے کہا "کیا دو گے؟"

آصف فرخی:

تو شیخ ایاز اور ان سے ملاقات کے حوالے سے......

قرۃ العین حیدر:

انھوں نے یہ EXACT الفاظ لکھے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ کیونکہ میں اوّل تو اس طرح کسی سے بات نہیں کرتی۔ اتنی بے تکلفی سے اور اس طرح کہ "کیا دو گے؟" اور میں ایسی کاروباری بات نہیں کرتی۔ میرے دماغ میں آتا ہی نہیں کہ میں اس طرح کی بات کروں پیسے کی یا معاوضے کی۔ یہ انھوں نے کس طرح لکھا اور کیوں لکھا، یہ مجھے نہیں معلوم۔ اگر وہ مرحوم زندہ ہوتے تو میں ان سے پوچھتی بہر حال۔ ہاں، یہ ہوسکتا ہے کہ میں نے کوئی بات کسی اور طرح سے کہی اور وہ اس کو کیا سمجھے۔ پھر شاید انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس مسئلے پر بات ہوئی کہ رائلٹی کس طرح لوگ حاصل کرتے ہیں۔ مگر "یہ کیا دو گے" میں نے نہیں کہا۔ THIS IS NOT IN MY CHARACTER، میرے مزاج کے بالکل برخلاف ہے۔

آصف فرخی:

اس جملے کے باوجود بات یہ ہے کہ شیخ ایاز اس کتاب کے بہت مداح تھے۔ انھوں نے کہیں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ واحد ناول ہے جس کو انھوں نے دو مرتبہ پڑھا ہے۔ وہ اس ناول کا سندھی میں ترجمہ بھی کرنا چاہتے تھے۔

قرۃ العین حیدر:

لیکن وہ نہیں کر پائے۔

آصف فرخی:

اس کا پھر ترجمہ ولی رام ولبھ نے کیا جو حال ہی میں دوبارہ شائع ہوا ہے......

قرۃ العین حیدر:

کس نے؟THAT'S AN INTERESTING NAME۔ کہیں رہتے ہیں؟

آصف فرخی:

وہ حیدرآباد میں رہتے ہیں۔ بہت اچھا ترجمہ کیا ہے انھوں نے......

قرۃ العین حیدر:

حیدرآباد! اچھا یہ کتاب مجھے بھی دکھائیے۔

آصف فرخی:

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ترجمہ اس لیے اور بھی اچھا ہوا کہ انھوں نے سیتا کی ساری سچویشن سے IDENTIFY کیا ہو۔

قرۃ العین حیدر:

وہ مسئلہ تو ان کا اپنا ہی ہوا۔ وہ ضرور IDENTIFY کر سکتے ہیں۔ اور یہ میں نے دراصل...... سیتا میر چندانی میں نے دراصل...... میرے دماغ میں کوئی سندھی ہندو لڑکی نہیں تھی۔ اب اگر اس بات کی تفصیل میں بتاؤں گی تو اس کا سارا MYSTIQUE ختم ہو جائے گی، وہ ساری MYTH میں بتائے دیتی ہوں لیکن آپ اس کو ریکارڈ نہ کیجیے۔

آصف فرخی:

وہ لڑکی چاہے کہیں کی بھی ہو لیکن اس کتاب میں سندھ کا جو نقشہ آپ نے کھینچا ہے......

قرۃ العین حیدر:

ہاں تو وہ تو میں چاہتی تھی کہ سندھ کا پورا نقشہ میں لاؤں۔ وہ کبھی آیا نہیں اردو میں۔ تو میں

نے کوشش کی کہ میں وہ سندھ کا نقشہ لاؤں، جو سندھ کی پوری میتھ اور جو سندھ کی ساری چیزیں ہیں، اردو والے واقف ہی نہیں اس سے اور جو ہندو فیکٹر ہے سندھی کلچر کا اور جو MYSTICISM کا فیکٹر ہے، اس کو میں نے کوشش کی ہے اس میں لانے کی۔

آصف فرخی:

اردو والے تو اب تک واقف نہیں ہیں......

قرۃ العین حیدر:

اچھا؟

آصف فرخی:

وہ ایسے کہ اس میں ایک جگہ آپ نے دکھایا ہے کہ عرفان کے سامنے "شاہ جو رسالو" پڑھا جاتا ہے تو وہ بتاتا ہے کہ وہ یہ سب نہیں سمجھ سکتا۔ تو عرفان کراچی کے ایک عام آدمی کی علامت ہے۔ جواب تک یہ نہیں سمجھ پایا۔

قرۃ العین حیدر:

آج تک؟ کیوں؟

آصف فرخی:

یہ پھر ایک لمبی کہانی ہے۔ یہ میرا انٹرویو بن جائے گا اگر میں اس کا جواب دینے بیٹھ گیا......

قرۃ العین حیدر:

نہیں، مطلب یہ کہ کیا سندھ والوں نے آپ لوگوں کو ACCEPT نہیں کیا؟

آصف فرخی:

شروع میں تو کیا بلکہ اس وقت کیا جب ہر طرف عرفان جیسی سوچ والے لوگ تھے کہ انھیں پتا ہی نہیں تھا کہ سندھ کس چڑیا کا نام ہے۔ کچھ عرصے بعد کلچرل مسئلے کے بجائے ایک سیاسی مسئلہ بن گیا۔ پھر ایک CONFRONTATION ہے جس کی پوری تاریخ ہے اور جیسا کہ ہوتا ہے، دونوں طرف سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ لیکن اس وقت کہنے کی جو بات ہے کہ اردو ادب نے

زیادہ PENETRATE نہیں کیا سندھ اور اس کے مسائل کی تصویر کشی پر اور بات وہاں سے آگے نہیں بڑھی جہاں جہاں سیتا ہرن نے چھوڑا تھا یعنی "سیتا ہرن" نے تو ایک دروازہ کھولا تھا۔ اس دروازے میں پھر کوئی نئی شکل نہیں داخل ہوئی۔

قرۃ العین حیدر:

یعنی سندھی کلچر جو ہے اس میں مہاجر داخل نہیں ہوا؟

آصف فرخی:

نہیں۔ اس میں داخل نہیں ہوا۔

قرۃ العین حیدر:

تو مہاجر کہاں داخل ہوا؟

آصف فرخی:

شاید کہیں بھی نہیں............

قرۃ العین حیدر:

مہاجر بنگال میں اس طرح داخل نہیں ہوا، پنجاب میں داخل نہیں ہوا۔ مہاجر کی اپنی ایک نفسیات ہے......

آصف فرخی:

اس کی اپنی جو نفسیات ہے، اس کا خلاصہ ایک فقرے میں ہے...... اوّل تو یہ کہ مہاجر مہاجر ہی رہا، یعنی آج کی جس جنریشن نے ہجرت نہیں کی وہ بھی مہاجر ہے۔ یہ نفسیات END GAME والی ہے۔ وہ ایک فقرہ ہے جس کو انتظار حسین نے اپنے ناول کا عنوان بھی بنایا ہے، "آگے سمندر ہے" حالانکہ یہ ناول مجھے زیادہ پسند نہیں ہے لیکن اب ان لوگوں کی پوری صورت حال کا عنوان یہی فقرہ نظر آتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

آپ اس کو ریکارڈ کر رہے ہیں؟ اس کو ریکارڈ کیجیے؟

جو رویے INHERIT کیے ہیں یا جو رویے ہماری سوسائٹی نے ہم پر لادے ہیں، ہم ان کو FOLLOW کرتے ہیں۔ اگر آپ الگ سے سوچیں تو یا تو آپ کو ECCENTRIC کہا جائے گا یا آپ کو ANTI-NATIONAL یا آپ کو کہا جائے گا کہ YOU ARE TRYING TO BE DIFFERENT TO ATTRACT ATTENTION لیکن کوئی یہ نہیں سوچتا کہ آپ بھیڑ چال سے الگ بھی تو کچھ سوچ سکتے ہیں، کوئی نہیں دیکھتا۔

آصف فرخی:

افسوس کی بات یہ ہے کہ ادیب بھی نہیں سوچتے۔

قرۃ العین حیدر:

ادیب بھی نہیں سوچتے، میں ادیبوں ہی کی بات کر رہی ہوں۔ میں عوام کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ عوام تو ہیں بے چارے، جدھر موڑ دیئے گا ادھر مڑ جائیں گے۔ ادیب نہیں سوچتے۔

آصف فرخی:

لیکن ہمارے لیڈروں کے ساتھ بھی مشکل آئی یعنی وہ جن کے پیچھے عوام چلتے آئے ہیں اور زیادہ تر ادیب بھی۔ جیسا کہ آپ نے "آخر شب کے ہم سفر" میں دکھایا ہے کہ جب لیڈر اپنے نظریات سے DISILLUSIONMENT کا شکار ہوئے تو وہ بہت زیادہ مادہ پرست ہو گئے۔ یہ عجیب و غریب PHENOMENON ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یہ عجیب و غریب PHENOMENON اس لیے ہے کہ ہم لوگ بنیادی طور پر تہی دست سوسائٹی رہے ہیں۔ DEPRIVED سوسائٹی۔ ہمارے ہاں عام طور پر جو ہمارا LEVEL تھا وہ غربت کا تھا۔ اور اس میں جب آزادی کے بعد فراوانی آئی، پیسہ آیا تو ظاہر ہے کہ آپ دیکھیے کہ ہمارے ہاں جن لوگوں کے پاس بھی پیسہ نہیں تھا، ان لوگوں کے پاس بھی آ گیا پیسہ۔ بہت سے لوگ تھے جن کے پاس پہلے بھی نہیں تھا، اب بھی نہیں ہے، جو MAJORITY ہے۔ لیکن جن کے پاس نہیں تھا اور ان کے پاس آ گیا، THEY WANTED TO RETAIN THAT

PROPERTY اور اس خوشحالی کو رکھنے کے لیے اپنے پاس STATUS QUO ضروری تھا، لہٰذا اگر آپ اس سماج کو بدلنے کی بات کرتے ہیں تو ان کو ڈر لگتا ہے کہ یہ خوشحالی تو ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ کیونکہ عام طور پر ہمارے ہاں، سوائے...... آپ تو آزادی کے بہت بعد کی پیدائش ہیں، آزادی سے پہلے ایک محدود طبقہ تھا مڈل کلاس یا اپر مڈل کلاس جس کے پاس وہ ساری چیزیں تھیں جو آج آپ کے عام طور پر لوئر مڈل کلاس اور ورکنگ کلاس میں بھی نظر آتی ہیں کہ ان کے پاس ہیں۔ کیونکہ ایک تو معیار زندگی بڑھ گیا ہے۔ جھگی جھونپڑی والے کے پاس بھی ٹیلی ویژن آ گیا ہے، ٹھیک ہے؟ بچے اسکول جا رہے ہیں۔ IT IS A REVOLUTION OF RISING EXPECTATIONS اور یہ جو ہے وہ...... NOT AN ACTUAL REVOLUTION, BUT A REVOLUTION OF RISING EXPECTATIONS یعنی کہ آپ کا جو غریب کاری گر ہے وہ بھی یہ سوچتا ہے کہ میرا لڑکا کالج میں پڑھ لے اور اچھا، وہ پڑھتا ہے۔ وہ ولایت بھی جا سکتا ہے اسکالرشپ پر۔ پرانا نظام تہہ و بالا ہو گیا سارا سسٹم۔ تو اس سے پھر...... اس میں جو DEPRIVED طبقے تھے ظاہر ہے ان کے پاس پیسہ آ گیا۔ بہتوں کے پاس آ گیا۔ اب آپ دیکھیے یہاں پر، ہندستان میں دیکھیے، پاکستان میں دیکھیے، یہ جو بے انتہا، بے شمار مکانات، کوٹھیاں، دو منزلہ گھر بنے ہیں، یہ کیسے بن گئے؟ پہلے یہ کلاس بہت محدود تھی۔ اول تو آبادی اتنی نہیں بڑھی تھی اور آبادی کے ساتھ وسائل اتنے نہیں آئے تھے، اتنا پیسہ نہیں آیا تھا، اتنے نئے ذریعے نہیں آئے تھے آمدنی کے...... اب میں لکھنؤ کی بات کرتی ہوں جو میں نے اپنے بچپن کا دیکھا ہے یا لڑکپن کا اور اس کے بعد کا کہ ایک محدود طبقہ تھا جو سول لائنز میں رہتا تھا۔ ایک محدود طبقہ تھا جو شہر کے اندر رہتا تھا لیکن اچھے مکانوں میں رہتا تھا۔ اور زیادہ تر طبقہ غریبوں کا، جو کاری گر تھے یا خانگی ملازم یا دکان دار تھے۔ وہ گویا آپ کی لوئر کلاسز کہلاتے تھے۔ اور وہ اپنی جگہ پر ایک بہت بڑا...... ایک طبقے سے دوسرے طبقے میں آپ MOBILE نہیں تھے۔ مطلب یہ اس وقت ممکن نہیں تھا کہ جو ڈرائیور ہے میرا اس کا لڑکا تعلیم حاصل کر کے بی اے۔ ایم اے کر کے یہاں کرسی پر آ کر بیٹھ جائے گا۔ نہیں بیٹھ سکتا تھا وہ یہاں آ کر۔ وہ ڈرائیور کا لڑکا ہے تو ڈرائیور ہی

بنے گا یا کلینر بنے گا یا خانساماں بن جائے۔ آزادی کے بعد یہ ہوا کہ یہ بالکل تفریق...... اس کا BREAK DOWN ہو گیا جو بہت اچھی بات تھی۔ اس لیے کہ دو آبادیوں کا تبادلہ ہوا اور جو نئے وسائل، نئے ذریعے پیدا ہوئے...... بھئی، یہ بہت بڑا انقلاب ہے۔ یہ SILENT REVOLUTION ہے۔ یعنی وہ طبقہ جو تھا، جو غریب یا کاری گر طبقہ تھا، ان کو یہاں آ کر اور انڈیا میں بھی نئے مواقع ملے، پڑھنا شروع کیا، پڑھا لکھا...... مطلب یہ کہ پورا ایک نیا سماج، ایک نیا سسٹم بن گیا۔ اچھا، مگر اس میں بھی پھر یہ ہوا کہ جو بالکل نیچے تھے وہ تھوڑا سا اوپر آ گئے، لیکن اس کے ساتھ ایک NOUVEAU RICH کلاس پیدا ہو گیا اور اس NOUVEAU RICH کلاس نے پرانے جاگیردار طبقے کو REPLACE کر دیا۔ تو وہ آپ کا جو سسٹم تھا اس میں زمیں دار کے بجائے نیا سرمایہ دار اس کی جگہ آ گیا اور EXPLOITATION کا لیول وہی رہا یا پھر اور بڑھ گیا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ POSITIVE بات ہوئی...... ITS ALL SO COMPLICATED یہ ہوا کہ جو کاری گر طبقہ تھا اس میں سے لڑکوں نے تعلیم حاصل کی تو وہ نئی مڈل کلاس بن گئے جو نئی مڈل کلاس تھی انھوں نے اور مواقع حاصل کیے تو وہ اپر کلاس میں چلے گئے۔ ایک نیا عنصر ہمارے ہاں آیا، جو پہلے تھا ہی نہیں، وہ بلیک منی کا تھا۔ اس بلیک منی نے تو آپ کی کائنات تہہ و بالا کر دی یعنی اب آپ دیکھیے کہ جو STANDARD OF LIVING اس وقت لوگوں کا ہے، یہ ہمارے زمانے میں ہمارے زمیں داروں کا بھی اتنا نہیں تھا۔ بالکل نہیں تھا، یعنی ایک زمیں دار یا ایک نواب، جسے ہم نواب کہتے ہیں مطلب چھوٹے LAND-OWNER کا LAVEL یعنی والیان ریاست نہیں بلکہ ان سے کم، ان کے ہاں دو موٹریں ہوں گی، دو تین بگھیاں ہوں گی، ایک بڑا سا گھر ہوگا، دس بارہ ملازم ہوں گے، THEY WERE SUPPOSED TO BE UPPER-CLASS اب آپ کا اس لیول کا ایک AVERAGE سرمایہ دار اس سے بہتر لیول پر رہتا ہے۔ اس کے پاس پانچ چھ موٹریں ہوتی ہیں۔ اس کے ہر لڑکے کے پاس ایک گاڑی ہوتی ہے۔ ہے نا؟ تو وہ جو اپر کلاس تھی جس کا تعلق زمین دار طبقے سے تھا جو اپر کلاس سول سرونٹ تھا۔ وہ تو کہیں بہت پیچھے رہ گیا۔ آپ کے آج کل کے جو معیار زندگی ہیں، اس میں بہت پیچھے رہ گیا بے چارہ، تو اتنا بڑا انقلاب ہے جو اس

جنریشن کے بچوں نے، جو اس کلاس کے بچے ہیں جو کہ باہر جاتے ہیں اپنے HOLIDAYS کے لیے، سوئٹزرلینڈ جاتے ہیں۔ پہلے اس کے EQUIVALENT کلاس کے بچے زیادہ سے زیادہ مسوری چلے جاتے تھے۔ اب جو بچے ہیں اس نئی PROSPEROUS کلاس کے وہ عام طور پر باہر پڑھتے ہیں۔ وہ انڈیا یا پاکستان میں نہیں پڑھتے۔ تو اتنا بڑا یہ انقلاب ہے کہ اس نے نفسیات بدل دی ہے لوگوں کی۔ ٹھیک ہے؟

آصف فرخی:

جی ہاں۔ بالکل۔

قرۃ العین حیدر:

نفسیات بدل دی ہے۔ اچھا، اس کی عکاسی ادب میں نہیں ہوئی۔ ادب میں اس طرح نہیں ہوئی۔ بڑی STEREO TYPE قسم کی ہوئی ہے کہ آپ نے یہ جو نئے امیر ہیں، یہ نئے دولت مندان کا مذاق اڑا لیا۔ اس طرح کرشن چندر کا ایک بے انتہا مبالغہ آمیز افسانہ تھا کہ فلاں صاحب کے گھر میں چھ سوئمنگ پول ہیں اور پندرہ کتے ہیں اور بیس گاڑیاں ہیں، اس قسم کا کچھ تھا، WHICH IS NOT TRUE ضرور نہیں کہ کسی کے گھر میں یہ سب ہو، تو وہ ان لوگوں کی ایک قسم کی غیر حقیقی عکاسی تھی، جو آپ نے پیش بھی کیا ادب میں تو یہ سب کچھ REALISTIC نہیں تھا۔

آصف فرخی:

REALISTIC بھی نہیں تھا اور اس پوری صورت حال کا زیادہ تجزیہ نہیں کیا گیا۔

قرۃ العین حیدر:

تجزیہ نہیں کیا گیا اور ادب سے اس طبقے کا کوئی تعلق نہیں ہے، کوئی رابطہ نہیں ہے۔ وہ پڑھتے ہی نہیں۔ اب میں نے یہاں دیکھا ہے بہت سے گھروں میں دیکھا ہے، یہاں پر بھی اور وہاں بھی، بہت شاندار گھر ہیں مگر کتابیں نہیں ہیں۔ NO BOOKS AT ALL کیوں نہیں ہیں؟ ایک تو یہ WORLD WIDE ہے، ساری دنیا میں ہو رہا ہے کہ آپ کا جو تعلق تھا، رابطہ تھا چھپے ہوئے لفظ سے، وہ ختم ہو گیا ہے۔ آپ کا سابقہ ہو گیا ہے اب امیج سے۔ الیکٹرونک میڈیا سے،

ریڈیو کی آواز سے اور ٹی وی کی امیج سے۔ تو پڑھنے کا جو سلسلہ تھا کہ بچے پڑھتے تھے، وہ ختم ہو گیا۔ اب یہ آپ لے کر آئے ہیں ''پھول'' تو ''پھول'' اخبار ہر ہفتے آتا تھا اور بچے بہت ذوق و شوق سے اس کو پڑھتے تھے۔ اس میں لکھتے تھے۔ بمبئی سے ایک رسالہ نکلتا تھا ''پشپا'' انگریزی میں۔ اس زمانے میں وہ بڑا مشہور تھا بچوں کا، مجھے یاد ہے کہ میرے ایک ماموں نے میرے نام جاری کر دیا تھا۔ وہ ہر مہینے آتا تھا، تو میرے لیے ''پشپا'' آتا تھا جس دن بمبئی سے، وہ میرے لیے عید ہوتی تھی۔ آل انڈیا چلڈرنز ایسوسی ایشن ایک چیز تھی جس کا ہیڈ کوارٹر سکھر میں تھا۔ سندھ میں، بالکن جی باری، اس کا نام بھی سندھی تھا، بالکن جی باری۔ اس کا ہیڈ کوارٹر یہاں تھا اور اس کا یہ رسالہ نکلتا تھا ''پشپا'' بمبئی سے۔ تو پورا ایک نیٹ ورک تھا بچوں کا، انگریزی داں بچوں کا جو اس میں لکھتے تھے۔ اس میں مسلمان بھی تھے، ہندو بھی تھے، سکھ بھی تھے، عیسائی اور بھی تھے۔ اچھا پھر ''پھول'' تو خیر تھا ہی، ''پھول'' تھا ''نبات'' تھا تو یہ رسالے تھے اور اس طرح پانچ چھ سال کی عمر سے بچے کا رابطہ چھپے ہوئے لفظ سے بن جاتا تھا۔

آصف فرخی:

یہ رسالے تو لگتا ہے کسی پرانے زمانے کی بات ہیں۔ وہ رابطہ ختم ہو گیا۔

قرۃ العین حیدر:

وہ رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ اب VISUAL ہو گیا ہے۔ وہ ہر چیز VISUAL صورت میں دیکھتے ہیں۔ اس سے میں سمجھتی ہوں IMAGINATION جو تھا بچوں کا، وہ ختم ہو گیا۔

آصف فرخی:

یہ اصل نقصان ہوا ہے چھپے ہوئے لفظ سے بچھڑنے کا۔ یہ بہت بڑا فرق پڑا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

میرے خیال میں۔

آصف فرخی:

IMAGINATION بھی ختم ہو گیا تو پھر ان کی MEMORY کیسی رہے گی؟ میموری تو

آپ کے لیے خاص طور پر اہم ہے......ایک انتہائی اہم ذہنی عمل ہے بلکہ آپ سے اسی حوالے سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کراچی میں جتنا عرصہ رہیں تو کیا آپ کو یہ شہراب بھی یاد آتا ہے اور اس وقت کی کیا باتیں یاد آتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

بھئی اس وقت کی باتیں تو مجھے یہ یاد آتی ہیں کہ زندگی زیادہ آسان تھی، STATUS کا لوگوں کو سودا نہیں ہوا تھا۔ یہ چیز مجھے سب سے زیادہ یاد آتی ہے۔ اور یہ تھا کہ ہمارے رشتے دار تھے جو سب ہندوستان کے مختلف حصوں سے آ کر یہیں بس گئے تھے۔ کچھ پیر الٰہی بخش کالونی میں سیٹل ہوئے، کچھ لارنس روڈ پر سیٹل ہوئے جہاں جہاں جس کو مکان ملا وہاں رہا۔ کچھ کو بڑی کوٹھیاں ملیں۔ لیکن سب ہر ہفتے ایک دوسرے سے ملتے تھے اور اسٹیٹس کا تو خیر ویسے بھی خاندانوں میں نہیں ہوتا ہے یہاں بھی نہیں تھا۔ لیکن کوئی اتنا وہ نہیں تھا، یہ احساس نہیں تھا کہ صاحب، ہم پی آئی بی کالونی میں رہتے ہیں تو یہ کوئی INFRA-DIG بات ہے۔ میرا خیال ہے اب لوگوں میں شاید یہ زیادہ آ گیا ہے۔

آصف فرخی:

یہ تو ہوا خاندان۔ اس کے علاوہ آپ دفتر میں بھی کام کرتی رہیں......

قرۃ العین حیدر:

دفتر کا بڑا FRIENDLY ماحول تھا۔ اور بہت ہی......ایک بڑی دلچسپ بات یہ تھی اور بڑی تعجب خیز بات تھی کہ مسلم سماج میں خواتین نے کبھی اس طرح حصہ نہیں لیا کہ ساتھ دفتروں میں کام کریں، لیکن میں واحد خاتون تھی جو وہاں پر کام کر رہی تھی۔ ایک مجھ سے پہلے تھیں جن کی جگہ پر میں وہاں آئی تھی، مسرت جہاں تیموری۔ وہ امریکہ چلی گئی تھیں۔ پھر وہ واپس آ گئیں، لیکن وہاں کوئی کسی قسم کا احساس نہیں تھا کہ ہم مردوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ وہ نہایت مہذب، نہایت شائستہ لوگ تھے......کچھ لگتا ہی نہیں تھا کہ فرق ہے اور یہ تعجب خیز بات ہے کیونکہ ان میں زیادہ تر لوگ وہ تھے جو کہ ایک SEGREGATED معاشرے سے آئے تھے۔

آصف فرخی:

کراچی کے دنوں کا کوئی ایسا خاص واقعہ جو آپ کو خاص طور پر HAUNT کرتا ہو؟

قرۃ العین حیدر:

مجھے اب تک اچھی طرح یاد ہے اور میں نے لکھا بھی ہے کہ میری نظروں کے سامنے ایک لڑکے کو مارا گیا۔ دسمبر 1948 کی بات ہے۔ گرینڈ ہوٹل میں ہم رہ رہے تھے، اوپر کی منزل پر ہمارا فلیٹ تھا۔ میری بھابھی اور میں، ہم لوگ اوپر کھڑے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ایک سندھی ہندو لڑکا جو نیچے کے کسی فلیٹ میں رہتا تھا صبح کے وقت تیار ہو کر کالج جانے کے لیے نکلا۔ ڈی جے کالج میں پڑھتا ہوگا۔ وہ باہر نکلا ہی ہوگا کہ لوگ جمع ہو گئے، ایک دم سے معلوم نہیں کہاں سے نکل کر آ گئے۔ لاٹھیاں لے کر آئے تھے اور اس کو مارنا شروع کر دیا۔ THEY BEAT HIM TO DEATH وہ قتل نہیں تھا۔ وہ MURDER ہوتا ہے کہ آپ کسی کو شوٹ کر دیں۔ HE WAS BEATEN TO DEATH وہ PULP بن گیا۔ مجھے اب تک یاد ہے اس نے چارخانے کا کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے ہاتھوں میں جو کتابیں تھیں وہ پرزہ پرزہ ہو کر بکھر گئیں۔ کالج جا رہا تھا۔ وہ مجھے اب تک یاد ہے۔

آصف فرخی:

کراچی کے دنوں کا احوال لکھتے ہوئے آپ نے اپنے دوستوں کے گروپ کا ذکر کیا ہے جو انگریزی میں لکھتے تھے......

قرۃ العین حیدر:

بھئی وہ ایک بہت اچھا گروپ تھا۔ ایک فرائیڈے کلب ہوا کرتا تھا۔ یہاں پر ایک صاحب تھے ستو قریشی، جن کے والد ڈاکٹر قریشی علی گڑھ میں میڈیکل آفیسر تھے، علی گڑھ یونیورسٹی میں۔ ہمارے والدین کی ان سے اس وقت سے دوستی تھی۔ ان کی اولاد یہاں پر تھی۔ ایک سے ایک ذہین لڑکا تھا۔ ایک ستو قریشی تھے، وہ ایئر کالج میں رہتے تھے۔ وہ ایئر فورس میں تھے۔ ایک بیٹا تھا، عمر قریشی، کرکٹ کا مشہور COMMENTATOR ایک تھا انور قریشی، وہ میرا

کولیگ تھا۔ بے حد ذہین تھا BRILLIANT CONVERSATIONALIST، اس نے شادی کی تھی ایک پارسی لڑکی سے، ماکو دھنجی بائے سے۔

آصف فرخی:

جوما کی قریشی کے نام سے مشہور ہوئیں، انگریزی کی شاعرہ......

قرۃ العین حیدر:

بڑی اچھی شاعرہ، بہت اچھی شاعرہ...... پھر ایک بوبی فاروقی تھا۔ وہ بڑا اچھا لکھتا تھا۔ اس پر اس وقت اسلام کا جوش طاری ہوا تھا۔ اس زمانے میں اس نے ISLAMIC CONSTITUTION پر ایک کتاب لکھی تھی۔ ان کی والدہ ہندو تھیں کے پی ایس کے مینن کی بہن اور ان کے والد جنرل فاروقی آئی ایم ایس کے رکن تھے اور پھر یہاں پاکستان آرمی کے میڈیکل چیف تھے۔ تو ایک بوبی فاروقی تھا۔ بوبی نے شادی کی تھی ایک سندھی لڑکی سے جس کی ماں انگریز تھیں۔ پھر اس کے علاوہ یونس سعید تھا، جس نے وہ رسالہ VISION نکالا تھا۔ یونس سعید، بوبی فاروقی، کمال احمد فاروقی......ایک صاحب تھے نصیر احمد فاروقی...... پتا نہیں کہاں ہیں آج کل، سنا ہے برازیل میں رہتے ہیں۔ پھر ایک صاحب تھے...... پھر کولیگ بڑے اچھے تھے، اللہ بخش راجپوت، ناصر شمسی بڑے اچھے آرٹسٹ۔ پھر مس تیموری تھیں جواب بھی یہاں ہیں۔ یہ ہم لوگوں کا گروپ تھا۔ ہم لوگ دوپہر کو جاتے تھے کافی ہاؤس، جو یہاں تھا بندر روڈ پر۔ وہاں پر مل کر کھانا کھاتے تھے۔ بہت اچھا گروپ تھا۔ بڑے اچھے DISCUSSION ہوتے تھے، اس وقت بلکہ بڑی اچھی ایک LIBERAL فضا تھی۔ میرے خیال میں یہ فضا ختم ہوئی ہے، مارشل لا کے ساتھ۔

آصف فرخی:

یہ جو آپ لوگوں کا SMART SET تھا اور یہ جو اس شہر کی فضا تھی، وہ اب آپ کی تحریر میں پڑھنے کو ملتی ہے، ایک کہانی کی طرح۔ یونس سعید کے افسانوں کا مجموعہ اور ویژن کی بہترین تحریروں کا انتخاب میں نے فٹ پاتھ پر سے پرانی کتابوں میں سے خریدے۔ ان کا ذکر بھی اب سننے میں نہیں آتا جیسے یہ کسی اور زمانے کے لوگ ہوں۔

قرۃ العین حیدر:

کوئی نہیں یاد کرتا انھیں۔ یاد کرتا ہے کوئی؟ یہ لوگ اور ان کا سارا ادب بالکل نقش برآب...... اس نے ایک رسالہ نکالا تھا یہی ویژن بلکہ جب وہ اس رسالے کی پہلی کاپی لے کر آیا تو مجھے اب تک یاد ہے کہ اس پر جہاں لکھا تھا VISION میں نے لے کر قلم اس پر لکھا بلرڈ ویژن BLURRED، بہت اچھا تھا اس کا رسالہ اور لکھنے والے اس میں تھے، اس وقت کا جو گروپ تھا انگریزی میں لکھتے تھے...... خواتین کم تھیں۔ اچھا وہ تھا اور پھر فرائیڈے کلب میں ایسے عمدہ DISCUSSION ہوتے تھے، اتنی عمدہ MEETINGS ہوتی تھیں، بڑے BRILLIANT لوگ اس میں شامل تھے۔

آصف فرخی:

یعنی انگریزی لکھنے والا کا ایک پورا گروپ تھا، جو اس کے بعد غائب ہو گیا اور انگریزی WRITING پاکستان میں اس طرح نہیں پنپ پائی جس طرح ہندستان میں ہوئی بلکہ ایک زمانے تک تو صرف احمد علی تھے جن کا نام لیا جاتا تھا۔ یہاں کراچی میں احمد علی سے بھی ملاقات ہوتی تھی آپ کی؟

قرۃ العین حیدر:

احمد علی سے میری ایک آدھ بار ملاقات ہوئی۔ احمد علی ہمارے یعنی ہمارے اماں کے خاندان کے لوگوں کو جانتے تھے اور ان سے بہت دوستی تھی ہمارے نانا کے زمانے سے۔ دہرہ دون میں تھے وہ۔ تو پھر ان کی شادی ہوئی بلقیس سے جو عسکری (ابن سعید) کی سالی تھیں، تو یہ لوگ تھے۔

آصف فرخی:

آپ کو ان کا ناول کچھ یاد آتا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

کس کا؟

آصف فرخی:

احمد علی کا TWILIGHT IN DELHI

قرۃ العین حیدر:

TWILIGHT IN DELHI۔ مجھے یاد ہے۔ اس کا پھر "دلی کی شام" کے نام سے ترجمہ بھی ہوا تھا۔ وہ اس وقت کے لیے نئی چیز تھی، ناول کا مجھے یہ یاد نہیں کیا تھا۔ احمد علی کا ایک افسانہ کلاسیک ہے اور وہ ہے "ہماری گلی"۔ اس کے علاوہ مجھے ان کی تحریریں یاد نہیں آ رہی ہیں۔ یہ ناول اب مجھے یاد نہیں آ رہا ہے۔

آصف فرخی:

ناول تو خیر وہ ٹھیک ٹھاک ہے، اب تو یہ سارے ناول جو ہیں...... کہتے ہیں انگریزی میں ہندستانی ناول کا تصور سلمان رشدی نے بدل دیا۔ آپ نے اس کے ناول پڑھے ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

نہیں پڑھے۔

آصف فرخی:

دلچسپ بات یہ ہے کہ جب وہ اتنا رسوائے زمانہ نہیں ہوا تھا، اس کی وہی کتاب چھپی تھی MIDNIGHTS CHILDREN اور وہ یہاں کراچی آیا تھا تو میں نے ہی اس کا انٹرویو کیا تھا اور اس سے پوچھا تھا کہ آپ ناول میں تاریخ کو سمونے کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں تو HAVE YOU READ QURATULAIN HYDER? تو اس نے پوچھا کہ WHO IS HE?

قرۃ العین حیدر:

(ہنستے ہوئے) THEN I AM RETURING THE COMPLIMENT۔

آصف فرخی:

انگریزی کے لکھنے والوں میں آپ کو ہنری جیمز کے اسلوب سے کوئی خاص مناسبت محسوس ہوئی جو آپ نے اس ناول کا ترجمہ کیا؟

قرۃ العین حیدر:

ہوا یہ تھا کہ کلیم الرحمٰن نے مجھ سے کہا کہ آپ ایک کتاب کا ترجمہ کر دیجیے۔ انھوں نے دو تین کتابیں لاد کر دیں۔ ان میں سے میں نے یہ پسند کر لی۔ انھوں نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ ایک سیدہ نسیم ہمدانی تھیں، جو شاگرد تھیں عسکری صاحب کی، ایک کتاب ان سے ترجمہ کروائی۔ ایک کتاب عسکری صاحب نے ترجمہ کی ''بڑھا گوریو'' ایک انھوں نے مجھ سے کہا آپ ترجمہ کر دیجیے۔ اس میں کوئی ایسی وہ نہیں تھی کہ مجھے...... لیکن مشہور یہی ہو گیا کہ میں ہنری جیمز کی بہت شائق ہوں۔ مجھے کوئی بھی کتاب دیتے میں ترجمہ کر دیتی، کیونکہ مجھے ترجمہ کرنا اچھا لگتا ہے۔ AS I TOLD YOU، کوئی اور کتاب بھی دیتے تو میں ترجمہ کر دیتی۔

آصف فرخی:

جیمز کے علاوہ انگریزی ناول نگاروں میں آپ کو کون پسند ہیں جن کو آپ بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

ارے بھئی بہت ہیں۔ بہت ہیں اور اتنا ہی لمبا قصہ ہو جائے گا۔ بہت سارے پسند ہیں۔ ہنری جیمز اور یہ...... بہت سارے جتنے ماڈرن ناولسٹ ہیں وہ خاص طور پر پسند ہیں اور ان سے پہلے کے بھی پسند ہیں۔

آصف فرخی:

جو اردو کے نئے لکھنے والے ہیں، خاص طور پر جو لوگ افسانہ لکھ رہے ہیں، ان میں سے کچھ کی چیزیں آپ نے پڑھی ہوں گی، ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے بنتی ہے؟

قرۃ العین حیدر:

بھئی وہ تھوڑا سا لکھتے ہیں، پھر نقاد ان کا دماغ خراب کر دیتے ہیں۔

آصف فرخی:

ایسا کیوں ہوتا ہے، یہ کیا بات ہے؟

قرۃ العین حیدر:

اب یہ تو آپ نقادوں سے پوچھیے۔ لکھتے ہیں یہ نئے افسانہ نگار اور لکھنے کے بعد اپنے آپ کو بہت طرّم خاں سمجھنے لگتے ہیں۔اس میں یہ ہے کہ میرے خیال میں نقادوں نے اپنی ٹولیاں بنائی ہوئی ہیں۔ایک نقاد ہے وہ چاہتا ہے کہ اس کے بھی شاگرد ہوں جس طرح مصحفی وغیرہ کے ہوتے تھے۔ایک نقاد ہے اس کی ایک جماعت ہے جو اس کے پیچھے چل رہی ہے،تو وہ جو کہے گا، یہ لوگ اس کی تعریف کریں گے،اس کے لیے خط لکھیں گے،اس نے کسی اور کے بارے میں کچھ کہا تو CONTROVERSY شروع ہوگی، پھر دونوں طرف کے شاگردوں کی فوجیں آجائیں گی میدان میں۔یہ وہی ہمارا جو چلا آرہا ہے سلسلہ اس روایت کا،اس کی ہے۔

آصف فرخی:

یہ ادب سے زیادہ سیاست ہے اور اس کا اصل مسئلہ POWER ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یہ POWER کا مسئلہ ہے۔یہ LEADERSHIP کا مسئلہ ہے۔

آصف فرخی:

لیڈرشپ کی وہ شکل جو ڈکٹیٹرشپ ہے۔

قرۃ العین حیدر:

بالکل،ڈکٹیٹرشپ کا مسئلہ ہے،لیڈرشپ کا مسئلہ ہے۔اور چونکہ میں نے لیڈری نہ کی نہ مجھے شوق ہے،اس لیے میں بالکل بے نیاز رہی اس چیز سے کہ کوئی مجھے کیا کہتا ہے یا لکھتا ہے،کون کس پارٹی میں ہے،میں کسی پارٹی میں نہیں ہوں،IT HAS NEVER BOTHERED ME، میں نے پرواہ ہی نہیں کی۔مگر لوگ جو ہیں THEY ARE VERY CONCERNED۔وہ سوچتے ہیں کہ ہم نے یہ کتاب لکھی،اس پر لکھا گیا،اس پر یہ ہوا وہ سب یہی کرتے ہیں۔یہ ان کے لیے پاور کا مسئلہ ہے۔

آصف فرخی:

آپ نے بتایا تھا کہ کراچی میں آپ کی ملاقات شیخ ایاز سے بھی ہوئی تھی۔ شیخ ایاز نے اپنی ڈائری میں آپ سے ایک ملاقات کا ذکر کیا ہے کہ وہ "سیتاہرن" کا ترجمہ کرنا چاہتے تھے اور آپ نے معاوضے کا مطالبہ کیا تھا۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ میں نے کہا "کیا دو گے؟"

آصف فرخی:

تو شیخ ایاز اور ان سے ملاقات کے حوالے سے......

قرۃ العین حیدر:

انھوں نے یہ EXACT الفاظ لکھے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ کیونکہ میں اوّل تو اس طرح کسی سے بات نہیں کرتی۔ اتنی بے تکلفی سے اور اس طرح کہ "کیا دو گے؟" اور میں ایسی کاروباری بات نہیں کرتی۔ میرے دماغ میں آتا ہی نہیں کہ میں اس طرح کی بات کروں پیسے کی یا معاوضے کی۔ یہ انھوں نے کس طرح لکھا اور کیوں لکھا، یہ مجھے نہیں معلوم۔ اگر وہ مرحوم زندہ ہوتے تو میں ان سے پوچھتی بہرحال۔ ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ میں نے کوئی بات کسی اور طرح سے کہی اور وہ اس کو کیا سمجھے۔ پھر شاید انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس مسئلے پر بات ہوئی کہ رائلٹی کس طرح لوگ حاصل کرتے ہیں۔ مگر "یہ کیا دو گے" میں نے نہیں کہا۔ THIS IS NOT IN MY CHARACTER، میرے مزاج کے بالکل برخلاف ہے۔

آصف فرخی:

اس جملے کے باوجود بات یہ ہے کہ شیخ ایاز اس کتاب کے بہت مداح تھے۔ انھوں نے کہیں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ واحد ناول ہے جس کو انھوں نے دو مرتبہ پڑھا ہے۔ وہ اس ناول کا سندھی میں ترجمہ بھی کرنا چاہتے تھے۔

قرۃ العین حیدر:

لیکن وہ نہیں کر پائے۔

آصف فرخی:

اس کا پھر ترجمہ دلی رام ولبھ نے کیا جو حال ہی میں دوبارہ شایع ہوا ہے......

قرۃ العین حیدر:

کس نے؟THAT'S AN INTERESTING NAME۔ یہیں رہتے ہیں؟

آصف فرخی:

وہ حیدرآباد میں رہتے ہیں۔ بہت اچھا ترجمہ کیا ہے انھوں نے......

قرۃ العین حیدر:

حیدرآباد: اچھا یہ کتاب مجھے بھی دکھایئے۔

آصف فرخی:

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ترجمہ اس لیے اور بھی اچھا ہوا کہ انھوں نے سیتا کی ساری سچویشن سے IDENTIFY کیا ہو۔

قرۃ العین حیدر:

وہ مسئلہ تو ان کا اپنا ہی ہوا۔ وہ ضرور IDENTIFY کر سکتے ہیں۔ اور یہ میں نے دراصل...... سیتا میر چندانی میں نے دراصل...... میرے دماغ میں کوئی سندھی ہندو لڑکی نہیں تھی۔ اب اگر اس بات کی تفصیل میں بتاؤں گی تو اس کا سارا MYSTIQUE ختم ہو جائے گی، وہ ساری MYTH میں بتائے دیتی ہوں لیکن آپ اس کو ریکارڈ نہ کیجیے۔

آصف فرخی:

وہ لڑکی چاہے کہیں کی بھی ہو لیکن اس کتاب میں سندھ کا جو نقشہ آپ نے کھینچا ہے......

قرۃ العین حیدر:

ہاں تو وہ تو میں چاہتی تھی کہ سندھ کا پورا نقشہ میں لاؤں۔ وہ کبھی آیا نہیں اردو میں۔ تو میں

نے کوشش کی کہ میں وہ سندھ کا نقشہ لاؤں، جو سندھ کی پوری میتھ اور جو سندھ کی ساری چیزیں ہیں، اردو والے واقف ہی نہیں اس سے اور جو ہندو فیکٹر ہے سندھی کلچر کا اور جو MYSTICISM کا فیکٹر ہے، اس کو میں نے کوشش کی ہے اس میں لانے کی۔

آصف فرخی:

اردو والے تو اب تک واقف نہیں ہیں......

قرۃ العین حیدر:

اچھا؟

آصف فرخی:

وہ ایسے کہ اس میں ایک جگہ آپ نے دکھایا ہے کہ عرفان کے سامنے "شاہ جو رسالو" پڑھا جاتا ہے تو وہ بتاتا ہے کہ وہ یہ سب نہیں سمجھ سکتا۔ تو عرفان کراچی کے ایک عام آدمی کی علامت ہے جو اب تک یہ نہیں سمجھ پایا۔

قرۃ العین حیدر:

آج تک؟ کیوں؟

آصف فرخی:

یہ پھر ایک لمبی کہانی ہے۔ یہ میرا انٹرویو بن جائے گا اگر میں اس کا جواب دینے بیٹھ گیا......

قرۃ العین حیدر:

نہیں، مطلب یہ کہ کیا سندھ والوں نے آپ لوگوں کو ACCEPT نہیں کیا؟

آصف فرخی:

شروع میں تو کیا بلکہ اس وقت کیا جب ہر طرف عرفان جیسی سوچ والے لوگ تھے کہ انھیں پتا ہی نہیں تھا کہ سندھ کس چڑیا کا نام ہے۔ کچھ عرصے بعد کلچرل مسئلے کے بجائے ایک سیاسی مسئلہ بن گیا۔ پھر ایک CONFRONTATION ہے، جس کی پوری تاریخ ہے اور جیسا کہ ہوتا ہے، دونوں طرف سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ لیکن اس وقت کہنے کی جو بات ہے کہ اردو ادب نے

زیادہPENETRATE نہیں کیا سندھ اور اس کے مسائل کی تصویر کشی پر اور بات وہاں سے آگے نہیں بڑھی جہاں جہاں سیتا ہرن نے چھوڑا تھا یعنی "سیتا ہرن" نے تو ایک دروازہ کھولا تھا۔ اس دروازے میں پھر کوئی نئی شکل نہیں داخل ہوئی۔

قرۃ العین حیدر:

یعنی سندھی کلچر جو ہے اس میں مہاجر داخل نہیں ہوا؟

آصف فرخی:

نہیں۔ اس میں داخل نہیں ہوا۔

قرۃ العین حیدر:

تو مہاجر کہاں داخل ہوا؟

آصف فرخی:

شاید کہیں بھی نہیں............

قرۃ العین حیدر:

مہاجر بنگال میں اس طرح داخل نہیں ہوا، پنجاب میں داخل نہیں ہوا۔ مہاجر کی اپنی ایک نفسیات ہے......

آصف فرخی:

اس کی اپنی جو نفسیات ہے، اس کا خلاصہ ایک فقرے میں ہے......اوّل تو یہ کہ مہاجر مہاجر ہی رہا، یعنی آج کی جس جنریشن نے ہجرت نہیں کی وہ بھی مہاجر ہے۔ یہ نفسیات END GAMEوالی ہے۔ وہ ایک فقرہ ہے جس کو انتظار حسین نے اپنے ناول کا عنوان بھی بنایا ہے، "آگے سمندر ہے" حالانکہ یہ ناول مجھے زیادہ پسند نہیں ہے لیکن اب ان لوگوں کی پوری صورت حال کا عنوان یہی فقرہ نظر آتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

آپ اس کو ریکارڈ کر رہے ہیں؟ اس کو ریکارڈ کیجیے؟

کی ہی بنائی ہوئی ہے۔'' انھوں نے دریافت کیا'' اگر آپ کلکتہ کے رہنے والے ہیں تو بتائیے کہ کلکتے میں انگریزوں کے زمانے کا اوپیرا ہاؤس کہاں پر ہے؟'' میں نے کہا'' یہ اوپیرا ہاؤس نیو مارکیٹ کے قریب واقع تھا، جہاں اس وقت گلوب سنیما کی نئی عمارت قائم ہے۔ مذکورہ اوپیرا ہاؤس میں پہلے پرانا گلوب سنیما واقع تھا، لیکن اب اسے منہدم کر کے اس جگہ نئی عمارت تعمیر کی گئی ہے۔''

''اچھا یہ بتائیے۔ سندر یا پٹی کہاں پر واقع ہے؟''

''سندر یا پٹی چیت پور روڈ پر ناخدا مسجد کے قریب ایک محلے کا نام ہے جو آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔''

میں صاف سمجھ گیا کہ وہ یہ ساری معلومات اپنے مجوزہ ناول 'گردشِ رنگ چمن' کے لیے جمع کر رہی ہیں۔ میں نے کہا'' آپ کلکتہ کیوں نہیں چلی جاتیں؟ آپ کو ساری باتیں معلوم ہو جائیں گی۔''

''میں کلکتہ گئی تھی لیکن کلکتہ اس قدر بدل چکا ہے کہ قدیم کلکتے کے بہت کم آثار باقی رہ گئے ہیں جس کی وجہ سے مجھے قدیم کلکتے کے بارے میں ریسرچ کرنا پڑی۔'' میں نے ان سے کہا ''آپ اگر اپنا ناول پہلے پاکستان میں اور بعد میں ہندستان میں چھپوائیں تو مناسب رہے گا ورنہ پاکستان میں جعلی ایڈیشن شایع ہو جائے گا۔'' انھوں نے کہا'' جی ہاں میرا بھی یہی ارادہ ہے۔ میرا ناول پہلے پاکستان میں ہی شایع ہوگا۔''

میں نے موقع غنیمت جان کر اپنا ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا جو میرے شانے سے جھول رہا تھا۔ عینی صاحبہ نے دیکھا اور دریافت کیا'' آپ ٹیپ کیوں کر رہے ہیں؟''

''اس لیے کہ میں جب ہندستان کا سفر نامہ لکھوں تو ساری باتیں یاد رہیں۔'' انھوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

شہزاد منظر:

جدیدیت کے رجحان کے بارے میں آپ کی رائے ہے؟

قرۃ العین حیدر:

میں تو ہمیشہ سے اس کے خلاف رہی ہوں۔ جدیدیت کے نام پر یہاں جو کچھ ہوا، بہت غلط ہوا۔ بہت بُرا ہوا۔ اب خود ان لوگوں نے مان لیا ہے کہ ہم انتہا پر پہنچ گئے تھے۔

شہزاد منظر:

ہندستان میں لکھے جانے والے علامتی افسانے کے بارے میں کچھ بتائیے۔

قرۃ العین حیدر:

کچھ اچھے لکھے گئے ہیں اور کچھ بہت خراب لکھے گئے ہیں۔

شہزاد منظر:

کیا آپ نے ان علامتی افسانوں کی اسٹڈی کی ہے؟

قرۃ العین حیدر:

میں اسٹڈی کروں گی؟ اتنے خراب افسانوں کی؟

شہزاد منظر:

یہاں جو اچھے علامتی افسانے لکھے گئے ہیں۔ کیا آپ ان کے نام بتا سکتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

جی نہیں، میں نام وام نہیں بتا سکتی ہوں۔

شہزاد منظر:

علامتی افسانوں کے علاوہ بھی یہاں کلاسیکی طرز کے افسانے لکھے جار ہے ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کچھ کہیں گی؟

قرۃ العین حیدر:

بعض روایتی افسانے بھی اچھے لکھے گئے ہیں، لیکن یہاں معاملہ کچھ کمزور ہے۔ یہاں اچھے رسالے نہیں ہیں۔

شہزاد منظر:

کیا آپ نے انتظار حسین کا ناول ''بستی'' پڑھا ہے؟ کیسا لگا؟

قرۃ العین حیدر:

ٹھیک ہے۔

شہزاد منظر:

صرف ٹھیک ہے۔ کہنا کیا کافی ہوگا؟ آپ اسکیپ کر رہی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

اچھا نہیں تھا۔

شہزاد منظر:

کیا کمزور تھا؟

قرۃ العین حیدر:

ان کا کینوس بہت محدود ہو گیا ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو ڈبائی کو یاد کرتے ہیں۔ ڈبائی سے چلتے ہیں۔ پاکستان پہنچتے ہیں۔ ان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوہرا رہے ہیں۔

شہزاد منظر:

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ بھی اپنے آپ کو دوہرا رہی ہیں۔ آپ کے آئندہ ناول کے بارے میں تو نہیں معلوم لیکن آپ کی کئی کہانیاں ایسی ہیں اور ناول میں کئی واقعات ایسے ہیں جو آپ کے سابقہ افسانے سے ملتے جلتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

ایسا ہوگا۔ مجھے تو پتا نہیں ہے۔ انسان اپنی کمزوری کو تو نہیں جانتا ہے نا۔ کوئی دوسرا بتائے گا تو معلوم ہوگا۔ جہاں تک ریپیٹ کرنے کا سوال ہے۔ تو ہم ضرور کر رہے ہوں گے۔ میں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ میں عقل کل ہوں۔ میں نے ہمہ دانی کا تو دعویٰ نہیں کیا۔ انسان اچھا بھی لکھتا ہے، برا بھی لکھتا ہے۔ ہر طرح کی چیز لکھتا ہے۔

شہزاد منظر:

جہاں تک ریپیٹ کرنے کا سوال ہے بعض ایسے واقعات ہوتے ہیں جن کا بار بار ذکر آتا ہے۔ مثلاً تقسیم کا واقعہ یا ہجرت کا واقعہ۔ مصنف جب بھی کوئی کہانی یا ناول لکھے گا اس کا بار بار ذکر کرے گا۔ اس کو اپنے آپ کو دوہرانا کہنا درست نہیں ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اس جنریشن والے تو برابر لکھیں گے، مثلاً دیکھیے کہ خدیجہ مستور بھی یہی لکھ رہی ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں ''آنگن'' میں بھی ہجرت ہے اور ''زمین'' میں بھی وہی معاملہ ہے۔ ایک جنریشن تھی یورپ کے رائٹرز کی۔ وہ جنگ کو نہیں بھول سکتی۔ فسادات برابر ہو رہے ہیں۔ لوگ اس بارے میں لکھتے نہیں ہیں۔ اتنے بے حس ہو گئے ہیں کہ لکھتے ہی نہیں ہیں، لیکن میں لکھ رہی ہوں اس کے بارے میں۔ ابھی میں نے لکھا تھا اس بارے میں عالم آشوب۔ اس کا عنوان تھا ''قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے''

شہزاد منظر:

وہ افسانہ آپ کے عام افسانوں سے مختلف تھا۔

قرۃ العین حیدر:

وہ افسانہ ہے ہی نہیں۔ وہ تو عالم آشوب ہے۔

شہزاد منظر:

عالم آشوب تو ہے لیکن آپ اسے کس صنف میں رکھیں گی؟

قرۃ العین حیدر:

''بس میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ یہ عالم آشوب ہے''

شہزاد منظر:

''بعض اوقات مصنف جو کچھ لکھتا ہے اس کا کوئی فارم نہیں ہوتا۔ مصنف کو کچھ کہنا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ مخصوص صنف میں ہی لکھے۔

قرۃ العین حیدر:

مگر اس کے اندر انٹرنل یونیٹی تو ہے"

شہزاد منظر:

ہم چند افسانہ نگار دوستوں کا خیال ہے کہ یہ افسانہ ہے ہی نہیں اور اگر اسے افسانہ مان لیا جائے تو بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں آپ نے بالکل نئی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ اس کے الگ الگ حصے ہیں، جسے آپ نے آپس میں جوڑ دیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

بھئی اس کو جو انٹرنل چیز ہے۔ اس سے مرثیہ نکلتا ہے وہ مرثیے سے پورے طور پر بندھا رہتا ہے۔

شہزاد منظر:

آپ نے جدیدیوں کے لیے بڑی اچھی چیز پیش کر دی ہے۔ وہ یہ کہیں گے، دیکھو یہ ہوتا ہے افسانہ۔ دیکھو اس میں افسانویت نہیں ہے۔ آپ نے فسادات پر لکھے ہوئے افسانوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ کون سے افسانے ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

زیر بحث افسانے میں فسادات کا ذکر ہے۔ میرے بہت سے افسانے ہیں، جن میں فسادات کا ذکر ہے۔ میرے چار ناولٹوں کے مجموعہ میں ایک ناولٹ ہے جس میں حالیہ فسادات کا ذکر ہے۔

شہزاد منظر:

میں جب مشرقی پاکستان میں تھا تو میں نے آپ کا ناولٹ ہاؤسنگ سوسائٹی پڑھا تھا۔ اس کے بارے میں میں نے تفصیلی نوٹس بھی لیا تھا۔ میں جب تک مشرقی پاکستان میں تھا مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا کہ مغربی پاکستان کا معاشرہ کیسا ہے؟ مجھے مغربی پاکستان آ کر محسوس ہوا کہ آپ نے اپنے اس افسانے میں پاکستان کے جس نو دولتیہ طبقہ کی تصویر کشی کی ہے وہ ہو بہو ویسا ہی

ہے۔جیسا کہ آپ نے ہاؤسنگ سوسائٹی میں دکھایا ہے۔آپ نے اس طبقے کو جس طرح اکسپوز کیا ہے وہ کمال کا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اب تو یہ نودولتیہ طبقہ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا ہے۔ پہلے اگر ایسے لوگ دس فیصد تھے تو اب بڑھ کر سوگنا ہو گئے ہیں۔کاریں، بنگلے اور پیسہ اور پیسہ اور فارن گڈس۔ فارن، فارن، فارن، ہر چیز فارن، یہاں بھی اس قسم کے لوگ ہیں۔ایسا طبقہ موجود ہے میں نے اس بارے میں بھی لکھا ہے پاکستان میں کچھ سمجھ دار لوگ ہیں جو سمجھ رہے ہیں کہ معاشرے میں صرف زر کی پرستش کی جارہی ہے۔انھیں اس کا افسوس ہے۔

شہزاد منظر:

آپ کا مشرقی پاکستان (حالیہ بنگلہ دیش) کے بارے میں اسٹڈی بہت گہری معلوم ہوتی ہے۔خصوصاً "چائے کے باغ" کے مطالعے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

یہ ناولٹ بھی اسی مسئلے پر ہے جو آج کل آسام میں لینڈ لیس لیبر کا مسئلہ ہے۔

شہزاد منظر:

اچھا یہ بتائیے کہ آپ کے ناولٹ 'سیتاہرن' کی ہیروئن کا کردار کیا سچا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

'سیتا ہرن' کا کردار ایک حد تک اصلی ہے۔ وہ خاتون یورپ میں ہے۔ میں نے اسے سندھی بنایا ہے، لیکن وہ پنجابی تھیں۔ میریڈ ٹو اے مسلم۔ میں نے پس منظر بدل دیا ہے۔

شہزاد منظر:

کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ کے سارے افسانوں میں آپ کے تین پسندیدہ افسانے کون کون سے ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

''سب سے پہلے تو میں آپ کو بتادوں کہ میں اپنے افسانوں کے بارے میں (اور جو کچھ لکھتی ہوں) اس کے بارے میں نہ سوچتی ہوں، نہ اس کا تذکرہ کرتی ہوں اور نہ اس کو اپنے اوپر لادے رہتی ہوں۔ بعض رائٹر ہمہ وقت اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ ''ہم ادیب ہیں''۔ مجھے تو یاد بھی نہیں کہ میں نے کیا کیا لکھا ہے۔

شہزاد منظر:

اپنے ناولوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتائیں گی کہ چار ناولوں میں سے آپ کو کون سے ناول پسند ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

''آخر شب کے ہم سفر'' اور یہ ناول جواب لکھا ہے یعنی ''گردش رنگ چمن''

شہزاد منظر:

وہ کیا حالات تھے جن کی وجہ سے آپ کو پاکستان چھوڑنا پڑا؟ بعض حلقوں کا خیال ہے کہ 'آگ کا دریا' نظریہ پاکستان کے خلاف ہے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

قرۃ العین حیدر:

''اعتراض کرنے والے احمق ہیں۔ اس ناول میں پاکستان کے حق میں سب سے بڑا پوائنٹ یہ بنتا ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کو نوکریاں نہیں ملتی ہیں تو وہ پاکستان چلے جاتے ہیں۔ ان کی عقل میں یہ بات کیوں نہیں آتی ہے؟ اس زمانے میں ہر نوجوان، جسے نوکری نہیں ملتی تھی، پاکستان چلا جاتا تھا۔ اب تو کوئی پاکستان نہیں جاتا۔ اب لوگ مڈل ایسٹ جاتے ہیں یا یورپ وامریکہ۔ اس زمانے میں نوکری نہیں ملی۔ پاکستان جارہے ہیں۔ یہ ہر ایک کا مسئلہ تھا۔

شہزاد منظر:

آپ کے خیال میں ''آگ کا دریا'' کے خلاف مہم کی اصل وجہ کیا تھی؟

قرۃ العین حیدر:

میرے خیال میں وجہ غیر اہم اور معمولی سی ہے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ایک صاحب تھے سراج رضوی۔ اس وقت بریگیڈیئر گلزار مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہو گئے تھے۔ کتاب چھپ چکی تھی۔ کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ لوگ پڑھ رہے تھے۔ چھپے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ رضوی صاحب کو یہ خیال آیا...... رضوی صاحب لینڈ کا الاٹمنٹ چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بریگیڈیئر گلزار کی گڈ بکس میں آ جائیں، سر میں نے ایک اینٹی پاکستان چیز پکڑ لی ہے۔ میں اسے پیش کر رہا ہوں۔ انھوں نے راتوں رات مضمون لکھ ڈالا۔ یہ مضمون دو جگہ چھپا۔ اس کے بعد انھوں نے بریگیڈیئر گلزار کو پیش کیا اور ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ وہ دراصل گلزار سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ یہ بات مجھے پانچ چھ سال ہوئے ان کے بہت قریبی آدمی نے بتائی ہے۔ ان کا مقصد اس طرح بریگیڈیئر گلزار کے قریب پہنچنا تھا۔

شہزاد منظر:

اس کے بعد اخبارات میں اعتراضات شائع ہوئے، خصوصاً ''جنگ'' اور ''نوائے وقت'' میں......

قرۃ العین حیدر:

یہ انھوں نے ہی کیے۔ مضمون تو صرف ایک ہی آیا۔ اس میں غلط سلط باتیں لکھی تھیں مثلاً کہ مصنفہ ڈاکٹر رشید جہاں کی خالہ زاد بہن ہیں۔

شہزاد منظر:

اس کے بعد تو صاحب ''جنگ'' اور ''نوائے وقت'' میں آپ کے خلاف مہم شروع ہو گئی۔

قرۃ العین حیدر:

اتنی زبردست مہم تھی تو وہ کتاب اتنی مقبول کیوں ہوئی؟ آج تک یہ ناول پاکستان میں ٹاپ بیسٹ سیلر کیوں ہے؟...... کیوں؟ جب وہ اتنی بری کتاب ہے۔ اینٹی پاکستان ناول ہے تو اسے پڑھایا کیوں جاتا ہے؟ لوگ پڑھ کیوں رہے ہیں؟ بعض کمپلیکس زدہ لوگ ہوتے ہیں۔

میں ان کے لیے کیا کروں؟ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ دیکھیے جو جینوئن رائٹر ہوتا ہے وہ اس قسم کے نقاد کی پرواہ نہیں کرتا ہے۔ ان کو بھی تو کچھ لکھنا ہے نا! انھیں اپنی دکان چمکانے کے لیے برابر کچھ نہ کچھ لکھنا ہے۔ لکھیں گے نہیں تو کیا کریں گے۔ نقاد ہیں! اگر نقاد متعصب ہے یا پاکستان اور اسلام کے بارے میں اس کا مخصوص نقطہ نظر ہے تو پاکستان زندہ باد' 'اسلام زندہ باد'' کرے گا اور اسی کے مطابق لکھے گا۔ میرے خیال میں نقاد بہت کم غیر جانبدار ہوتے ہیں یا تو ان کی جانب داری ہوتی ہے اپنے نظریات سے یا پھر وہ جس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس سے یا پھر تعریف کرنے آئیں گے تو زمین و آسمان کے قلابے ملا دیں گے۔ اردو میں متوازن تنقید بہت کم لکھی گئی ہے۔

ہندستان میں اردو کے جو بڑے بڑے قسم کے ترقی پسند نقاد ہیں وہ میرے ناول ''آخر شب کے ہم سفر'' سے بہت خفا ہیں۔ میں نے اس میں جن لوگوں کو اکسپوز کیا ہے وہ بالکل صحیح کیا ہے۔ میں نے اس میں صرف ایک دو آدمیوں کو اکسپوز کیا ہے۔ سب کو تھوڑے ہی کیا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ کیمونسٹ پارٹی کے بعض لوگ ایسے تھے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ یہاں کیمونسٹ تحریک ختم ہو چکی ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جو بڑے بڑے کیمونسٹ لیڈر تھے وہ اسٹیبلشمینٹ میں شامل ہیں۔ اگر میں نے اصلیت ظاہر کر دی ہے تو وہ کیوں چڑھتے ہیں۔ اسی کتاب کو روس نے ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ کیوں شائع کیا ہے؟

شہزاد منظر:

آپ تو بنگلہ زبان سے واقف نہیں ہیں؟ آپ نے وہاں کی تہذیب، وہاں کی تاریخ اور وہاں کے عوام کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ کیسے لکھا؟ کیا اس بارے میں آپ نے ریسرچ کیا تھا؟

قرۃ العین حیدر:

ظاہر ہے۔ ریسرچ کے بغیر میں کس طرح لکھ سکتی تھی۔ میں ایسٹ پاکستان جاتی رہتی تھی۔ وہاں کی تہذیب اور معاشرت سے واقف تھی۔ مجھے ایسٹ پاکستان، بنگلہ دیش بے انتہا پسند ہے۔ وہاں کی ہر چیز مجھے اچھی لگتی ہے۔ میں جب کوئی ناول لکھتی ہوں تو پہلے اس کے بیک گراونڈ

کے بارے میں ریسرچ کرتی ہوں۔ میں ناول نگار کے ساتھ ساتھ جرنلسٹ بھی ہوں۔ میں جس چیز کو دیکھتی ہوں اس میں میرا جرنلسٹ پوائنٹ آف دویو بھی ہوتا ہے۔ اس کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ پھر میرے لکھنے میں کام آتا ہے۔

شہزاد منظر:

آپ میں راجندر سنگھ بیدی کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہوں گا، آپ ان سے مل چکی ہوں گی۔ ان کے افسانے بھی پڑھ چکی ہوں گی۔ اگر آپ ان کی شخصیت اور فن کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالیں تو بڑا کرم ہوگا۔

قرۃ العین حیدر:

وہ بڑے باغ و بہار آدمی تھے ان میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بہت ہی درد مند دل رکھتے تھے۔ وہ جذباتی آدمی تھے اور بے انتہا خوش مزاج۔ ان کی دو باتیں آؤٹ اسٹینڈنگ تھیں۔ ایک یہ کہ وہ بہت جذباتی تھے اور ذرا سی بات پر رونے لگتے تھے۔ وہ بہت دلچسپ آدمی تھے۔ لطیفے خوب بیان کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ سنجیدہ بھی تھے۔ ان کے افسانوں کے بارے میں اتنا لکھا گیا ہے کہ کہنے کے لیے میرے پاس کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وہ اس کے بارے میں مختلف زاویے سے لکھتے تھے۔ اردو میں ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ افسانے میں دیہات کو پیش کرنے کا رجحان شروع ہوا۔ اس سے پہلے پریم چند نے اسے شروع کیا۔ ہمارے ہاں جو رومانٹک رائٹرز تھے، انھوں نے خیالی قسم کی کچھ چیزیں لکھیں۔ وہ اپر مڈل کلاس کے بارے میں لکھتے تھے۔ میں بات کر رہی ہوں پریم چند کے معاصرین کی۔ ان کی ہیروئنیں بڑی پارسا ہوتی تھیں۔ زیادہ تر ہیرو علی گڑھ کے پڑھے ہوئے ہوتے تھے۔ افسانے بہت کمزور تھے۔ اس وقت ہمارا فکشن بہت ہی ضعیف تھا۔ سب سے پہلے پریم چند نے ریئلزم شروع کی۔

ریئلزم میں انھوں نے یو پی کو پیش کیا۔ وہ بھی یو پی کے دیہات کو۔ یو پی کی جوار بن کلاس تھی، وہ اس سے زیادہ واقف نہیں تھے۔ ان کے افسانوں میں ٹھٹ ٹائپ کے کیریکٹر آتے ہیں۔ دیہات ان کا خاص میدان تھا یا پھر یو پی کا لور مڈل کلاس بیدی اور کرشن چندر نے پہلی بار اور ان

سے کچھ پہلے سدرشن نے پنجاب کی لور مڈل کلاس کی ہندو لائف پیش کی۔ اس کے بعد دو طرح کے افسانے لکھے گئے۔ کرشن کے ہاں ایک قسم کی لیریکل رومانٹی سزم تھی اور بیدی کے ہاں ایک خاص قسم کی حقیقت نگاری۔ جس کے آخر میں متھیکل عنصر بڑھ گیا تھا۔ انھوں نے سکھوں کی دیہی زندگی کو پیش کیا۔ بلونت سنگھ نے بھی سکھوں کی زندگی کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا تھا۔ بلونت سنگھ ہمارا اتنا اچھا افسانہ نگار تھا۔ اسے وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کا وہ مستحق تھا۔ عجیب بات ہے۔ بیدی صاحب نے اپنے ناول ''ایک چادر میلی سی'' میں جو زندگی دکھائی ہے (جس کا بڑا تذکرہ کیا گیا ہے) ڈیپرڈاؤن یوکین سی اے سرٹن کا سنڈ آف سیڈنیس۔ ان کے ہاں ایک خاص قسم کی اداسی اور ایک خاص قسم کی گہرائی ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بیدی نے مجھ کو کبھی گریپ میں نہیں لیا۔ جیسا کہ ان کی رائٹنگ نے دوسرے لوگوں کو لیا۔ میں نے ہمیشہ ان کو اس لحاظ سے پڑھا ہے کہ وہ ایک اہم رائٹر ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کی کہانیاں طویل بہت ہوتی تھیں اور دوسرے یہ کہ ان کے اندر ڈرائی نیس آجاتی تھی۔ آخری زمانے میں وہ جنسیات کے بارے میں بہت لکھنے لگے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ بہت زیادہ اس مضمون میں پری اکوپائیڈ ہیں اور ان کی جو ذاتی زندگی تھی ان کے افسانوں میں اس کی جھلکیاں بہت ملتی تھی۔ وہ بہت ڈسٹرب تھے اپنے چند معاملات کی وجہ سے۔ وہ چیز ان کے افسانوں میں آجاتی تھی۔ آخری دنوں میں وہ ٹرانسپرنٹ ہو گئے تھے۔ ان کی جو جذباتی زندگی تھی یا جو مسائل تھے وہ ان کے انسانوں میں آگئے تھے۔ جیسا کہ ان کی کہانی کے بارے میں ہے ''ایک باپ بکاؤ'' اسی قسم کا ایک افسانہ تھا۔ صرف ایک سگریٹ'' یہ سب ان کے گھریلو زندگی کی بے چینیاں تھیں۔ وہ اس کو لبریٹ کرتے تھے۔ وہ لبریشن حاصل کرنے کے لیے افسانے لکھتے تھے اور لبریشن حاصل کرنے کے لیے انسان جس طریقے سے سائیکو انالسٹ کے پاس جاتا ہے اسی طرح وہ بیٹھ کر لکھنا شروع کر دیتے تھے وہ بہت عمدہ انسان تھے، بہت اچھے رائٹر تھے۔ ان کی جو اہمیت ہے اس کے بارے میں نقاد بہت کچھ لکھ رہے ہیں اور لکھتے رہیں گے۔ ان کے اندر ہومن سچویشن تھا۔ جسے کہتے ہیں انسانی صورت حال۔ ہیومن کنڈیشن کے لیے وہ ان کی دردمندی خاص چیز تھی۔ اس کا انھیں بہت دکھ تھا۔ وہ دکھی

تھے۔ وہ اتنے دکھی تھے کہ وہ واقعی رو پڑتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ خوش رہتے تھے۔

شہزاد منظر:

اردو کے اور دو افسانہ نگار ہیں۔ منٹو اور کرشن چندر۔ ان دونوں سے اگر آپ بیدی جی کا موازنہ کریں؟

قرۃ العین حیدر:

"آپ لوگ یہ موازنہ انیس و دبیر کیوں کرتے ہیں؟ اردو میں ایسا کیوں ہوتا ہے؟ آپ دنیا کے کسی ملک اور زبان کے ادب میں دیکھیے۔ کہیں پہ یہ نہیں ہوتا ہے کہ ہیمنگ وے کا مقابلہ اشٹین بیک سے کر رہے ہیں۔ ایلیٹ کا مقابلہ پاؤنڈ سے کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ہر رائٹر کی اپنی جگہ ہے۔ اس کی اپنی خصوصیات ہیں۔ اس کی اپنی اہمیت ہے، اس کا آپ مقابلہ کیوں کرتے ہیں؟ یہ کوئی کھیل کا میدان ہے؟ یہ کرکٹ کے کھلاڑی ہیں یا یہ کوئی فلم اسٹار ہیں یا دلیپ کمار کا مقابلہ کر رہے ہیں راج کپور سے؟ منٹو کا مقابلہ کیجیے فلانے سے۔ یہ غلط چیز ہے۔ منٹو اپنی جگہ ہے۔ اس کی اپنی خصوصیات ہیں۔ کرشن کی اپنی ہیں۔ بیدی کی اپنی ہیں۔ عصمت چغتائی کی اپنی ہیں۔ مقابلے کا کیا سوال ہے؟

شہزاد منظر:

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فنی اعتبار سے یہ تینوں ہمارے بہت اہم لکھنے والے ہیں۔ کرشن چندر اور منٹو کے بعض افسانے انتہائی کمزور ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

میرے خیال میں افسانے کی جو فٹ مین شپ ہے وہ منٹو کی ہے۔ یہ مانی ہوئی بات ہے۔ میں کوئی نئی بات نہیں کہہ رہی ہوں۔ سب ہی کہتے ہیں۔ کرشن چندر کے بارے میں کوئی ایسی نئی بات نہیں ہے جو میں آپ کو بتاؤں۔ جو آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میری بھی رائے وہی ہے کہ کرشن چندر نے بعض افسانے بہت اچھے لکھے ہیں۔ شروع کے افسانے بہت اچھے ہیں۔ بعض افسانے بہت کمزور ہیں۔ یہ دیکھیے۔ لتا منگیشکر کو لے لیجیے۔ لتا منگیشکر نے کئی ہزار گانے

گائے ہیں۔اس کی آواز یا فن میں کسی کو کوئی شبہ نہیں ہے۔لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کے جو پہلے کے گانے تھے وہ بہت اچھے تھے اب اس نے اتنا گایا، اتنا گایا کہ اب ان میں وہ بات نہیں رہی۔کرشن چندر کے فن میں ان کی جو خصوصیات تھیں اس میں کسی کو کلام نہیں ہے، لیکن انھوں نے اتنا ریپیٹ کیا کہ ان کی بعض کہانیاں بالکل جرنلزم بن گئیں۔ وہ افسانہ نہیں ہے بلکہ ایک جرنلسٹک پیس ہے۔میرے خیال میں وہ طنز زیادہ اچھا لکھنے لگے تھے۔مطلب یہ کہ ان کی جو طنزیہ تحریریں تھیں، وہ بہت اچھی تھیں۔مگر وہ بسیار نویسی کے شکار ہو گئے۔اگر کم لکھتے تو بہت اچھے افسانہ نگار ہوتے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بہت زیادہ لکھ کر بھی اچھا لکھتے ہیں۔ان کا ٹاپک بالکل روزمرہ کا ہوتا تھا۔ان کا اسٹائل اتنا اچھا تھا کہ وہ معمولی سی بات سے بھی بات بنا لیتے تھے اور لطف آجاتا تھا۔کرشن چندر تو تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔ بیدی کم لکھتے تھے اور ان کا اپروچ بالکل الگ تھا۔

شہزاد منظر:

اب میں آپ کے فن کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں، محض تفہیم کی غرض سے۔آپ تو بہت عرصے سے لکھ رہی ہیں۔میں آپ کو ''ساقی'' میں اس وقت سے پڑھ رہا ہوں جب آپ کے افسانوں کا مجموعہ ''ستاروں سے آگے'' شایع نہیں ہوا تھا۔آپ کی افسانہ نگاری اور آپ کی زندگی کے کئی ادوار ہیں......

قرۃ العین حیدر:

مجھے اپنے ادوار کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔

شہزاد منظر:

یہ تو ہم لوگ جانتے ہیں نا۔جو آپ کے قاری ہیں۔ پڑھتے ہوئے معلوم ہو جاتا ہے:

قرۃ العین حیدر:

اچھا، تو ادوار ہیں؟

شہزاد منظر:

آپ کے بارے میں یہ جو کہا جاتا ہے کہ آپ ورجینیا وولف سے متاثر ہیں۔ یہ خیال

کہاں تک درست ہے؟

شہزاد منظر:

اوہ! گوڈ۔ ورجیناوولف سے میرا پیچھا نہیں چھٹتا ہے......۔

شہزاد منظر:

اسی لیے تو میں چاہ رہا تھا کہ اس بارے میں آپ سے براہ راست معلوم کروں۔ ناقدین کیا کہتے ہیں؟ اس کی اہمیت نہیں ہے۔ تخلیق کار کیا کہتا ہے ان کی اہمیت ہے۔

قرۃ العین حیدر:

صاحب! کہاں تک ورجینا وولف کے بارے میں باتیں کروں؟ آپ جب لکھنے کے لیے بیٹھتے ہیں تو دماغ میں جو آیا لکھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کام بچہ بھی کرتا ہے۔ یہی میں نے بھی کیا تھا۔ بھئی، خدا کے لیے پیچھا چھوڑیے۔ جو افسانے میں نے سولہ سترہ سال کی عمر میں لکھے لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ صاحب، آپ نے ورجیناوولف کو پڑھا؟ کہاں میں اور کہاں ورجیناوولف؟

شہزاد منظر:

'آگ کا دریا' میں بعض جگہ ایسا اسٹائل ہے اور ایسی تکنیک استعمال ہوئی ہے جس سے لوگوں کو گمان ہوتا ہے کہ......

قرۃ العین حیدر:

کیا افسانے لکھتے وقت انسان سامنے نسخہ رکھ لیتا ہے؟ یا سامنے پانچ چھ کتابیں رکھ لیتا ہے؟ آپ بھی تو لکھتے ہوں گے۔ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟ ایک یہ موازنہ انیس و دبیر اور دوسرا افلاں تکنیک آپ نے وہاں سے لی ہے۔ یہاں سے لی ہے؟

شہزاد منظر:

مغربی ادیبوں میں کون کون سے ایسے ادیب ہیں جنھیں آپ پسند کرتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

بے شمار ہیں۔ میں کن کن کا نام لوں؟

شہزاد منظر:

بس یہی۔ ایک دو۔ تین ادیب، زیادہ نہیں، جنھیں آپ سب سے زیادہ پسند کرتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

پہلے جو پسند تھے، اب پسند نہیں ہے۔ بہت دنوں سے تو میں نے کچھ پڑھا ہی نہیں۔

شہزاد منظر:

آپ نے پہلے جن ادیبوں کو پڑھا تھا ان کے بارے میں ہی بتا دیجیے۔

قرۃ العین حیدر:

گراہم گرین پسند ہے۔ فوسٹر پسند ہے۔ ہیمنگوے پسند ہے۔ اسٹین بیک پسند ہے۔ ورجینا وولف پسند ہے۔ بے شمار پسند ہیں، کیا بتاؤں؟

شہزاد منظر:

اچھا یہ بتایئے۔ پاکستان میں تو آپ کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا تھا، لیکن آپ کے پاکستان سے آنے کی اصل وجہ کیا ہے؟ معاف کیجیے گا۔ میں پھر فرسودہ سوال کر رہا ہوں۔ دراصل آپ جب پاکستان چھوڑ کر ہندستان آئیں اس وقت میں ہندستان میں تھا۔ مجھے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ میں محض شوق و جستجو میں آپ سے دریافت کر رہا ہوں۔

قرۃ العین حیدر:

اگر میں پاکستان سے آگئی تو کون سا ایسا جرم کیا یا عالمی سانحہ رونما ہو گیا؟ جو شخص بھی وہاں سے آتا ہے۔ مجھ سے یہی سوال کرتا ہے۔ آپ یہاں سے چلے گئے تو کیا کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ کیوں آگئے۔

شہزاد منظر:

میں تو ان کو بتاؤں گا کہ میں نے ہندستان کیوں ترک کیا؟

قرۃ العین حیدر:

ارے بھئی میرا دل چاہا اور میں چلی آئی۔

شہزاد منظر:

میں نے سنا ہے کہ آپ کو وہاں بہت ذہنی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ جس کی وجہ سے آپ چلی آئیں۔

قرۃ العین حیدر:

کس نے مجھے ٹارچر کیا؟ کوئی ٹارچر نہیں تھا۔ میں تو وہاں سے ہندستان نہیں آئی۔ میں تو انگلستان گئی تھی۔ چاہتی تو انگلستان میں رہ جاتی۔

شہزاد منظر:

کیا کوئی وجہ نہیں تھی؟ جس کے باعث آپ ہندستان چلی آئیں۔

قرۃ العین حیدر:

"لوگ بھاگ بھاگ کر انگلستان جا رہے ہیں۔ پاکستان سے لاکھوں کی تعداد میں لوگ انگلستان میں جا کر رہ جاتے ہیں ان سے کوئی کیوں نہیں پوچھتا کہ کیوں چلے گئے ہو؟ اس سے حب الوطنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

شہزاد منظر:

آپ نے اچھا سوال کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں، آپ مجھے بتائیے۔ آپ پاکستان سے چلے گئے اور وہاں ڈش واشنگ کر رہے ہیں۔ وہاں جھاڑو دے رہے ہیں۔ وہاں سے انھیں ذلیل کر کے بھگا رہے ہیں۔ پھر بھی وہاں گھسے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے کوئی نہیں کہتا کہ پاکستان کے لیے بُرا ہوا۔ بھئی میں تو اپنے ملک واپس آئی ہوں۔

(شہزاد منظر مرحوم نے 1991 میں جب یہ انٹرویو میرے حوالے کیا تھا تو اس وقت تک غیر مطبوعہ تھا۔ بعد میں یہ مختلف رسائل میں شائع ہوا۔)

عام آدمی میرا موضوع کبھی نہیں رہا

گفتگو : پرویز احمد

پرویز احمد:

آپ کا پہلا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' تھا، اس کے بعد ''آگ کا دریا'' سے لے کر ''چاندنی بیگم'' تک آپ نے ایک لمبا سفر طے کیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہیں تو کیسا لگتا ہے۔

عینی:

اب اور تب میں بہت کچھ بدل گیا ہے۔ شہر بدل گئے۔ زندگی کے انداز بدل گئے۔ خیالات بدل گئے، لباس بدل گئے۔ سب کچھ بدل گیا۔

پرویز:

ان تبدیلیوں کو کس طرح لیتی ہیں آپ؟

عینی:

تبدیلی تو زندگی کی نشانی ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

پرویز:

لیکن عام طور پر لوگ اپنے زمانے کے دیوانے ہوتے ہیں۔ نئے زمانے کو پسند نہیں کرتے۔

عینی:

انسان بنیادی طور پر ناسٹلجک ہوتا ہے۔ آپ کو بھی اپنے کالج کے زمانے کے دوستوں سے مل کر خوشی ہوتی ہی ہوگی۔ ہمیں بھی پرانے ساتھیوں سے مل کر اچھا لگتا ہے۔ اب آج جو ماحول ہے ملک میں۔ چاروں طرف خون خرابہ افراتفری، اسے دیکھ کر تو ہمیں اپنا زمانہ یاد آتا ہی ہے۔

پرویز:

آپ نے تو ہم سے بھی زیادہ دردناک منظر دیکھا ہے میرا مطلب بٹوارے کے وقت سے ہے۔

عینی:

ہاں! وہ ایک بہت بڑا حادثہ تھا جس نے بے حد تکلیف دی۔ لیکن آج کی مارکاٹ تو روزمرہ کی چیز ہوگئی ہے۔

پرویز:

آپ کو کیا لگتا ہے۔ کون ہے اس کا ذمہ دار؟

عینی:

صرف ایک شخص جس کا نام ہے سیاست داں۔ یہ نیتا ہی اپنی کرسی کے لیے سب کچھ کرا رہا ہے۔ تقریروں اور کانفرنسوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ پالیسی ہی سب کچھ ہوتی ہیں اور وہ حکومت وقت کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ روس کی مثال لے سکتے ہیں۔ ایک اکیلے گورباچوف نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔

پرویز:

کیا روس میں جو کچھ ہو رہا ہے سہی ہو رہا ہے؟

عینی:

میرے کہنے سے کوئی چیز سہی یا غلط نہیں ہو جائے گی۔ وہاں کا سماج اگر اسے قبول کر رہا ہے تو اس کا مطلب ہے اسے تبدیلی کی ضرورت تھی۔

پرویز:

ان تبدیلیوں کو دیکھ کر آپ کو لگتا ہے کہ بالشوک انقلاب ناکام ہو گیا ہے؟

عینی:

پتہ نہیں بھئی۔ میں خود گئی تھی روس تو مجھے لگا تھا کہ سچ مچ اس نظریے نے ایک نیا انسان ڈھال لیا ہے۔ روسیوں سے بات چیت میں اگر رشوت یا پگڑی جیسے لفظ زبان سے نکل جاتے تھے تو انھیں سمجھانا پڑتا تھا کہ رشوت کیا ہوتی ہے اور پگڑی کسے کہتے ہیں۔ لیکن گورباچوف نے جیسے ہی مٹھی کھولی پتا لگا کہ انسان تو ویسے کا ویسا ہے۔ یعنی 73 سالوں کی کمیونزم نے اس پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔

پرویز:

اب تک ساری دنیا کے لیے سماج وادی نظام ہی آدرش ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ آدرش نہیں رہا۔ آپ کیا سوچتی ہیں، سماج کو کیا ہونا چاہیے؟

عینی:

معقول ہونا چاہیے۔ خون خرابہ نہ ہو۔ تعصب نہ ہو۔ لوگ چین سکون سے رہیں۔

پرویز:

لیکن ایسے سماج کی بنیاد ڈالے گا کون؟

عینی:

دیکھیے آپ کو پتہ نہیں ہوتا، کب کون پیدا ہو جائے اور آپ کے خوابوں کو شکل دے دے۔ کیا کسی کو معلوم تھا کہ روس میں گورباچوف پیدا ہو جائیں گے؟

پرویز:

سماج کی تعمیر میں ادیب کا کیا رول ہوتا ہے؟

عینی:

ادیب کا رول تو بے حد اہم ہوتا ہے۔ لیکن اچھا ادب بہت کم لوگوں تک پہنچتا ہے۔ جیسے میں جو کچھ لکھتی ہوں، جانتی ہوں اسے پڑھنے والے لوگ کم ہی ہیں۔ سستا ادب زیادہ لوگوں تک پہنچتا ہے۔ لوگ اس سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔

پرویز:

تو پھر آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے پیچھے آپ کا مقصد کیا ہے۔

عینی:

میں نے کسی مقصد کے لیے بھی کچھ نہیں لکھا ہے۔ میں اس طرح کچھ لکھ ہی نہیں سکتی۔ میں وہی لکھتی ہوں جو میرا ذہن مجھے لکھنے کے لیے کہتا ہے۔

پرویز:

آپ ادیبوں کے کس خیمے میں ہیں؟

عینی:

میں کبھی کسی خیمے کا حصہ نہیں رہی۔ ادب کی دنیا میں خیمہ بازی کسی کو فائدہ نہیں پہنچاتی۔ جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا تب ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی لیکن میں کبھی اس کا حصہ نہیں بنی۔ آج آپ دیکھیے کہ اس سوچ کے تحت جو کچھ لکھا گیا، وہ اب کہاں ہے؟

پرویز:

حقیقت پسندی اور عام آدمی کی بات..... ترقی پسند تحریک کے دوران ان دو چیزوں پر خاص دھیان دیا گیا۔

لیکن آپ کے ادب میں یہ دونوں ہی چیزیں سرے سے غائب ہیں۔ کیا اس تحریک سے الگ رہنے کے لیے آپ نے جان بوجھ کر ایسا کیا؟

عینی:

دراصل میں جس ماحول میں پلی بڑھی ہوں، اس لحاظ سے میرا موضوع الگ ہے۔ میرا

مختلف طبقے سے تعلق تھا۔ پڑھے لکھے لوگوں کے بیچ اٹھنا بیٹھنا رہا ہے تو ظاہر ہے میرا موضوع وہی لوگ ہوں گے۔ میرے کردار تو تواریخ کی بات کرتے ہیں۔ فلسفے کی بات کرتے ہیں۔

پرویز:

لیکن عام آدمی سے آپ کا کوئی تو سروکار ہوگا؟

عینی:

نہیں بالکل نہیں۔

پرویز:

چوکیدار، چپراسی یا گھریلو نوکر کے روپ میں بھی نہیں۔

عینی:

میں نے کہا نہ کہ وہ میرا موضوع نہیں رہا۔ اب یہ تو آپ پوچھ سکتے ہیں کہ میں نے کیا لکھا، لیکن یہ کیا بات ہوئی کہ ہر شخص مجھ سے پوچھتا ہے کہ میں نے وہ کیوں نہیں لکھا یہ کیوں نہیں لکھا۔ اسی لیے کسی سے ذکر تک نہیں کرتی کہ میں ادیبہ ہوں۔ میں اپنا لکھا کسی پر تھوپنا بھی نہیں چاہتی۔

پرویز:

لیکن اپنے قاری کی تو کوئی تصویر آپ کے ذہن میں ہوگی۔ کوئی تو نشانہ ہوگا آپ کا؟

عینی:

جو میرا ادب پڑھنا چاہتا ہے پڑھتا ہے، پسند کرتا ہے، وہی میرا قاری ہے۔

پرویز:

آپ اردو میں لکھتی ہیں اور اردو قاری کی تعداد دن بدن گھٹتی جا رہی ہے۔ یہ دیکھ کر کیسا لگتا ہے آپ کو؟

عینی:

ہماری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ تو یہی ہے کہ جس زبان میں لکھ رہی ہوں اسے پسند تو

سب کرتے ہیں مگر اسے مارتے بھی جا رہے ہیں۔ اس سے بڑی تکلیف کیا کوئی اور ہو سکتی ہے کہ جس زبان میں آپ لکھ رہے ہیں، اسے پڑھنے والے ہی موجود نہیں ہیں۔

پرویز:

اس کا ذمہ دار آپ کسے مانتی ہیں؟

عینی:

پاکستان کے بننے کے لیے قربانی دینے کے دعوے بہت کیے گئے ہیں۔ لیکن میرے خیال سے پاکستان کے لیے سب سے بڑی قربانی اردو نے دی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا رسم الخط بدل دو۔ ارے یہاں ہر زبان کا اپنا ایک کلچر ہوتا ہے۔ الفاظ کی غنائیت ہوتی ہے زبان اسے بہا دیتی ہے۔ یہ سب اتنا آسان نہیں ہوتا۔ پھر اس کے لیے ذمہ دار سبھی ہیں۔ اردو والے، ہندی والے اور سب سے زیادہ سرکار۔ جب کوئی زبان روزگار سے نہیں جڑی ہوگی تو اسے پڑھے گا کون؟ سرکار ہی اسے سیاست کا شکار ہونے سے بچا سکتی ہے۔ اس معاملے میں یہ ملک اکیلا نہیں ہے۔ عرب جب مصر پہنچے تو انھوں نے وہاں کی قبطی "زبان کو ختم کر دیا"، قبطی زبان اب وہاں محض چرچ کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ جیسے ہمارے یہاں سنسکرت ہے۔ فلسطین میں جب یہودی پہنچے تو انھوں نے عربی کو ختم کیا اور "عبرانی" کو زندہ کر دیا۔ یعنی حکومتوں کو بدلنے کے ساتھ جب کلچر یا زبان کے شدھتا کی بات کی جاتی ہے تو مطلب ہوتا ہے کسی خاص مذہب کے کلچر کا DOMINANT یہی شونسٹ اپروچ CHAUVINIST APPROACH کہلاتا ہے۔ تبھی ایک زبان میں دوسری زبان کے لفظ چن چن کر نکالے جاتے ہیں اور شدھتا کے نام پر پوری زبان کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ یہی ہندستان میں اردو کے ساتھ ہو رہا ہے۔ جو بہت ہی غلط ہے۔

پرویز:

آپ ہندی پڑھ لیتی ہیں؟

عینی:

نہیں۔

پرویز:

آزادی کے بعد کے 42 سالوں میں قومی زبان کی شکل میں ہندی کی ترقی آپ کو کیسی لگتی ہے۔

عینی:

ہندی کو پوری طرح پھلنے پھولنے میں پورے سو سال لگیں گے۔ لیکن اس کے لیے کسی زبان کو قربانی دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

پرویز:

آپ کے ادب پر تیکھا ردِعمل ہو رہا ہے۔ انھیں آپ کیسے لیتی ہیں۔

عینی:

وہ اپنا کام کرتے ہیں۔ میں اپنا کام کرتی ہوں۔

پرویز:

ادبی دنیا میں آپ کن کن سے متاثر رہی ہیں؟

عینی:

منٹو، بیدی، عصمت اور کرشن چندر سے۔

پرویز:

نئے لوگوں میں سے؟

عینی:

میں کوشش کرتی ہوں کہ سبھی کو پڑھوں، جتنا ممکن ہوتا ہے پڑھتی ہوں۔

پرویز:

کسی کا نام لینا چاہیں گی؟

عینی:

نہیں۔

پرویز:

اچھے ادب کی تعریف کیا ہے؟

عینی:

اچھا ادب آپ کو پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔ آج آپ نے نہیں پڑھا تو وہ آپ کو دس سال بعد پڑھنے پر مجبور کرے گا۔ اب غالب کو، شیکسپیئر کو لیجیے۔ آج بھی ان کا ادب اتنا ہی تازہ ہے۔

پرویز:

ناول اور کہانیاں لکھنے کے علاوہ اور کیا کرتی ہیں آپ؟

عینی:

بہت کچھ کرتی ہوں۔ میں نے کئی ڈاکومنٹری فلمیں لکھی ہیں۔ ایک فلم بھی لکھی تھی "ایک مسافر ایک حسینہ"۔

پرویز:

بس ایک ہی فلم کیوں؟

عینی:

کئی لوگ چاہتے تھے کہ میں لکھوں لیکن میں نے کہا نہ کہ مجھ سے اس طرح نہیں لکھا جاتا ہے۔ کسی نے کچھ دیا اور آپ نے وہی لکھ دیا۔ یہ سب مجھ سے نہیں ہوتا۔ دوسری وجہ کاہلی ہے۔

پرویز:

کاہل ہوتے ہوئے اتنا ادب کیسے لکھ ڈالا؟

عینی:

وقت بھی بہت لگا اس میں۔

پرویز:

ہندستانی عورت کی تصویر بھی پسند نہیں کی آپ نے؟

عینی:

نہیں کی۔

پرویز:

عورتوں کی کسی تحریک کے ساتھ بھی نہیں رہیں؟

عینی:

جی نہیں...........کہا نہ میں کسی بھی تحریک کے ساتھ نہیں رہی۔ میں نے اپنے لیے ایسا کوئی رول ہی طے نہیں کیا۔

پرویز:

اتنے بہت سے کردار آپ نے پیدا کیے۔ان میں سے کوئی ہانٹ کرتا ہے؟

عینی:

نہیں، مجھے کوئی ہانٹ نہیں کرتا۔ میں بتا چکی ہوں آپ کو۔ میں اپنا لکھا کسی پر تھوپتی نہیں ہوں اور نہ چوبیس گھنٹے ادیبہ کا لبادہ اوڑھے پھرتی ہوں۔ میں اپنے ادب کا از خود کبھی ذکر بھی نہیں کرتی۔

پرویز:

اسی لیے جلسوں وغیرہ میں کم جاتی ہیں۔

عینی:

جلسوں میں جاتی ہوں۔ جیسے اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے لیے ضرور تقریر کروں گی لیکن اپنے ادب کے بارے میں نہیں بولوں گی۔

پرویز:

اپنے ناول ’چاندنی بیگم‘ کے بارے میں کچھ بتائیں گی؟

عینی:

ایک مسلم خاندان ہے۔اس کے پاس زمین کا ایک ٹکڑا ہے۔ میں نے تاریخی تناظر میں فلسفیانہ انداز سے پوری داستان کو آج کے حالات کے تانے بانے میں بُنا ہے۔ایک زمین کا ٹکڑا

کن کن سطحوں پر نفسیاتی مسائل پیدا کر دیتا ہے۔ پوری کہانی جس کردار کے آس پاس گھوم رہی ہے وہ "چاندنی بیگم" ہے۔

پرویز:

اب کچھ نجی سوال......

عینی:

ضرور!

پرویز:

سنا ہے آپ گھر آنے کی دعوت دیتی ہیں اور گھر پر تالا ڈال کر غائب ہو جاتی ہیں؟

عینی:

ارے...... یہ کس نے کہا ہے؟

پرویز:

عام طور پر لوگ آپ کے بارے میں یہی کہتے ہیں۔

عینی:

خدا کا شکر ہے۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ میں اپنے مہمانوں کو دھکے مار کر نکال دیتی ہوں۔

پرویز:

سنا ہے کہ آپ نے شادی کے معاملے میں بھی ایسا ہی کچھ کیا تھا؟

عینی:

بس، یہ سب نہیں۔ یہ میرا نہایت ذاتی معاملہ ہے۔

(ہندی سے ترجمہ۔ 'نو بھارت ٹائمز'، 22 جولائی 1990، گیان پیٹھ ایوارڈ ملنے کے بعد)

ہندستان میں اردو کو پاکستان کے قیام کی سیاسی قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے

گفتگو : الکا سنگھ

بیس سال قبل آنجہانی فراق گورکھپوری کی ہندستان میں اعلیٰ ترین ادبی ایوارڈ ''گیان پیٹھ ایوارڈ'' سے عزت افزائی کی گئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب اردو کے کسی ادیب کو اس باوقار ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس واقعہ کے لگ بھگ بیس سال کے بعد اردو کی مشہور فکشن نگار محترمہ قرۃ العین حیدر کی اس سال اس عظیم ایوارڈ سے عزت افزائی کی گئی ہے۔ اس سے پہلے اردو کی اس عظیم ادیبہ کی ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ اور پدم شری کے خطاب سے پذیرائی کی جا چکی ہے، ہندستان کے تمام ادبی حلقوں میں قرۃ العین حیدر کو انعام دیے جانے پر خوشی کا اظہار کیا گیا ہے کیونکہ وہ واقعی اس ایوارڈ کی مستحق تھیں۔ ہندستان کے تمام بڑے اخبارات نے بہت نمایاں طور پر اس خبر کو چھاپا ہے۔

انگریزی ہفت روزہ ''سنڈے آبزرور'' کی نمائندہ الکا سنگھ نے ایوارڈ کے اعلان کے بعد

جو قرۃ العین حیدر صاحبہ سے گفتگو کی تھی وہ قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔

الکا سنگھ:

آپ اپنی ادبی زندگی کے بارے میں ہمیں کچھ بتائیں؟

قرۃ العین حیدر:

میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 19 سال کی عمر میں کیا تھا۔ جب میں نے اپنا پہلا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' لکھا تھا۔ تقسیم وطن کے بعد میں پاکستان چلی گئی تھی۔ پچاس کے دہے کے وسط میں پھر واپس ہندستان چلی آئی۔ اس وقت تک ناول ''آگ کا دریا'' منظر عام پر آچکا تھا۔

الکا سنگھ:

''کیا ملک کی تقسیم سے اردو کی حیثیت قدرے کم نہیں ہوگئی ہے''

قرۃ العین حیدر:

اردو کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جس طرح بنگالی زبان کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اردو تو علاقائی حد بندی سے بالکل آزاد ہے۔ پاکستان میں بھی ادبی سرگرمیاں زور وشور سے جاری ہیں وہاں بھی اردو تحریر کو خواہ وہ کسی ہندو کی تخلیق ہو یا مسلمان کی، بڑی دلچسپی اور انہماک کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور ادیبوں کی ان کے مذہب سے قطع نظر بڑی پذیرائی کی جاتی ہے۔ آج بھی وہاں دوہے اور گیت لکھے جاتے ہیں کیونکہ یہ خالص ہندستانی انداز ہے۔ اس میں اردو یا ہندی کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

الکا سنگھ:

کیا سیاسی مجبوریاں اردو کو سنسکرت کی طرح محض ایک کلاسیکل زبان بنا کر رکھ دیں گی۔

قرۃ العین حیدر:

(بڑے اعتماد ویقین کے ساتھ) ''اردو مرتی ہوئی زبان نہیں ہے۔ البتہ زبان کو فروغ جب ملتا ہے جب اس کے رسم الخط کی ترقی ہو۔ اردو کے ساتھ یہی نہیں ہورہا ہے۔ اردو کو پاکستان

کے قیام کی سیاسی قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ اردو رسم الخط کو ختم نہیں کیا جانا چاہیے۔ ہندستان اگر ایسا کرتا ہے تو وہ خود اپنی تہذیبی روایات کو کمزور کرے گا۔

تہذیبی روایات کے حوالے کے طور پر میں منشی نول کشور کی مثال دینا چاہوں گی کہ ان کے مطبع خانے نے 19 ویں صدی میں مثالی کام انجام دیا تھا۔ انھوں نے اردو اور فارسی کی ہزارہا کتابیں طبع کیں۔ لیکن آج وہ ہزاروں نایاب مسودے پڑے سڑ رہے ہیں۔ اب کوئی انھیں چھاپنا نہیں چاہتا۔

الکا سنگھ:

ہندو پاک میں اردو ادب کی صورت حال کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

قرۃ العین حیدر:

ادبی سطح پر ہندستان میں اگرچہ بہت ہی سنجیدہ کام کیے گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی پاکستان کو سبقت حاصل ہے کیونکہ اردو وہاں کی سرکاری زبان ہے۔

الکا سنگھ:

ہندستان میں لسانی تنازعات کو آپ کس نظر سے دیکھتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر؟

جب لوگ ہندستان کا موازنہ مغرب سے کرتے ہیں تو وہ یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ جاپان اور جرمنی جیسے بڑے ممالک کی صرف ایک زبان ہے اس لیے ان کے لیے اسے سرکاری زبان بنانے میں کوئی دقت نہیں ہے اور نہ ہی انھیں انگریزی کی ضرورت ہے لیکن ہندستان میں سولہ زبانیں ہیں۔ اس لیے سرکاری زبان کے انتخاب میں دقت ہے۔ طائم سنگھ یادو کی انگریزی کو ختم کرنے کی پالیسی غیر دانشمندانہ ہے۔ انگریزی کو ربط کی زبان رہنا چاہیے اور ملک میں ہر زبان کو پنپنے اور پھلنے پھولنے کا حق ملنا چاہیے۔

الکا سنگھ:

کیا اردو ایک مشترکہ زبان کی حیثیت سے ہند اور پاکستان کے درمیان پیدا شدہ تناؤ کو ختم

کرنے میں معاون ہو سکتی ہے؟

قرۃ العین حیدر:

انکار میں سر ہلاتے ہوئے دونوں ممالک کے درمیان بہت سے سیاسی اختلافات ہیں اور پھر ان اختلافات کا تعلق بھی بین الاقوامی سیاست سے جڑا ہوا ہے۔ ایسی صورت میں کوئی بھی زبان یا ثقافتی تبادلوں سے اس تناؤ کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ افسوس کی بات ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان، بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ لیکن پھر بھی ہر وقت جنگ کا ماحول بنا رہتا ہے۔

(گیان پیٹھ ایوارڈ پانے کے بعد، ہفت روزہ 'اخبار نو' دلی،
27 جولائی تا 2 اگست 1990)

اردو ہندستانی تہذیب کی عکاس ہے

گفتگو : نمائندہ فانا

نمائندہ فانا:

آپ نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے لیے اردو کو کیوں اظہار کا ذریعہ بنایا جبکہ آپ انگریزی پر بھی اتنی ہی قدرت رکھتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آج کا ایک عام اردو قاری آپ کی تحریروں کی گہرائیوں کو پانے سے قاصر رہتا ہے خصوصاً آپ کا وہ طرز تحریر جس میں آپ اشاروں اور کنایوں میں تاریخی ادوار کے حوالے دیتی ہیں۔ اس سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ آپ صرف مخصوص طبقے ہی میں پڑھی جاتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

بات ایسی نہیں ہے۔ اگر میری تصانیف عام اردو قاری کی فہم سے بالاتر ہوں تو پھر میں پوچھوں گی کہ پھر وہ اتنی زیادہ تعداد میں کیوں پڑھی جاتی ہیں۔ ہاں البتہ میں اتنا ضرور کہوں گی کہ سنجیدہ ادیب، سنجیدہ طبقے اور صائب الرائے طبقے میں ہی پڑھے جاتے ہیں۔ مقبول عام لٹریچر کی صنف دوسری ہے جیسا کہ گلشن نندہ اور ابن صفی جن کو صحیح معنوں میں عوامی ادیب کہہ سکتے ہیں۔

اردو میری مادری زبان ہے اور میں اردو میں کیوں نہ لکھوں؟ میں جس طرح کی چیزیں لکھتی ہوں اس کا انگریزی میں موثر طور سے اظہار نہیں کیا جاسکتا۔ اردو ہندستانی تہذیب کی عکاس ہے۔ یہ فضا سازی انگریزی میں نہیں ہوسکتی۔

نمائندہ فانا:

کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کا ناول ''آگ کا دریا'' جس تہذیب کا عکاس ہے وہ آج کے ہندستان کے حالات سے بھی مناسبت رکھتا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

ہندستان کے بڑے حصے میں بولی جانے والی زبانوں میں لکھے گئے ناولوں کے پس منظر ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کے ہی عکاس ہوتے ہیں۔

نمائندہ فانا:

اردو ناول اپنی منظر کاری میں متمول اور جاگیردار گھرانوں کے گرد ہی کیوں گھومتے ہیں اور اردو شاعری جام و ساقی کی بندشوں سے آزاد کیوں نہیں ہوتی؟

قرۃ العین حیدر:

ایسا نہیں ہے۔ اردو میں بھی ہر قسم کے ادیب، مصنف و شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ پریم چند دیہی ماحول اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے عکاس تھے، عصمت چغتائی نے متوسط طبقے کے ماحول کو پس منظر بنایا۔

حیات اللہ انصاری کا آنے والا ناول ''لہو کے پھول'' دیہی پس منظر پر مبنی ہے۔ اردو ادب انتہائی جدید اور انتہائی توانا ادب ہے اور نئے رجحانات کی عکاسی میں دیگر زبانوں کے ادب سے پیچھے نہیں۔ اردو ادب کو ایک ہی ہیئت پر مرکوز کا شکار کہنا مناسب نہیں ہوگا۔ البتہ یہ ٹھیک ہے کہ انسان جس ماحول میں رہتا ہے اسی ماحول کی نمائندگی کرتا ہے۔

نمائندہ فانا:

آزادی نسواں کے سلسلہ میں آپ کا نقطہ نظر نہ جدت پسندوں سے میل کھاتا ہے نہ

قدامت پرستوں سے؟

قرۃ العین حیدر:

ہر چیز میں اعتدال ہونا چاہیے۔ آزادی ایک اضافی اصطلاح ہے۔ آزادی کی حدود اس طرح متعین کیے جانے چاہئیں کہ وہ ماحول کی ضروریات کے مطابق ہوں اور کسی کو سماجی طور پر نقصان نہ ہو۔ حد سے زیادہ آزادی سے مغرب میں جو نقصان ہو رہا ہے ظاہر ہے، اس حد سے زیادہ تجاوز کردہ آزادی نے خاندانوں کا شیرازہ بکھیر دیا ہے۔

نمائندہ فنا:

''گردش رنگ چمن'' میں آپ نے تصوف کو مسترد بھی کیا ہے اور سراہا بھی ہے؟

قرۃ العین حیدر:

میں نے اس موضوع پر مکمل غیر جانبدارانہ اور معروضی انداز سے گفتگو کی ہے۔

نمائندہ فنا:

مشرقی یورپ اور روس میں کمیونزم اور سوشلزم کی پسپائی سے آپ کے خیال میں ترقی پسند ادب کی تحریر پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟

قرۃ العین حیدر:

اب کوئی ترقی پسند تحریک باقی نہیں رہی۔ یہ تحریک بہت قبل ہی ناکام ہو چکی ہے۔ حالات میں مسلسل تغیر آتا رہا ہے بلکہ کئی ''ترقی پسند'' خود اپنے ان کٹر نظریات کو ترک کر چکے ہیں۔ تیسری دنیا کے مصنفین پر ان تغیرات کا اثر لازمی ہے کیونکہ ان ادبا اور مصنفین نے بشمول میرے، یہ تصور کیا تھا کہ ہمارے مسائل کا حل ایک مخصوص قسم کی اشتراکیت میں ہے جو ہندستان کے حالات سے مطابقت رکھتا ہو اور جو مذہب پسند لوگوں کو الگ نہ کر دے۔

اب تو حالات بہت بدل چکے ہیں اور مذہب کا روس اور چین میں بھی احیا ہو رہا ہے، میں بھی دوسروں کی طرح ہی دم بخود ہو کر ان تغیرات کا مشاہدہ کر رہی ہوں۔

نمائندہ فکا:

آپ فی الوقت کون سا ناول تصنیف فرما رہی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

''چاندنی بیگم''

نمائندہ فکا:

آپ اپنی تخلیقات میں کسے شاہکار سمجھتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

میرا آخری ناول ہی میرا شاہکار رہوگا۔

(گیان پیٹھ ایوارڈ پانے کے بعد، 'قومی آواز'، 25 جولائی 1990)

•

تاریخ ایک بنیادی حقیقت ہے

گفتگو : جاوید ناصر

جاوید:

سامعین کرام! جاوید آداب عرض کرتا ہے، بزم اردو کی اس خصوصی نشست میں آج ہماری مہمان ہیں اردو کی ممتاز ادیبہ محترمہ قرۃ العین حیدر تو آیئے اپنی امیدیں، اپنے حوصلے، اپنے شکوک اور اپنے شبہات، اپنے اندیشے اور اپنے سوالات ان کے سامنے رکھیں تا کہ ہماری رہنمائی ہو۔ عینی آپا آداب عرض!

قرۃ العین حیدر:

آداب عرض

جاوید:

فن کے بنیادی وظیفے آرٹ کے BASIC FUNCTIONS سے متعلق کچھ پوچھنا چاہتا ہوں خاص طور سے آپ کے تخلیقی عمل کی روشنی میں کہ فن کا بنیادی وظیفہ کیا ہے اور کیا ہو سکتا ہے، افہام و تفہیم کے لیے۔

قرۃ العین حیدر:

صاحب، فن کا بنیادی وظیفہ، مقصد میرے خیال میں تو یہ ہے کہ ایک انسان جس میں کوئی بھی تخلیقی صلاحیت ہے یعنی وہ پینٹنگ کرتا ہے یا وہ گاتا ہے یا وہ لکھتا ہے افسانہ، شعر، ناول یا پھر کوئی خوب صورت مکان بناتا ہے کوئی بھی خوب صورت چیز جس کی کوئی افادیت ہے اور اس کو جو زندگی کے اس CONTACTS میں جہاں پہ وہ خود کو موجود پاتا ہے اور اپنے آس پاس کی دنیا کو موجود پاتا ہے، جس طریقے سے وہ دیکھتا ہے دنیا کو اور زندگی کو بھی اس کو وہ کس طرح پیش کرتا ہے، کن الفاظ میں یا کن سروں میں یا کن رنگوں میں یا بہ حیثیت ایک آرکی ٹیکٹ کس انداز سے، وہ فن کا اس کا گویا CONTRIBUTION ہے زندگی کو بہتر بنانے اس کو سمجھنے کی کوشش میں اس کا حصہ ہے۔ میں سمجھتی ہوں۔ اچھا اب یہ بہت پرانی بحث ہے کہ ART FOR ART SAKE ہو یا ART FOR LIFE SAKE تو صاحب ART FOR LIFE SAKE دونوں ہو سکتا ہے ایک ساتھ کیونکہ آرٹ لائف سے الگ کوئی چیز نہیں ہے اور زندگی جو ہے وہ آرٹ سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ جب آپ کوئی چیز خوبصورت بناتے ہیں تو وہاں پہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ IT CAN BE PRETTY-PRETTY پھر وہ چیز جو ہے وہ زندگی کی نمائندگی نہیں کرے گی بلکہ ایک طرح سے وہ اس کا IDEALISATION ہوگا تو وہ صحیح نہیں ہوگا پھر یہ ہے کہ زندگی آپ کو جس طرح نظر آرہی ہے آپ ویسے ہی پیش کردیں تو یہ بڑی بھیانک چیز بھی ہو سکتی ہے جس چیز سے کہ ہماری پوری ماڈرن آرٹ کی تحریک نکلی یعنی پہلے انیسویں صدی تک جو ہمارے آرٹسٹ تھے، فن کار تھے وہ زندگی کو مشرق میں IDEALISE کرکے پیش کرتے تھے اور مغرب میں کیونکہ زندگی زیادہ متحرک تھی اور وہ بھی جامد جو آرٹ تھا اس کے برخلاف وہ پیدا ہوا RENAISSANCE (نشاۃ ثانیہ) کے بعد جبکہ انھوں نے دیکھا کہ صرف ایک ہی رخ نہیں ہے زندگی کے چار رخ ہیں اس سے لائٹ اینڈ شیڈ کا CONCEPT پیدا ہوا جو کہ محض آرٹ میں ہی نہیں بلکہ وہ لٹریچر میں بھی آتا ہے وہ ہمارے یہاں نہیں آیا۔ ہمارے یہاں یک رخی تصویریں ہیں، ہمارے یہاں لٹریچر بھی یک رخا رہا، ہمارے یہاں ہر چیز جو تھی وہ خوب صورتی کے ساتھ پیش کرنے کا تصور رہا۔ مشرق

میں، اچھا مغرب میں INDUSTERLISATION کے ساتھ اور بھی زیادہ زندگی کے جتنے بھی بھیانک پہلو جو سامنے آئے! دنیا کے سامنے وہ لوگوں نے پیش کرنے شروع کیے۔ آرٹ میں بھی اور لٹریچر میں بھی اسی سے ناول پیدا ہوا، اسی سے مختصر افسانہ پیدا ہوا اور اسی سے جدید شاعری پیدا ہوئی اور وہ ہی چیز ہمارے یہاں آ گئی انیسویں صدی کے آخر آخر تک جو بحث شروع ہوئی تھی ART FOR ART SAKE ART FOR LIFE SAKE اور وہ بحثیں وہاں بہت رہیں اور اس سے لوگوں نے نئے نئے راستے نکالے اور اس سے ایک بہت بڑا کہنا چاہیے کہ زبردست پکچر گیلری تیار ہوگئی زندگی کی جس میں آپ ہر چیز ہر پہلو سے دیکھ سکتے تھے نظر آتی تھی وہ ہمارے یہاں اس صدی میں آخری یعنی تیسویں دہائی کے بعد ہمارے یہاں وہ چیز آئی آرٹ میں بھی اور لٹریچر میں بھی لہٰذا یہ کہنا کہ ادب ART FOR ART SAKE بھی ہوسکتا ہے اور ART FOR LIFE SAKE بھی ہوسکتا ہے اور دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چل سکتی ہیں لہٰذا میرے خیال میں ادب کا مقصد یہ ہے کہ جو چیز آپ پیش کر رہے ہیں وہ آپ دیانت داری سے پیش کیجیے۔ اس میں آپ زندگی کی خوب صورتی بھی دکھایئے اور زندگی میں جو بدصورتی ہے وہ بھی دکھایئے۔ لیکن اس طرح سے نہیں کہ اس سے آپ کو زندگی سے ایسی نفرت نہ پیدا ہو کہ آپ اس سے MORBIDITY کی طرف جائیں بلکہ اس سے آپ کچھ بہتری پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس کو آپ کہیں گے کہ یہ تو بالکل پروپگنڈے والی بات ہوئی مگر میرا خیال ہے کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ میرا خیال ہے کہ گریک ٹریجڈی پڑھیے یعنی ٹریجڈی جو ہے اس کے آگے کوئی چیز نہیں ہے TRAGEDY IS THE END لیکن اس کو پڑھ کے آپ کے اندر کیا ہوتا ہے آپ کے اندر زندگی سے ٹکر لینے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے تو میرا خیال یہ ہے کہ آرٹ کا مقصد یہی ہونا چاہیے۔

جاوید:

یعنی باطنی طاقت پیدا ہونی چاہیے۔

قرۃ العین حیدر:

باطنی طاقت پیدا ہونا چاہیے۔

جاوید:

اچھا ایک اور بات ذہن میں ہے، خاص طور سے یہ بات اس لیے بھی ذہن میں آئی کہ آج کل آپ کے افسانوں کے تعلق سے ایک بات کہی جاتی ہے کہ جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی زندگی کے تجربات کم ہوگئے ہیں آپ کے ہاں، اس لیے آپ تاریخ سے یا دیگر علوم سے زیادہ مدد لیتی ہیں تو میں یہ سوچتا ہوں کہ فن کار جس ماحول کا پروردہ ہے اور جن روایات کا امین ہے، جن تعلیمات سے آراستہ ہے، جن تہذیبی خصوصیات کا حامل ہے تو کیا یہ ضروری ہے کہ اس کی تخلیقات میں ان تمام چیزوں کا اظہار ہو، ان سے گریز بھی ممکن ہے اور اگر اظہار ناگزیر ہے تو وہ لاشخصی بھی ہوسکتا ہے تو ان تمام تفصیلات کے ساتھ علاحدگی احساس اور لاشخصی اظہار کی اصطلاحیں کیا آپ کے لیے قابل قبول ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے جب آپ نے تاریخ کی بات کی نہ تو یہ بہت اہم معاملہ ہے، بہت اہم نکتہ ہے جہاں تک میرا سوال ہے جب آپ نے یہ کہا کہ کہا جاتا ہے کہ میں زندگی سے الگ ہوں کیا وہ......

جاوید:

چلتی پھرتی جیتی جاگتی زندگی......

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے ہر شخص کا اپروچ APPROACH ایک نہیں ہے اگر میرا اپروچ تاریخ کا ہے تو وہ رہے گا۔ تاریخ میرے خیال میں ایک بنیادی حقیقت ہے جیسے کہ آپ انسان کی زندگی کے پہلو اور انسان کے کردار کی خصوصیات ہیں یا اس کی جو نفسیاتی الجھنیں ہیں، اس کے شخصی مسائل ہیں یا اس کے سماج کے مسائل ہیں وہ تاریخ سے الگ ہو کے آپ دیکھ ہی نہیں سکتے......تو میرے خیال میں یہ جو بات ہے وہ میری سمجھ میں آئی نہیں اس لیے کہ جب میں ایک کیریکٹر لیتی ہوں تو میں اس کو تاریخ کے چوکھٹے میں رکھ کے دیکھتی ہوں اور اس سے مجھے پوری جو اس کی بیک گراؤنڈ ہے،

عمرانی جو اس کا پس منظر ہے، اس کا جو نفسیاتی پس منظر ہے، اس کا جو تہذیبی پس منظر ہے اس سے الگ رہ کر میں دیکھ ہی نہیں سکتی......لہٰذا جب میں لکھوں گی تو وہ زیادہ ROUNDED کیریکٹر ہوگا کیونکہ میں نے اس کو تاریخ کے چوکھٹے میں رکھ کے دیکھا ہے چاہے وہ کوئی ایک شخص ہو، کوئی سچویشن ہو، کوئی واقعہ ہو، کوئی ماحول ہو، کوئی خاص فضا ہو، وہ تاریخ کا ایک حصہ ہے، ہم اور آپ تاریخ کا ایک حصہ ہیں تاریخ سے الگ نہیں ہیں لہٰذا جب میں کوئی بھی چیز لکھتی ہوں جب میں نے شروع میں لکھنا شروع کیا ظاہر ہے کہ میں نے بہت کم عمری میں لکھنا شروع کیا تھا اس وقت مجھے یہ سب باتیں نہیں معلوم تھیں لیکن مجھے تاریخ کا شوق پیدا ہوا اور تاریخ میں، میں اتنی INVOLVED ہوں آپ تاریخ سے الگ نہیں ہیں، ہم جو سب یہاں بیٹھے ہیں وہ تاریخ کی ایک خاص سچویشن کا ایک حصہ ہیں اس سے الگ ہو ہی نہیں سکتے بلکہ میں تو بعض وقت سوچتی ہوں کہ لوگ بغیر تاریخ کے متعلق سوچے ہوئے کس طرح بات کر لیتے ہیں کس طرح لکھ لیتے ہیں اور اسی لیے میں جب بھی بات کرتی ہوں تو فوراً پہنچ جاتی ہوں بلکہ ہزاروں میل دور، سینکڑوں ہزاروں برس پہلے پہنچ جاتی ہوں۔ مثلاً آپ نے سوال کیا تھا کہ فن کا بنیادی مقصد کیا ہے تو فوراً میں پہنچ گئی GREEK TRAGEDY پر اور میں پہنچ گئی RENAISSANCE میں اس کے بغیر میں سوچ ہی نہیں سکتی یعنی جو بات کرتی ہوں میرے ذہن میں اس کا پورا ایک پس منظر ہوتا ہے یا اس کا......

جاوید:

تہذیبی ارتقا نظر میں رکھتی ہیں......

قرۃ العین حیدر:

تہذیبی نہیں ہوتا وہ، صرف وہ تہذیبی کے علاوہ ایک قسم کا METAPHYSICAL بھی ہوتا ہے دیکھیے تاریخ کا ایک METAPHYSICAL ELEMENT ہے جو بہت اہم ہے اور وہ آپ سمجھ سکتے ہیں اسی وقت جب آپ تاریخ کا بہت زیادہ گہرا......

جاوید:

شعور ہو۔

قرۃ العین حیدر:

شعور تو خیر بہت بڑی بات ہے ممکن ہے شعور نہ ہو، دلچسپی ہو تو مجھے دلچسپی ہے میں کوئی افلاطون تو ہوں نہیں، میں تاریخ کی ایک طالب علم ہوں اور تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے میں دیکھتی ہوں کہ جب میں یہاں یہ بات کروں گی ایک چیز کی تو اس کے پیچھے کتنی زیادہ RACIAL اس کے پیچھے نسلی الجھنیں ہیں، اس کے پیچھے زبان کی الجھنیں ہیں، اس کے پیچھے نفسیات کی الجھنیں ہیں، کلچر کی ہیں، انسان اکیلا نہیں ہے ایک اکائی تو وہ ہے ہی نہیں وہ بندھا ہوا ہے وہ بندھا ہوا ہے پورے ماحول سے، پورے ماضی سے بندھا ہوا ہے اور ماضی سے الگ ہو کے کہیں جا نہیں سکتا۔ اس لیے ماضی میرے لیے بہت اہم ہے۔

جاوید:

ایک طالب علمانہ تجسس کے تحت جاننا چاہتا ہوں کہ آپ اپنی کس تخلیق پر نادم ہیں اور کس تخلیق پر نازاں اور کس تخلیق سے مطمئن؟

قرۃ العین حیدر:

آہا! صاحب دیکھیے نادم تو میں شاید نہیں ہوں کسی تخلیق سے بھی لیکن یہ ہے کہ جو چیزیں میں نے بچپن میں لکھی تھی لڑکپن میں ٹین ایجر اب میں نے وہ پڑھا، مثال کے طور پر میں نے افسانے پڑھے تو مجھے حیرت ہوئی کہ وہ باتیں میں نے کیسے محسوس کر لیں غالباً اب میں ان چیزوں کو نہیں محسوس کر پاؤں گی تو شروع کے افسانوں سے ممکن ہے مجھے کچھ جھینپ آئے کہ میں نے کیا لکھا تھا لیکن بھئی وہ تو ایک ذہنی ارتقا ہوتا ہے انسان کا۔ آج آپ شعر کہہ رہے ہیں آج سے بیس سال کے بعد آپ اور زیادہ اچھے شعر کہیں گے۔ تو یہ بات ہے کہ میں نادم تو نہیں ہوں لیکن میں...... کیا فرمایا تھا آپ نے پھر سے بتائیے گا۔

جاوید:

کس تخلیق پر ناز......

قرۃ العین حیدر:

ناز واز تو کسی تخلیق پر نہیں، بر خود غلط کسی تخلیق پر نہیں لیکن صاحب میں جو لکھتی ہوں SINCERITY سے لکھتی ہوں بڑی دیانت داری سے لکھتی ہوں اور اب محنت سے لکھتی ہوں۔

جاوید:

اب دیانت داری پر ایک بات یاد آگئی ہے کہ آج کل اردو میں اور خاص طور سے افسانوں میں ایک مابعد الطبیعاتی فضا خلق کرنے کی کوشش کی جارہی ہے بالکل نئے لکھنے والوں اور ان کے پیش رو کی بات کر رہا ہوں۔ ایک عجیب دغریب قسم کی سطحیت اور مہملیت قائم کی جاتی ہے قول محال وغیرہ کی جو اصطلاحیں غالب کے زمانے میں تھیں اس سے غیر ضروری استفادہ کیا جاتا ہے، مجرد مصرعوں کا انبار لگایا جاتا ہے اس سے کوئی فضا بنتی ہو تو بنتی ہو لیکن یہ احساس قطعاً نہیں ہوتا کہ افسانہ نگار کی زد میں ایسا کوئی موضوع ہے جو بلاغت کا مطالبہ کرتا ہے جس کا کوئی حل نہیں ہے جو لاینحل نظر آتا ہے تو کیا یہ تقلید ہے یا ان لکھنے والوں کی کم مائیگی؟

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے یہاں پر آپ کو میں ایک مثال پیش کرتی ہوں وہ مثال ہے ماڈرن آرٹ کی میں یہاں پر کسی نئے یا پرانے لکھنے والوں کا نام نہیں لوں گی۔ آپ کسی ماڈرن آرٹ کی گیلری میں چلے جائیے وہاں پہ آپ دیکھیں گے کہ کینوس لگے ہوں گے ایک لائن میں ہزاروں۔ کسی بڑی گیلری میں چلے جائیے۔ دلی میں یا باہر یا بمبئی میں بھی اور اس میں آپ کو اس قدر بے تکی چیزیں نظر آئیں گی بعض جگہ کینوس پورا خالی ہوگا ایک جگہ صرف ایک نقطہ لگا ہوگا، کہیں پہ چکر ہوں گے کہیں پہ...... میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں خود پینٹ کرتی رہی ہوں اور میں نے ماڈرن آرٹ بھی بنایا ہے تو اس میں بعض چیزیں آپ کو VISUALLY اپیل کریں گی چاہے آپ کی سمجھ میں نہ آئے کہ آرٹسٹ نے کیا کہا ہے، اچھا آرٹسٹ نے کیا کہا ہے یہ میں خود بھی نہیں جانتی اس لیے آرٹسٹ غالباً خود بھی نہیں جانتا وہ ایک فیشن کو فولو کر رہا ہے۔ یا سوچتا ہے کہ اس وقت میں جدید دنیا کا ایک فرد ہوں اور دنیا میں اتنی مشکل ہے کہ سمجھ میں نہیں آتی لہٰذا میں نقطہ چاند اور چڑیاں اور

درخت نہیں بناؤں گا اور میں کشتی میں بیٹھی ہوئی لڑکی نہیں بناؤں گا۔ ستار بجاتی ہوئی، میں ایک بھیانک بھتنی بناؤں گا اس سے میں بتاؤں گا کہ ہمارے اندر کتنی تھرتا کی ہے، کتنا اندھیرا ہے زندگی میں اور ہم کتنے تنہا ہیں اور زندگی کتنی مشکل ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ ان کو EXPRESS کرنے کی کوشش کرے گا ان بھیانک امیجز سے یا ان مشکل سمجھ میں نہ آنے والی تصویروں سے یا رنگوں سے تصویروں سے یا محض چند لکیروں سے یا وہ آج کل کولاج کی تکنیک ہے کہ آپ نے مختلف چیزیں رکھ دیا یا تین چار پتھر رکھ دیے اس کے اوپر، آپ نے ایک جھاڑن رکھ دیا یا تین چار پتھر رکھ دیے اس سے آپ نے ایک کولاج بنالیا۔ اب پوچھئے کہ آپ نے یہ کیا کیا ہے تو وہ نہیں سمجھا پائے گا وہ اس کا کوئی نام رکھ دے گا، اس کا نام رکھ دے گا فتھ سمفنی اس سے لوگ کہیں گے ففتھ سمفنی ہے یہ؟
تو یہاں یہ مسئلہ آجاتا ہے COMMUNICATION کا وہی پرانی بات کہ اس آرٹسٹ نے ففتھ سمفنی بنائی ہے ایک ٹوتھ برش، ایک جھاڑن اور چار پتھر رکھ کے میرے خیال میں وہ سمفنی نہیں ہے بکواس ہے یا محض ایک فراڈ ہے وہ۔ سمجھ گئے آپ اسی طریقے سے آرٹ میں جو ہوتا ہے اسی طریقے سے لٹریچر میں بھی ہو رہا ہے اور ہو چکا ہے میں آپ کو بڑے مزے کی بات بتاؤں کہ کہیں پہ میں نے پڑھا تھا خود ایلیٹ نے لکھا کہ میں نے ویسٹ لینڈ میں چند چیزیں ایسی لکھیں، نہیں ویسٹ لینڈ میں نہیں، چند اور اس کی نظمیں تھیں اس میں چند چیزیں اس نے لکھیں اس نے کہا کہ میں نے یہ محض تفریحاً لکھ دی تھیں اور بعد میں نقادوں نے اس کی اتنی تاویلات کی ہیں اتنی تاویلات کی ہیں کہ خود میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں میں تو انھیں لکھ گیا تھا۔
اچھا ایسے ہی ایذرا پاؤنڈ کی کچھ نظمیں ہیں جس میں اس نے چینی زبان کے کچھ لفظ استعمال کیے ہیں اس میں اس نے کچھ چینی کیریکٹر کچھ اٹالین پوئیٹری استعمال کی تو صاحب اس کو پڑھنے کے لیے تو آپ کو کوئی SUPER GENIOUS وہ ہونا چاہیے، وہی دماغ ہونا چاہیے جو ایذرا پاؤنڈ یا ایلیٹ کا تھا۔ ظاہر ہے آپ اور میں تو اس چائینز کیریکٹر کا مطلب نہیں جانتے۔ اچھا ایذرا پاؤنڈ نے وہ کیوں لکھے؟ وہ کینٹوس کیوں لکھے؟ وہ تو بڑا شاعر ہے۔ دیوزاد ہے وہ شاعری کا، ایلیٹ کی طرح تو کیوں لکھے اس نے؟ اچھا اس نے لکھا وہ لکھ گیا آپ یا میں اگر اپنے افسانے میں چینی

کردار لکھوں تو میں لوگوں کو صرف مرعوب کر رہی ہوں بے وقوف بنا رہی ہوں تو یہاں پر یہ مسئلہ آ جاتا ہے کہ کہاں تک آپ دیانت داری سے ایک چیز پیش کر رہے ہیں یہ جو آپ فضا CREAT کر رہے ہیں مابعد الطبیعاتی WHAT EVER YOU MAY CALL IT یا کسی نقاد نے کہہ دیا کہ افسانہ جو ہے وہ شاعری کا ایک پہلو ہے بھائی لوگ سب اس پہ لگ پڑے۔ حالانکہ اگر آپ دیکھیے کہ اچھی نثر آپ نے لکھی تو لامحالہ وہ شاعری کے قریب ہوگی تو اس طرح آپ کوشش کر کے ایک چیز بنائیں تو ٹھیک ہے بعد میں اس کو کامیابی ہوگی اگر وہ اچھا ہوگا اور اگر وہ اچھا نہیں ہوگا اور اگر آپ محض تقلید کے طور سے کریں گے تو وہ فیل ہو جائے گا۔ بڑی آسان بات ہے۔

جاوید:

لیکن یہ جو اور لکھنے والے ہیں............

قرۃ العین حیدر:

میں نے اپنا مطلب کچھ واضح کر دیا یا نہیں؟

جاوید:

جی ہاں! یہ جو اور لکھنے والے ہیں بلونت سنگھ کافی سینئر ہیں، انور عظیم ہیں اور یہ سینئر ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

سب سینئر ہیں ان میں نیا کوئی نہیں ہے۔

جاوید:

خالدہ اصغر ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

خالدہ اصغر بہت اچھا لکھتی ہیں۔

جاوید:

سریندر پرکاش ہیں، مین را، جوگندر پال، رام لعل، غیاث احمد گدی، انور سجاد، انتظار حسین اور دیگر، تو ان کے افسانے یقیناً آپ نے پڑھے ہوں گے کیا ان لوگوں نے اردو ادب میں

اپنا کوئی کردار ادا کیا ہے یا یہ محض جانے جاتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں نہیں۔ ان میں سے بعض بہت اچھے ہیں ان میں سے کم از کم ہر ایک نے چند چیزیں بہت اچھی لکھی ہیں۔ بلونت سنگھ کا ناول رات، چور اور چاند پنجاب کے بارے میں بہت اچھا ناول ہے، اچھا خالدہ اصغر افسوس کہ انھوں نے لکھنا چھوڑ دیا دو تین کہانیاں انھوں نے بہت اچھی لکھی ہیں...... اصل میں انتظار حسین کا لاہور میں باقاعدہ ایک اسکول قائم ہو گیا ان کے کچھ چیلے ہیں کچھ مرید ہیں ان میں ایک خالدہ اصغر بھی ہیں جو انھیں کے اسٹائل میں لکھ رہی تھیں۔ انتظار حسین نے جو ایک داستانوں کو نکال کے ایک پرانی ان کی بازیافت ہے پرانی اس کی تلمیحات ہیں، پرانا ماحول ہے اس کے ساتھ جو اصطلاحی اساطیر ہیں ان کو انھوں نے جو برتا ہے اس سے انھوں نے بہت سے لوگوں کو INSPIRE کیا وہاں پر ان میں سے ایک خالدہ اصغر بھی ہیں۔ ان کے دو تین افسانے بڑے اچھے ہیں۔

جاوید:

سواری، شہر پناہ وغیرہ۔

قرۃ العین حیدر:

سواری کو تو میں نے انگریزی ترجمہ کر کے شایع کیا تھا۔ ان لوگوں میں رام لعل کو کہانی کہنے کا طریقہ آتا ہے۔

جاوید:

کہانی کہنا جانتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

جانتے ہیں اور بھی لوگ ہیں۔

جاوید:

انتظار حسین............

قرۃ العین حیدر:

انتظار حسین کا تو خیر میں ذکر کر چکی ہوں وہ تو خیر بہت اچھے ہیں۔ سب اچھے ہیں۔ دیکھیے اس میں یہ آپ GRADATION ادب میں نہ کیجیے۔

جاوید:

نہیں گریڈیشن کی بات نہیں ہے۔

قرۃ العین حیدر:

اصل میں ہر ایک ذرہ جو ہے اپنی جگہ آفتاب ہے اگر آپ نے ایک ہی چیز لکھی اور لکھ کے چھوڑ دی تو وہ یاد رہے گی اگر اس کا IMPACT رہے گا۔

جاوید:

جیسے اشفاق احمد کا گڈریا۔

قرۃ العین حیدر:

اشفاق احمد کا گڈریا۔ ابھی ابھی ایک کہانی میں نے پڑھی انور عظیم کی، پرسوں ترسوں باقر مہدی کے رسالے اظہار میں مجھے اس کا عنوان یاد نہیں رہا (گورستان سے پرے) اچھی کہانی ہے پاورفل کہانی ہے۔

جاوید:

اچھا تو اردو کے بالکل نئے جو لکھنے والے ہیں 1960 کے بعد جو منظر عام پر آئے جن میں انور خاں ہیں، سلام بن رزاق ہیں، شوکت حیات، شفق ہیں، قمر احسن اور مشتاق مومن انور قمر اور ساجد رشید تو ان سے آپ واقف ہیں یا کہ یہ نام آپ کے لیے اجنبی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں پڑھا ہے میں نے ان کو ان میں سے کافی کو پڑھا ہے اور یہ سب اپنا راستہ بنا رہے ہیں بس یہ ان کو چاہیے کہ یہ ایک CULT میں نہ شامل ہو جائیں، تقلید میں نہ شامل ہو جائیں اپنی اپنی انفرادیت کو باقی رکھنا چاہیے یہ بہت ضروری ہے۔

جاوید:

اچھا اردو کی نئی تنقید سے پتہ نہیں آپ مطمئن ہیں یا نہیں؟

قرۃ العین حیدر:

صاحب دیکھیے تنقید جو ہے وہ بہت ٹھوس چیز ہے اور مجھ میں اتنی عقل نہیں ہے جو میں اس کو سمجھ سکوں۔ تنقید اچھی ہے آج کل بہت اچھی ہے (طنزیہ ہنسی)

جاوید:

تنقید میں شمس الرحمٰن فاروقی......

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے شمس الرحمٰن فاروقی بہت اور یجنل باتیں کہہ جاتے ہیں لیکن بعض دفعہ وہ ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں کہ لگتا ہے وہ محض SENSATION پیدا کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک دفعہ انھوں نے کہا کسی شاعر کے بارے میں ہمارے آج کل کے CONTEMPORARY بہت مشہور شاعر ہیں کہ وہ اردو کا پہلا اور آخری ڈرامہ نگار ہے اب اس طرح کا جو اسٹیٹ منٹ ہے وہ میرے خیال سے ایک قسم کی سنجیدہ بات نہیں ہے یعنی اس طرح کا STATEMENT کیسے دے سکتے ہیں کہ فلاں شاعر اردو کا پہلا اور آخری ڈرامہ نگار ہے تو اس طرح کی تنقیدی میری سمجھ میں نہیں آتی ویسے تو بڑے قابل لوگ ہیں، بہت لکھتے ہیں، بہت پڑھتے ہیں۔

جاوید:

اور یہ آج کل وارث علوی کا نام بہت ہے۔

قرۃ العین حیدر:

وارث علوی میں بہت صلاحیت ہے اچھا لکھتے ہیں وارث علوی اوریجنل بات کرتے ہیں لیکن WORDY بہت ہیں۔

جاوید:

WORDY تو ہے۔

قرۃ العین حیدر:

وارث علوی بہت طویل لکھتے ہیں اگر اسی کو وہ شارٹ کر دیں تو کتنا اچھا ہو اور یہ کہ ذرا وہ بعض دفعہ کچھ......۔

جاوید:

جارحیت......۔

قرۃ العین حیدر:

غیر مہذب الفاظ استعمال کر لیتے ہیں جارحیت تو ہونی چاہیے جو بھی آپ اگر اپنی بات منوانا چاہتے ہیں یا آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو نقاد میں تو جارحیت ہوتی ہے۔

جاوید:

سلیم احمد جو ہیں نئی نظم اور پورا آدمی جن کی کتاب ہے۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں یہ جو ATTITUDE ہے نا اس قسم کی تھوڑی فقرہ بازی کرنا اور جملے یہ سب انھیں حضرت کی شروع کی ہوئی ہے اور یہ عسکری صاحب کے چیلے تھے۔

جاوید:

عسکری صاحب کے چیلے تھے۔

قرۃ العین حیدر:

عسکری صاحب کے چیلے تھے۔ مرحوم کے تو انھوں نے یہ شروع کیا کہ حالی کا مظفر اور یہ کہ پاکستانی کلچر مع اچھے اسلامی ناچوں کے رنگین، تو یہ ان کے ایک مضمون کا عنوان تھا۔

جاوید:

حالی اور مظفر......۔

قرۃ العین حیدر:

حالی اور مظفر تو انھوں نے اس طرح کی چیز شروع کی جو کہ اس قسم کی سنجیدہ تنقید تھی اس

سے مختلف IT WAS INTERESTING READABLE لیکن اس میں یہ ہوا کہ اس میں کچھ سنجیدگی نہیں رہی۔

جاوید:

کچھ جملے بازی تک محدود رہی۔

قرۃ العین حیدر:

جملے بازی......

جاوید:

فقرے سے لکھنا یا جملے لکھنا اپنے طور پر اس کے صحیح معنوں میں تو بے حد مشکل کام ہے۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں سلیم احمد بھی اور بجنل باتیں کہہ جاتے ہیں لیکن بہہ جاتے ہیں۔

جاوید:

اچھا آج عام طور پر بحث کی جاتی ہے کہ آپ کی نئی کتاب کار جہاں دراز ہے، کہ آیا یہ ناول ہے یا سوانحی ناول ہے یا ایک کتاب ہے۔

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے صاحب ناول تو یہ اس لیے نہیں ہے کہ ناول کا اگر آپ یہ مطلب نکالیں کہ ناول فکشن ہوتا ہے تو ناول نہیں ہے لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ سوانحی ناول ہے، بائیوگرافیکل ناول ہے تو وہ ہے اس لیے کہ ناول میں فرضی خیال، کردار ہوتے ہیں اس میں سب اصلی کردار ہیں ساری جو اس کی بیک گراؤنڈ ہے وہ اصلی ہے تو اس کو آپ کیا کہیے گا اس کو آپ ناول نہ کہیے داستان کہہ لیجیے گا۔ آپ مجھے بتائیے میرے خیال سے سوانحی ناول کے علاوہ اور کچھ آیا نہیں تھا میری سمجھ میں کہ اور اس کو کیا کہوں؟ اس کو آپ سا گا نہیں کہہ سکتے کیونکہ سا گا لفظ اردو کا ہے نہیں سوانحی ناول آپ کہہ سکتے ہیں کہ ناول جو ہوتا ہے وہ اصلی کریکٹر کو لے کر بھی لکھا جا سکتا ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے کوئی قانون تو ہے نہیں کسی مذہبی صحیفے میں تو آیا نہیں ہے کہ ناول کے لیے یہی ایک

DEFINATION ہے اس کے آگے آپ بڑھ نہیں سکتے۔ صاحب ہم نے اسے سوانحی ناول کہا ہے تو اسے سوانحی ناول ہی کہیں گے آپ اسے کچھ اور کہہ لیجیے تو کوئی قانون نہیں ہے۔

جاوید:

کلیہ تو بہرحال بنا نہیں سکتے۔

قرۃ العین حیدر:

کلیہ بنا سکتے۔

جاوید:

تو یعنی آپا وقت کے باعث اس سلسلے کو منقطع کرتے ہیں۔ میں ممنون ہوں کہ آپ یہاں تشریف لائیں اور شرمندہ ہوں کہ آپ کو زحمت ہوئی۔

قرۃ العین حیدر:

نہیں صاحب، بہت اچھا سیشن رہا۔

(شاعر، بمبئی 1993)

میرے نزدیک مسجد کی مسماری ایک المناک واقعہ ہے
مسلمان اپنی ہندستانی تہذیب پر فخر کرتا ہے

گفتگو : بھرت واریاوالا، ارا پانڈے

سوال:

1990 میں اڈوانی کی رتھ یاترا کے مجوزہ راستے کے درمیان ایک نعرہ کہیں تحریر تھا کہ 'رام دروہی، دیش دروہی' یہ نعرہ ایودھیا تحریک کا لوح امتیاز رہا ہوگا کیونکہ اس سے رام کو قومیت کی ایک علامت، ہندو بسمارک قسم کی کوئی چیز اور ہندو قوم کا معمار ثابت کرنے کا کام لیا گیا۔ اس میں رام کے پرشوتم ہونے کا تصور شامل نہیں تھا جیسا کہ گاندھی جی کا خیال تھا۔ ان تمام باتوں کو آپ کس طرح لیتی ہیں؟

جواب:

یہ تمام چیزیں اعلیٰ درجے کا سیاسی پروپیگنڈا ہیں۔ اس تحریک کے منظر عام پر آنے تک کسی نے بابری مسجد کا نام تک نہیں سنا تھا یا کوئی اس کی موجودگی کو ہندوؤں کے مذہبی جذبات پر

حملہ نہیں سمجھتا تھا۔ عام آدمی کو تاریخی دستاویزات یا آثار قدیمہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ 'حملہ آور بابر' کو آسیب کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس نے لودھی سلطنت کو تاراج کیا اور ایک مسلمان بادشاہ کو بھی مغلوب کیا، نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں نے ایک اسکولی طالب علم کے طور پر 1941 میں ایودھیا کا سفر کیا تھا۔ وہاں ایک چبوترہ تھا جسے سیتا جی کی رسوئی کہا جاتا تھا۔ وہاں کچھ سادھو اس کے چاروں طرف بیٹھے تھے اور کچھ لوگ وہاں مسجد کے پاس موجود تھے اور یہ سب نہایت پرامن اور قابل دید تھا۔ مجھے وہاں پیڑوں کی ٹھنڈی چھاؤں اور سکون آمیز فضا پوری طرح یاد ہے۔

واجد علی شاہ کے بڑے پوتے پرنس انجم قدر کے مطابق (جواب کلکتہ میں رہتے ہیں) کرنل سلیمین اودھ کے ہر دلعزیز حکمراں کے لیے مسائل پیدا کرنا چاہتا تھا تاکہ انھیں تخت سے محروم کیا جاسکے۔ برطانوی ریزیڈنٹ نے ایک بدھ نجوی کو جھوٹی اور من گھڑت بنیادوں پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہا کہ رام جی ٹھیک اسی جگہ پیدا ہوئے تھے جہاں بابری مسجد ایستادہ ہے۔

سوال:

عموماً تاریخ میں کوئی بات یا واقعہ جو ایک وقت میں بالکل ہی غیر اہم ہو، کسی دوسرے وقت میں اہمیت اختیار کر لیتا ہے، تاریخ کو اکثر متصور کیا گیا ہے۔ مثلاً ہنگیرین (Hungarians) یہ نہیں جانتے کہ ان کا ملک 896 عیسوی صدی میں قائم ہوا جب تک کہ انھیں انیسویں صدی کے اواخر میں قوم پرستوں نے اس کی 'اطلاع' نہیں دی۔ دسمبر 1992 کو بھی بڑی سیاسی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب:

ذاتی طور پر میں ایسا نہیں سمجھتی کہ اس واقعہ کو کوئی بڑی سیاسی اہمیت حاصل ہے۔ 1947 میں دہلی اور اس کے قرب و جوار میں درجنوں مساجد کو مسمار کیا گیا اور انھیں مندروں یا گردواروں میں تبدیل کر دیا گیا لیکن کسی کو اس کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ اس مسماری کو تمام تناسب سے زیادہ مشہور کیا گیا اور یقیناً اس کی پشت پر سیاسی مقاصد کارفرما تھے لیکن درحقیقت ہزار سالہ مسلم حکومت

کا انتقام لینے کے لیے مسجد کی مسماری یا تاراجی کا تصور عام کیا جا رہا ہے جسے میں نہایت مکروہ فعل سمجھتی ہوں۔

سوال:

کیا یہ ہندو قومیت پر اصرار ہے؟

جواب:

یقیناً یہ نہایت پریشان کن امر ہے کہ کچھ ہندو قومیت پرست اور مذہبی لوگ اس مسئلے کو ہوا دے رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں اودھ کے نوابوں، وزیروں اور راجاؤں نے ہنومان جی کے احترام میں بندروں کو ہلاک کرنے پر پابندی لگا دی تھی؟ مسلمان اداکار رام لیلا میں شرکت کیا کرتے تھے؟ (ایسا ایک اداکار اب بھی لکھنؤ میں بقید حیات ہے) انھوں نے اپنی زمین اور دولت مندروں میں چراغاں اور ایودھیا اور کاشی کے مندروں میں روشنی کے لیے دان کر دیں۔ ایک مثال بسم اللہ خاں کی ہے جو مندروں میں شہنائی بجاتے ہیں اور بڑے غلام علی خاں ان مقدس مقامات پر بھجن گایا کرتے تھے لیکن ان باتوں کو اب کوئی یاد کرنا نہیں چاہتا۔ دوسرے دن میں نے تغلق کے قلعہ کو دیکھا جو ریزہ ریزہ منتشر ہو رہا ہے۔ دوسری جانب جنوبی ہند میں ایک مندر کے کلش پر گہرے نیلے رنگ کا غازہ چڑھایا جاتا ہے۔ میں نے اس تہذیبی تخریب کاری پر للت کلا اکادمی کے ایک جلسے میں سخت ناگواری کا اظہار کیا تھا۔

میرے نزدیک مسجد کی مسماری ایک المناک واقعہ ہے کیونکہ عبادت خانوں کو مسمار کرنا قدیمی اور وسطی عہد کی ایک جنگی کارروائی تھی۔ تقسیم کے وقت بھی آپ نے اس قسم کی سازش کے تحت پیدا کی ہوئی منافرت نہیں دیکھی ہوگی جو آج دیکھنے کو مل رہی ہے اور یہ سب کلی طور پر ذہنی صفائی کی ایک تحریک کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں کو بلی کا بکرا بنایا جا رہا ہے اور ان تمام خرابیوں کا ذمہ دار قرار دیا جا رہا ہے، جن کا شکار ہندستان ہے۔

سوال:

لیکن اس تحریک کو بڑے پیمانے پر عوامی تعاون حاصل ہے؟

جواب:

یقیناً لیکن ایسا اس لیے ہے کہ یہ کہیں نہ کہیں ہندو نفسیات کے کسی گروہ کو چھوتا ہے۔ جب 'ہندوتو' کے داعی یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے لگ بھگ تیس ہزار ہندو مندروں کو توڑا تو انھیں یقین آجاتا ہے۔ انھوں نے تیس ہزار مندروں کو کس طرح شمار کیا؟ میرے ایک دوست لالہ بھیشور دیال نے جو ہندو مسلم تہذیبی اتحاد کی بہترین مثال تھے، مجھے بتایا تھا کہ ہندوؤں کے خیال سے تیس ہزار مندر توڑے گئے تھے۔

سوال:

کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ یہ مسلمانوں کے درمیان جدیدیت کی کمی ہے جو آج ہندو مسلمان کے آپسی بگڑتے ہوئے روابط کا اہم سبب ہے؟ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ مسلمان مذہبی قدامت پسندی میں غرق ہیں۔ مروجہ تصویر یہ ابھرتی ہے کہ دورِ حاضر میں ایک جدید ہندو، غریب اور قدامت پرست مسلمان کے مقابل ہے۔

جواب:

یہ کہا جاسکتا ہے کہ جزوی طور پر مسلمان خود اپنی موجودہ صورتِ حال کے ذمہ دار ہیں۔ عالم اسلام میں انھیں مغربی استعماریت سے نبرد آزما اسلامی علامت کے طور پر لیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود مصر، شام، ترکی، الجزائر وغیرہ ملکوں میں مذہبی رواداری کا عمل جاری رہا ہے۔ ہندستان میں اس کا منبع مذہب کو قرار دیا گیا کیونکہ بالآخر جنگ آزادی کو بھی یہی رنگ دے دیا گیا۔ مذہب کے نام پر جناح نے دو قومی نظریے کے تائید و تعلیل کی جبکہ شاید خود ان کی زندگی میں مذہبی استدلال نہیں پایا جاتا تھا۔ پھر بھی انھوں نے ایک قانونی عقیدے کے طور پر اسلام کی فلاح کا نعرہ بلند کیا۔ پاکستان کے قیام کے فوراً بعد انھوں نے ہندو مسلمان کے تضاد کو ختم کرنے کے لیے آواز بلند کی لیکن جب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

قومی حتیٰ کہ انقلابی تحریک میں بھی مسلمان رہنماؤں کی کثیر تعداد شامل تھی۔ بمبئی کے کاٹن کنگ (Cotton King) عمر سبحان کو سزا دینے کے لیے انگریزوں نے مانچسٹر کاٹن کی قیمت راتوں

رات گھٹا کر اسے بھکاری بنا دیا کیونکہ اس نے انڈین نیشنل کانگریس کو مالی تعاون بہم پہنچایا تھا۔ مسلمان انقلابیوں کی ایک بڑی تعداد کو پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا گیا۔ بہتوں نے 1916 میں کابل میں آزاد ہند حکومت قائم کی اور بے شمار افراد قید میں جاں بحق ہو گئے۔ مولانا حسرت موہانی پہلے شخص تھے جنھوں نے مکمل سوراج کا مطالبہ کیا۔ ان ہی لوگوں نے ہندستانی عوام کو 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ دیا۔ مسلم لیگ کا احیا تو بعد میں 1935 میں ہوا۔ بدقسمتی سے مولانا آزاد جنھوں نے یہ فرمایا تھا کہ "میں اپنے بیک وقت ہندستانی اور مسلمان ہونے میں کوئی اختلاف نہیں پاتا۔" آج پورے طور پر فراموش کر دیے گئے ہیں۔ آپ دیکھیں کہ برطانیہ بیک وقت عیسائی بھی ہے اور انگریز بھی لیکن اس درمیان کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ گزشتہ پچاس برسوں میں ہندستانی مسلمانوں کا بڑا حصہ اپنے خول میں بند ہو گیا ہے۔ اس سے بات اور بگڑتی ہے جب کسی مسلمان کو یہ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ اپنی پنج وقتہ نماز پابندی سے ادا کرتا ہے تو وہ بنیاد پرست ثابت ہوتا ہے۔

سوال:

کیا یہ ممکن ہے کہ آزادی کے بعد سے یہاں جس طرح سیکولرزم کی تبلیغ کی گئی اور اس پر عمل درآمد ہوا وہ مسلمانوں کے پچھڑے پن کی ایک بڑی وجہ تھی؟ مثلاً ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ سیکولرزم کے نام پر ہندو مت (ہندو کوڈ بل) میں اصلاحات لائی گئیں لیکن اسی دوران مسلمانوں کی مذہبی دقیانوسیت کو پوری طرح پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ جب اسلام کی بات آتی تھی تو حکومت کا موقف عدم مداخلت کا ہوتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس نے مسلمانوں کو ہر قسم کا تحفظ فراہم کیا، جو بھی وہ چاہتے تھے لیکن مذہبی اصلاحات کے لیے انھیں ذرا بھی متحرک نہیں کیا گیا جس طرح ہندوؤں کو کیا گیا تھا۔ کیا یہ وضاحت استدلالی ہے؟

جواب:

ہاں! کسی حد تک۔ اگرچہ ہندستان میں آزادیٔ نسواں اور دوسری اصلاحات کی تحریک ایک صدی سے پہلے شروع ہو چکی تھی اور اس تحریک کو کچھ کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی۔ اس صدی کے ابتدائی سالوں میں ساڑی ہندستانی مسلمان عورتوں کے درمیان جدیدیت کی علامت تھی۔

مسلمان عورتیں 1898 میں ہی اپنا پریس قائم کر چکی تھیں۔ وہ اپنے رسالے خود نکالتی تھیں۔ آزادیٔ نسواں کی جدوجہد میں ہندستان کی باقی تمام عورتوں کے ساتھ مسلمان عورتوں کی شرکت اور اشتراک اسی احساسِ وحدت کا نتیجہ ہے۔

سوال:

سرکردہ مغربی اسکالر سر برنارڈ لیوس(Sir Bernard Lewis) کے اس بیان پر آپ کا کیا ردعمل ہوگا کہ اسلام اور جدیدیت کے درمیان ایک بنیادی تضاد پایا جاتا ہے؟

جواب:

نہیں! یہ اسلام کا ایک مغربی تصور ہے۔ سر برنارڈ ایک یہودی ہیں۔ یہودی مذہب کے تحت آپ 'سبت' کے دن کوئی کام نہیں کر سکتے اور اسرائیل میں دقیانوسی خیالات کے یہودی اس پر عمل بھی کرتے ہیں اور انھیں بنیاد پرست نہیں کہا جاتا اور مغرب میں کوئی بھی یہ نہیں کہتا یا سمجھتا کہ یہودی مذہب جدیدیت کے متضاد ہے۔ مغرب میں اسلام کو ہمیشہ متعصب پریس (ذرائع ابلاغ) کا سامنا رہا اور اب یہی صورتِ حال ہندستان میں ہے۔ بدقسمتی سے سلمان رشدی کے خلاف ایران کے امام خمینی کا فتوئی اور سعودی عرب کا موقف اور ہندستان میں شاہ بانو کیس میں پیدا ہوئی صورتِ حال نے اس منفی تاثر کو تقویت پہنچانے میں خاصا رول ادا کیا ہے۔ یہ سوچنا قطعی غلط ہے کہ ہندستان کے مسلمان مذہبی کٹر پن کے شکار ہیں۔ مثال کے طور پر دس سال پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے آٹھ شعبوں کی صدر عورتیں تھیں۔ دراصل ہم نے اپنے ذہن میں برقعہ اوڑھی ہوئی عورتوں کا تصور بٹھالیا ہے جو صحیح صورتِ حال کو سمجھنے میں حائل ہوتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کے یہاں انتہا پسندانہ رویہ کو ناپسندیدہ تصور کیا جاتا ہے۔ چند برس قبل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے معروف رائڈنگ کلب (Riding Club) کے کیپٹن کے طور پر ایک لڑکی کا انتخاب کیا گیا تھا تو اس وقت بھی اثر دار جماعتوں نے اس کے خلاف کافی احتجاج کیا تھا۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مسلمان مرکزی دھارے میں شامل نہیں ہیں تو اس سے آخر ہماری مراد کیا ہوتی ہے؟ یہ مرکزی دھارا کیا ہے؟ مسلمان کھیل کے میدان میں ہیں، موسیقی، ادب،

تعلیم، سیاست، صحافت، مصوری، تفریحی صنعت اور دست کاری ہر جگہ مسلمان موجود ہیں۔ مسلمان بچے گزشتہ پچاس برس سے ہندی پڑھ رہے ہیں۔ مرکزی دھارا اور کیا ہے؟

سوال:

آپ آج کی دہلی اور پچاس سال قبل کی دہلی میں کیا فرق محسوس کرتی ہیں؟

جواب:

1975 میں دوردرشن پر آخری مغل شہزادے سے یہی سوال پوچھا گیا تھا۔ ان کا جواب تھا: ''پہلے کھانے جدا جدا تھے، دل ایک تھے، اب دل الگ الگ ہیں، کھانے ایک ہیں۔''

سوال:

ایودھیا کا معاملہ ایک واضح نشانِ فاصل ہے جو کچھ وہاں ہوا وہ اس عمل کا ایک متشدد اظہار تھا جو کافی عرصے سے جاری تھا۔ ہندوؤں کا شہری، متحرک اور متوسط طبقہ عالمی سطح پر مسلمانوں کی نام نہاد اسلامی بنیاد پرستی کے تفاوق میں ملک میں مسلمانوں کی ایک جارح قوم کی شکل میں شبیہ کی تشہیر چاہتا ہے تا کہ اس بنیاد پر وہ خود کو مستحکم کر سکے۔ ''ان کے خلاف ہم'' کا اصول وہ بنیاد ہے جس پر تمام قوم پرستانہ تصورات تعمیر کیے جاتے ہیں اور ہندوتو اس سے مستثنا نہیں ہے۔

جواب:

میرا خیال ہے کہ یہ بھی عالمی بازار سے پوری طرح مربوط ہے۔

سوال:

جب تک آپ اپنے مذہب کو پوری طرح نہ سمجھتے ہوں تب تک آپ اور زیادہ مدافعت پسندی کا اظہار کرتے ہیں کہ کہیں آپ اپنے مذہب سے محروم نہ ہو جائیں؟

جواب:

ایک بات میری سمجھ میں آج تک نہیں آسکی کہ مثلاً دہلی اور یوپی میں 'بنیا' طبقہ بی جے پی میں سب سے آگے ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو صدیوں سے مسلمانوں کے ساتھ گہرے بازاری ربط کے حامل رہے ہیں۔ ان ہی لوگوں کے پاس مسلمان اپنی جائیداد اور ملکیتیں رہن رکھتے ہیں

اوران سے روپے لیتے ہیں۔

سوال:

دونوں فرقوں کے درمیان اتنی گہری منافرت اور دشمنی کیوں ہے؟

جواب:

میرے خیال سے یہ پریس، ذرائع ابلاغ اور دونوں فرقوں کے درمیان مناسب رابطے کی کمی کی وجہ سے ہے۔

سوال:

نہیں! یہ تو ایک طویل کہانی کا چھوٹا سا حصہ ہے۔ اس کی اصل وجہ تو مسلم قیادت ہے۔ آج مسلمانوں کے حق میں جس قسم کے لوگ آواز بلند کرتے ہیں مثلاً سید شہاب الدین یا امام بخاری وغیرہ، انھیں بہت سے ہندو مذہبی کٹر پنتھی کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور یہی وہ احساس ہے جو ان دو فرقوں کے درمیان خلیج کو وسیع کر رہا ہے۔ آج آزاد خیال مسلم قیادت کا بحران ہے۔ آج قدوائی اور آزاد جیسے لیڈر موجود نہیں ہیں۔

جواب:

دیکھیے! تمام باتوں کا نچوڑ یہ ہے کہ جب تک نئی قیادت سامنے نہیں آتی، ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟ قدوائی جیسے لوگ ماقبل آزادی کے دور سے تعلق رکھتے ہیں جن کی تربیت گاندھی وادی افکار کے ذریعے ہوئی تھی۔ طیب جی کے خاندان کو دیکھیے... وہ نسل اب ختم ہوگئی ہے۔

جاگیردار اشرافیہ طبقہ ختم کر دیا گیا۔ حیدرآباد کے نظام، زمانے سے مسلمان کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے واسطے انگلینڈ بھیج رہے تھے۔ (سروجنی نائیڈو خود بھی نظام اسکالرشپ حاصل کیے ہوئے تھیں۔) آزادی کے بعد روشن خیال مسلمانوں کا بڑا متوسط طبقہ پاکستان ہجرت کر گیا۔ غریب اور غیر اہم فن کار طبقہ بچ گیا۔ ان کا کوئی قائد نہیں تھا اور ملاؤں نے اسی دوران اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ ایک نیا متوسط طبقہ آہستہ آہستہ بلند ہو رہا ہے لیکن یہ طبقہ بھی بے لگام صارف معاشرے کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ بابری مسجد ایکشن کمیٹی نے اس تمام

بکھیڑے میں خاصی دولت کمائی ہے۔

سوال:

ہندو مسلم قضیے کو دونوں طرح سے استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ ایک قسم (Type) کے بارے میں سوچیں۔ ایک فرد (Individuals) کے بارے میں نہیں۔ یہ کہنا آسان ہے کہ میں ایک فرد کی حیثیت سے ہوں، میری کوئی قسم نہیں ہے، لیکن کیا یہ امتیاز ایک حل پذیر مسئلے میں کسی طور معاون ہوسکتا ہے؟ ایک ایسی مشکل گھڑی میں جس میں کہ ہم آج جی رہے ہیں لوگ آسانی کے ساتھ ایک دوسرے کو ایک قسم کی حیثیت سے شناخت کرتے ہیں، فرد کی حیثیت سے نہیں۔ دوسری تمام قسموں کی شناختیں جن کی بنیاد پر مشترکہ پڑوس، گاؤں، پیشہ یا تجارت ہوتی ہے، کسی بھی قسم کے بحران یا مشکل کے وقت ایک مذہبی شناخت میں گم ہو جاتی ہے۔

ایسے کئی آزاد خیال اور سخت موقف والے ہندو موجود ہیں جو اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان پہلے تو امت کا ایک فرد ہے بعد میں ہی وہ ایک قومی فرقے کا۔ کچھ تو یہ سوال بھی کر بیٹھتے ہیں کہ کیا کوئی مسلمان کسی ایک ملک کا شہری بھی ہوسکتا ہے، جو مسلمان یا اسلامی نہ ہو۔

جواب:

یہ بالکل احمقانہ خیال ہے۔ 'امت' کی اصطلاح سب سے پہلے پاکستان میں ضیا الحق نے مشہور کی اور اس کا محرک سعودی عرب تھا۔ یہ ایک نہایت ہی مبہم تصور ہے جو بیشتر جماعت اسلامی ذرائع ابلاغ کے ذریعے استعمال ہوتا ہے۔ آپ اگر دیکھیں تو روزمرہ کی زندگی میں مسلمان بنیادی طور پر اپنے خاندان، اپنے محلے، اپنے گاؤں، اپنے شہر سے جڑا ہوا ہے۔ وہ اپنی ہندستانی تہذیب پر فخر کرتا ہے۔ اس نے اس وسیع المشرب اور امیر تہذیب کی صدیوں سے آبیاری کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ 'ہندوتو' کے نومولود تصور کو بے جا سمجھتا ہے۔ یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ 'ہندوتو' کے داعی مسلم لیگ کے دوقومی نظریے کی زبان بول رہے ہیں۔ ہم آج ایک عالمی انتہا پسندی اور تشدد کے دور میں جی رہے ہیں۔ مثلاً مشرق وسطیٰ مغرب میں آئی آر اے اور ہمارے بہت قریب ایل ٹی ٹی ای حتیٰ کہ بدھ بھکشو تک جنگ جویانہ سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔

میں نے چند برس قبل لندن کے ہائیڈ پارک میں دیوار پر چسپاں ایک پوسٹر دیکھا تھا جس میں ایک غضب ناک مسلمان کو اپنی تلوار لہراتے ہوئے دکھایا گیا تھا اور اس پر تحریر تھا 'عیسیٰ مخالف'۔ اس طرح مسلم جنگجو کو کمیونسٹ بھوت کی جگہ دی جا رہی ہے۔ یہاں ہندستان میں بلند بانگ پروپیگنڈے کے ذریعے مسلمانوں کو 'بابر کی اولاد' ثابت کیا جا رہا ہے۔ یہ پورا منظر نامہ نہایت دہشت انگیز اور بھیانک ہے۔

(تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، جون 1997)

اردو کا رسم الخط اس کا لباس ہے

گفتگو : فیروز بخت احمد

عینی آپا اردو کی معروف شخصیت ہیں جو اتر پردیش کے ایک نامی گرامی ادبی خاندان کی ایک فرد ہیں۔ سچائی تو یہ ہے کہ آج رقم کی جانے والی تاریخ کو جب آنے والی نسلیں پڑھیں گی تو انھیں یہ سوچ کر یقیناً ملال ہوگا کہ وہ بھی اس عہد میں کیوں نہ ہوئے کہ جب سجاد حیدر یلدرم کی چہیتی بیٹی اور عظیم ادیبہ قرۃ العین حیدر کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اس صدی کی پیشانی پر کندہ ہو رہا تھا۔

ہمیں یہ فخر ہے کہ ہم قرۃ العین حیدر (عینی آپا) کی تحریروں کو دیگر زبانوں کی عالمی معیار کی تحریروں کے مقابلہ میں بھی نمایاں اور منفرد حیثیت کا حامل پاتے ہیں۔ انسانی احساسات و نفسیات اور تاریخ کا تجزیہ جس باریکی سے انھوں نے کیا ہے اس کا گواہ ان کا لافانی ناول 'آگ کا دریا' ہمارے درمیان موجود ہے۔

عینی آپا کی سوچ اور فکر کی جامعیت و بلاغت کو سمجھا جائے اور ان کی تحریر کی جہتوں کو تلاش کیا جائے تو بلاشبہ آج کی نثر میں وہ ہمیں غالب کی ہم رتبہ نظر آئیں گی۔

عینی آپا مصوری سے بھی شغف رکھتی ہیں، ان کی آئل پینٹنگز بھی شامل اشاعت کی جا

رہی ہیں۔ ہمارے قارئین کے لیے یقیناً یہ نئی معلومات ہوں گی کہ ان کی تصاویر لندن کی نمائش گاہوں میں بھی رکھی جا چکی ہیں۔ بطور مصور ہی نہیں بلکہ انھوں نے بطور ایک جرنلسٹ اور پبلسٹی ریلیشن آفیسر بھی کام کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ انھیں معلوم ہے کہ بعض مرتبہ کیسے کیسے لوگوں کو 'بلڈ اَپ' (Build-up) کیا جاتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ خود اپنی پبلسٹی کرانا عجب مسخرہ پن سا لگتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے اس سے مفر نہیں۔

عینی آپا، اخبارات ہوں یا رسائل، ٹی وی ہو یا ریڈیو، کسی بھی طرح کا انٹرویو دینے سے پرہیز کرتی ہیں لیکن قارئین عالمی سہارا کے لیے فیروز بخت احمد کے ذریعہ کیا گیا یہ انٹرویو کسی یادگار تحفہ سے کم نہیں۔

فیروز بخت:

عینی آپا آپ کے خیال میں ادب، سماج اور ادیب میں کس طرح کا رشتہ ہے؟

قرۃ العین حیدر:

ہر ملک کے ادب کا منظر اس کے سیاسی، معاشی اور سماجی حالات سے جڑا ہوتا ہے بلکہ یہ کہیے کہ ان کا نمائندہ ہوتا ہے۔ ملک کے حالات کا اثر پڑتا ہے ادب پر۔ ملک میں جس طرح کی سیاست کا غلبہ ہوگا، اس کا اثر ادیب پر ضرور پڑے گا۔ ظاہری بات ہے کہ ادیب جنگل میں تو لکھ نہیں رہا ہے۔ یہ ایک الگ چیز ہے کہ حالات سے اس کا رشتہ کیا ہے، وہ خوش ہے یا ناخوش۔ چاہے ادیب کسی بھی فریم ورک میں اپنی تخلیقات تحریر کرے، سیاسی، معاشی اور سماجی اثرات کا اثر وہ ضرور لے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت سے ادیب یہ کہتے ہیں کہ وہ آزادی کے ساتھ کام کر رہے ہیں یا یہ کہ ان کے خیال باغیانہ ہیں۔

فیروز بخت:

اردو ادب کا آپ کے خیال میں آج پس منظر کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

جہاں تک اردو ادب بلکہ تمام ایشیا کے ادب کا تعلق ہے، اس میں منفی سوچ (Negative

غالب نظر آتی ہے۔خوشی کی وہ اہمیت نہیں ہے جو ہمارے یہاں یاس کی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو ادب میں دنیا کو فانی سمجھا گیا ہے۔اس چیز نے پوری سوچ کو منفی بنادیا ہے۔خوشی کے مقابلہ غم کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔اسی کے مقابلہ اگر ہم مغربی لٹریچر کو دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں بہتر و برتر تعلیم کی وجہ سے خوشی کو جائز اہمیت دی گئی ہے۔منفی سوچ ہمارے یہاں زیادہ ہے۔ (Thinking

فیروز بخت:

کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے زمانہ میں اردو آج کہاں کھڑی ہے؟

قرۃ العین حیدر:

بھئی میں تو کمپیوٹر جانتی نہیں، یہ کیا ہوتا ہے۔ مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا آج کا زمانہ ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے، لڑکے لڑکیاں ادب کے مقابلہ تکنیکی کورسز کو زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔ آج کل جو ذرائع ہیں تفریح اور دلچسپی کے وہ بھی بے شمار، وسیع ہو گئے ہیں۔ ہماری دنیا موجودہ دنیا سے بہت مختلف تھی۔ ہماری جنریشن میں ایکٹیویٹیز (activities) بہت کم ہوتی تھیں لہٰذا ادب کا اہم مقام تھا۔اب سے 50 سال قبل کا زمانہ بڑا مختلف تھا کہ لوگ اخبار پڑھ رہے ہیں، رسائل پڑھ رہے ہیں اور کتابیں پڑھ رہے ہیں۔ یہی نہیں اس وقت یہ تمام چیزیں بڑے شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ ہر گلی، محلہ، کوچہ میں بے شمار لائبریریاں ہوا کرتی تھیں جن سے بچے و بڑے کرایہ پر کتابیں لاکر پڑھا کرتے تھے۔ زمانہ بدلتا ہے، وقت بدلتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی دلچسپیاں بڑھتی ہیں۔ اب ٹی وی آ گیا ہے، ٹی وی کے ساتھ بے شمار چیزیں ہیں۔ اب جو 'رٹن ورڈ' (Written Word) ہے، میرے خیال میں اب اس کی اہمیت نہیں رہی ہے، سننے والے لفظ کی زیادہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میرا خیال غلط ہو کیونکہ آج بھی لوگ پڑھ رہے ہیں، رسالے اب بھی نکل رہے ہیں لیکن آپ کا کیا خیال ہے؟ (ہم نے ان کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا) آج کل بچوں میں، نئی جنریشن میں اتنا صبر نہیں ہے، اتنا پیشنس نہیں ہے کہ بیٹھ کر کہانی پڑھیں یا ناول پڑھیں۔ ان کی دلچسپیاں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں اور وہ بکھر گئی ہیں۔

فیروز بخت:

آپا آپ کی ملاقاتیں تو مایہ ناز ادیبوں، شعرا وغیرہ سے رہی ہوں گی، جیسے فراق گورکھپوری، فیض، مجاز، عصمت چغتائی، مہندر سنگھ بیدی سحر، کرشن چندر، ہاجرہ مسرور، رضیہ سجاد ظہیر۔کوئی دلچسپ واقعہ بیان کریں۔

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے ایسا ہے کہ جس زمانہ میں یہ لوگ اپنے عروج پہ تھے یعنی کہیں چندر کا ڈنکا بج رہا ہے، کہیں بیدی کا ڈنکا بج رہا ہے، کہیں عصمت آپا کا ڈنکا تھا، اس وقت ہم پڑھ رہے تھے اور ان سے بے انتہا متاثر تھے۔ایک مرتبہ پہلی بار میں بیدی سے ملی۔بہت زمانہ کی بات ہے۔تو میں نے کہا بیدی صاحب ''میں تو آپ سے بہت مرعوب تھی، میں تو آپ سے بڑی متاثر تھی۔'' (قہقہہ لگاتے ہوئے) وہ کہنے لگے ''یہ تھی، تھی کیا کر رہی ہیں!'' میں نے پھر کہا ''نہیں، واقعی میں آپ سے بڑی مرعوب تھی!'' انھوں نے کہا '' پھر آپ نے تھی... تھی کہا۔'' ظاہر بات ہے کہ وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ وہ تمام ادیب اچھے تھے، بہت اچھے تھے۔یہ دلدار لوگ نہیں تھے بڑے نارمل لوگ تھے، میں اس نتیجہ پر پہنچی۔عصمت آپا سیدھی تھیں۔ان کو لوگوں کو شاک پہنچانے میں مزہ آتا تھا مگر جو بھی ہو یہ سب اچھے لوگ تھے۔

فیروز بخت:

آپ کے خیال میں اردو زبان کا بہترین دور کون سا رہا؟

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے، ہر دور اپنے وقت کے حساب سے اردو کا بہترین دور تھا۔آپ چاہیں تو مولانا محمد حسین آزاد کے زمانہ کو بہترین دور مان سکتے ہیں۔مگر میری رائے پوچھیں گے تو میں کہوں گی کہ رتن ناتھ سرشار کا دور اردو ادب کو سرخ رو کرنے والا دور تھا۔اس کے بعد زمانہ بدل گیا، دوسرے حالات پیدا ہوئے۔سیاست بدلی، زمانہ کی رفتار بدلی۔مختلف 'ویلیوز' (اقدار) سامنے آگئیں۔تو بعد کے دور کے جو لوگ آئے تو انھوں نے کہا کہ ان کا زمانہ اچھا ہے۔اب جو ترقی پسند گروپ تھا،

وہ اپنے کو سب سے بہتر سمجھتا تھا۔ اس کے سامنے سب ہیچ تھے، سب دقیانوسی تھے۔ لیکن وہ دور بھی ختم ہو گیا۔ نئے لوگ آئے تو انھوں نے کہا کہ یہ سب بے وقوف تھے اور جو بھی ہے وہ ہم ہی ہیں۔ ہاں، یہ تو سب ہوتا ہی رہتا ہے۔ آج کل کے زمانہ میں ہم کسی چیز کو 'ڈومینٹ ٹرینڈ' (غالب رجحان) نہیں سمجھ سکتے۔ جہاں تک میرا خیال ہے کہ جو جوش اور ولولہ اس وقت کے رائٹرز میں تھا، وہ آج نہیں ہے۔ ایک جو 'سینس آف اچیومنٹ ہوتا ہے' (کامیابی کا احساس) وہ آج نہیں ہے۔ منزل پر پہنچنے کا زمانہ آج یہاں بہت سے لوگوں کے بیچ نہیں آیا۔ تو یہ حالات اتنے تیز اور گڈمڈ ہیں آپس میں کہ آپ کوئی قطعی بات نہیں کہہ سکتے۔ آپ صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ 'اِٹس اے اسٹیٹ آف کنفیوژن' (یہ بے یقینی کا دور)۔

فیروز بخت:

بہت سے لوگ آج کل کہتے ہیں کہ اردو مر رہی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے یہ بہت ہی گھسا پٹا سوال ہے، یہ سوال تو ہر کوئی کرتا ہے، چھوڑیے یہ سب! (جواب دینے کے لیے گزارش کی گئی تو وہ بولیں) بھئی اردو ختم ہو رہی ہے وہ تو حالات کے اوپر منحصر ہے۔ اب اگر اردو ختم ہو رہی ہے تو اس کے لیے کوئی ایک وجہ نہیں ہے، بے شمار اس کی وجوہات ہیں جو سیاسی، سماجی ہیں۔ جو لوگ پہلے اردو پڑھتے تھے، لکھتے تھے، جن کے لیے اردو بقول شخصے روزی روٹی تھی، اب وہ بات نہیں رہی ہے۔ اردو کے لیے یہ کہنا صرف ایک اتار چڑھاؤ کی بات ہے۔ بہر حال اردو زندہ ہے۔ مسئلہ سارا اسکرپٹ (Script) کا ہے اور اسکرپٹ میرے خیال میں بے انتہا ضروری چیز ہے۔ اردو کا جو لباس ہے، وہ اس کی اسکرپٹ ہے۔ آپ اردو کو رومن میں لکھیے، چینی میں لکھیے، ہندی میں لکھیے، جرمن میں یا کسی دوسری زبان میں لکھیے وہ بات نہیں بنے گی۔ جس کا جو لباس ہے وہ اسی پر اچھا لگتا ہے۔ اگر ہم چینی لباس پہننے لگیں تو کتنا عجیب لگے گا۔ مثال کے طور پر اگر ہم اردو میں 'سہارا' لکھیں گے تو 'س' سے ہی لکھیں گے، 'ص' سے نہیں۔ 'ثواب' لکھیں گے تو 'ث' سے ہی لکھیں گے 'س' سے نہیں اور 'صادر' لکھیں گے تو 'س'

سے نہیں۔ یہی تو اردو کی خاصیت ہے۔ اردو میں ان الفاظ کا ایک خاص 'پیٹرن' (Pattern) ہے اور ہر لفظ کی الگ 'امیج' (Image) ہے۔ اگر ہم 'سہارا' کو 'ص' سے لکھیں گے تو آنکھوں کو کھٹکے گا۔ ہمارا ذہن اسے قبول نہیں کرے گا لہٰذا سوال یہ ہے کہ ہم اردو کی اسکرپٹ کو کیوں بدلیں؟ جو لوگ کہتے ہیں کہ اردو کی اسکرپٹ بدلی جائے تو یہ لنگوسٹک فاشزم (Linguistic Fascism) ہے۔ زبان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ یہ مدعا ہی غلط ہے۔ ہر تہذیب کو، ہر زبان کو حق ہے کہ جو اس کا لباس ہے، جو اس کی 'آئیڈنٹیٹی' (شناخت) ہے، وہ اس پر قائم رہے، اگر اس سے کسی کو کوئی نقصان نہ ہو۔ اردو سے کس کو نقصان ہے؟ زبان بچے کی شخصیت، اس کے تلفظ، اس کی تہذیب اور زندگی پر بڑی گہری چھاپ چھوڑتی ہے۔ اگر مادری زبان میں بچے کی پرورش ہو تو وہ بچہ زندگی بھر ناکامیاب نہیں ہوگا۔ اردو پڑھنے والا بچہ یہ کبھی نہیں کہے گا ''بیٹھو جی!'' وہ کہے گا ''برائے مہربانی تشریف رکھیے۔'' تہذیب کا معاملہ زبان سے جڑا ہوا ہے۔ اردو کی سب سے بڑی پہچان اس کی تہذیب ہے، اس کے آداب ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو کو تہذیب نے بنایا تھا لہٰذا ہم کیوں بدلیں اردو کی اسکرپٹ کو۔ یہ سب سیاسی معاملات ہیں۔

فیروز بخت:

آپ نے ہند و پاک و دیگر ممالک میں اردو کے بے تحاشہ رسائل و اخبارات وغیرہ میں اپنی تحریریں دی ہیں، کچھ بتائیں۔

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے جو رسالے ہمارے گھر آتے تھے وہ تھے 'ہمایوں'، 'نیرنگ خیال'، 'عالمگیر'، 'ساقی'، 'نقوش'، 'ادب لطیف' اور نہ جانے کون کون سے۔ یہ تمام رسالے بڑے معیاری ہوا کرتے تھے۔ 'نیرنگ خیال' تو عجیب و غریب جہازی سائز میں نکلا کرتا تھا۔ اس کے جو سالنامے ہوتے تھے وہ بہت ہی بھاری بھرکم ہوا کرتے تھے۔ پھر شاہد احمد دہلوی کا 'ساقی' خود میں ایک عجوبہ تھا۔ ان رسالوں کے جو مدیر تھے وہ خود بڑے قابل، عالم و فاضل ہوا کرتے تھے اور سماج میں ان کا ایک

اہم مقام ہوا کرتا تھا۔ 'ہمایوں' کے مدیر میاں بشیر احمد بڑی ادبی ہستی تھے۔ وہ دنیا ایک بڑی مہذب دنیا تھی۔ آج کے زمانہ جیسی نخرے بازی، چھینٹا کشی، فقرے کسنا، پھبتیاں کسنا، گالی گلوج، ذاتیات پر حملہ وغیرہ کرنا اس زمانہ میں نہیں تھا۔ آج ادب کے نام میں 'ریکیٹیرز' (Racketeers) (شعبدہ باز) کھڑے ہو گئے ہیں۔ پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔ آج نفسا نفسی کا زمانہ ہے۔ 'فلکس' (Flux) ہے مارا ماری ہے۔ ان تمام باتوں کا اثر ادب پر بھی پڑ رہا ہے۔ اس کا وہ معیار نہیں رہا جو پہلے تھا۔

فیروز بخت:

کیا وجہ ہے کہ بچوں کے لیے اردو کا ادب آج ویسا نہیں رہا، جیسا آج سے تقریباً 50 برس قبل تھا؟

قرۃ العین حیدر:

بچے آخر اس آلودگی سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ بچے گلی محلوں میں بنی لائبریریوں سے کتابیں لا کر پڑھا کرتے تھے جن کی جگہ آج ویڈیو کیسیٹس، فلاپیز وسی ڈی نے لے لی ہے۔ آج گھر گھر ٹی وی، وی سی آر وغیرہ موجود ہیں۔ اب بچے بھی وہی پروگرام دیکھتے ہیں جو ماں باپ دیکھتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر پروگرام اول جلول اور لا ابالی قسم کے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بچے اس دور میں وقت سے قبل ہی بڑے ہو جاتے ہیں، ان میں پکا پن آ جاتا ہے۔ اس بات کی ذمہ داری، ہم بدلتے ہوئے وقت کو دیں یا ان کے والدین کو، سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک کہاوت ہے کہ "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں!"

فیروز بخت:

کیا آپ نہیں سمجھتیں کہ بمبئی کی فلم انڈسٹری اردو کے بغیر ناکام رہے گی؟

قرۃ العین حیدر:

میں آپ کی اس بات سے بالکل متفق ہوں کہ اردو کے بغیر ہماری فلم انڈسٹری بے جان اور پھیکی پھیکی سی رہ جائے گی۔ تمام اچھے مکالمات، گیت وغیرہ اردو میں بڑے بھلے لگتے ہیں۔ ممبر

پارلیمنٹ میں بھی آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ آئے دن منسٹر اور ایم پی کبھی غالب، کبھی اقبال تو کبھی فیض یا ذوق کے شعر پڑھ کر اپنی بات کو وزنی بناتے ہیں۔

فیروز بخت:

کیا وجہ ہے کہ اردو کے اہم اخبارات و رسائل جیسے 'شمع'، 'بلٹز'، 'الجمیعت'، 'کھلونا' وغیرہ بند ہو گئے اور ابھی یہ سلسلہ تھما نہیں ہے؟

قرۃ العین حیدر:

کیا 'شمع' بند ہو گیا؟ بڑے افسوس کی بات ہے۔ یہ بھی ایسا لگتا ہے کہ بھائیوں کی لڑائی کا شکار ہو گیا۔ یہی لاہور میں ہوا کہ بھائیوں کی لڑائی میں 'تہذیب نسواں' کا اتنا بڑا ادارہ ختم ہو گیا۔ بالکل اسی طرح لاہور میں ہی 'دارالاشاعت' کا بہت بڑا ادارہ بند ہو گیا۔ یہاں بھی بھائیوں کی لڑائی تھی۔ اردو کے رسائل عام طور پر بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ لاہور کا اردو ہفت روزہ 'پھول' اتنی پابندی سے چھپتا تھا کہ ہر اتوار کو وہ ناشتہ کی میز پر اپنے قاری کے یہاں پہنچ جایا کرتا تھا۔ پڑھنے والا چاہے دلّی میں ہو، کلکتہ میں ہو، کانپور یا مدراس میں ہو۔ ایک مرتبہ بھی یہ پرچہ ایک دن بھی لیٹ نہیں ہوا۔ میری والدہ نذر سجاد حیدر اس کی مدیرہ تھیں۔ اس رسالہ کا حسن دیکھتے ہی بنتا تھا۔ پشاور، پاکستان سے بچیوں کے لیے 'تحریک نسواں' شایع ہوتا تھا۔ وہ بھی بند ہو گیا۔ دہلی سے 'بنات' نکلتا تھا، وہ بھی بند ہو گیا۔ اسی طرح سے 'کھلونا'، 'بانو' اور 'عصمت' بھی بند ہو گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اردو پڑھنے والے کیوں گھٹ گئے ہیں۔ مولانا آزاد کے زمانے سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ اردو تعلیم پچھڑی ہوئی ہے، مگر کس کو اس کی فکر ہے۔ مولانا سے جتنا ہوا سو کر گئے۔

آج ان رسالوں کے ساتھ یہ مسئلہ درپیش ہے کہ اردو کے پڑھنے والوں کی تعداد روز بروز گھٹتی جارہی ہے۔ ہمارے جو اردو میڈیم اسکول ہیں، ان کے لیے بہتر و برتر اسکیمیں بنانے کا کسی کو دھیان نہیں۔ کسی کو خبر نہیں کہ ان کی موجودہ ضروریات کیا ہیں۔ وہ تو ایک ڈھرے پر سالہا سال سے چلائے جارہے ہیں۔ ان کا پرسان حال کوئی نہیں ہے۔

فیروز بخت:

مولانا آزاد کی اردو کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟

قرۃ العین حیدر:

شاندار! ایک عظیم المرتبت ادیب، عالم دین، صحافی اور تعلیم داں تھے وہ۔ مولانا بڑے ہی سویٹ (اچھے) انسان تھے۔ ان کی قابلیت کا کیا کہنا! ان کی اردو کا کیا کہنا! میرے والد سجاد حیدر مرحوم کے مولانا آزاد وان کے بڑے بھائی مولانا ابوالنصر' آہ' غلام یٰسین سے گھریلو مراسم تھے۔ ان کا خاندان شرفا کا خاندان تھا۔ اردو کے لیے ہی نہیں بلکہ فارسی کے لیے بھی عظیم خدمات انجام دیں مولانا آزاد نے۔

فیروز بخت:

آپ کے پسندیدہ ادیب؟

قرۃ العین حیدر:

اُردو میں؟

فیروز بخت:

جی ہاں۔

قرۃ العین حیدر:

ہر دور میں بڑے اچھے ادیب رہے ہیں۔ رتن ناتھ سرشار کا جواب نہیں۔ ان کی تخلیقات ایسا سمندر ہیں جو تمام زندگی ساتھ چلتا ہے۔ ان کا 'فسانۂ آزاد' تو ادب کا ایسا معرکہ ہے کہ جس کا جواب نہیں۔ ویسے کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو بھی بڑے اچھے ادیب ہیں۔ مجھے ان کا انداز تحریر بہت پسند ہے۔ بیدی کو بھی میں نے پڑھا ہے، مگر وہ بہت خشک ہیں۔

فیروز بخت:

آپ کو اپنی کون سی تحریر سب سے اچھی لگتی ہے؟

قرۃ العین حیدر:

ارے چھوڑیے اس کو! ویسے مجھے اپنا تمام کام پسند ہے۔

فیروز بخت:

آج کل آپ کیا لکھ رہی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

چونکہ تاریخ کو اہم سمجھتی ہوں تو اسی زاویہ سے اپنی سوانح 'کار جہاں دراز ہے' تحریر کر رہی ہوں جس کے تین حصے ہیں۔ میرا زیادہ تر کام تاریخ سے متعلق ہے۔ الفاظ کے کینوس پر تاریخ کے عکس کو پیش کرنا میرا محبوب مشغلہ ہے۔

فیروز بخت:

اردو کو کیسے فروغ دیا جائے؟

قرۃ العین حیدر:

اردو تو پہلے ہی اٹھی ہوئی ہے! اور کتنی اٹھے گی؟ یہ کہیے کہ اسے اور لوگوں تک کیسے پہنچایا جائے۔ اردو کی ترقی کا تعلق اس بات پر منحصر ہے کہ کتنے لوگ اردو پڑھتے ہیں۔ اس کے لیے اسکولوں میں اردو کا بطور تیسری زبان ہونا ازحد ضروری ہے۔ جس زبان کو لوگ زیادہ پڑھتے ہیں، یہ طے ہے کہ وہ ترقی کرے گی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم مارکیٹ میں ہزاروں کی تعداد میں ہندی کے اخبارات و رسائل اور کتابیں دیکھتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ خواجہ حسن نظامی نے ایک نعرہ دیا تھا 'اللہ ہر دم اردو ہر گھر!' کیسے کیسے لوگ تھے۔ کیسے کیسے صاحب طرز ادیب تھے۔

فیروز بخت:

پہلے کی ناول نگاری اور آج کی ناول نگاری میں کیا فرق ہے؟

قرۃ العین حیدر:

(ہنستے ہوئے) یہ تو بہت بڑا موضوع ہے۔ کس قسم اور کس دور کی ناول نگاری کی بات کر رہے ہیں آپ؟ دیکھیے ناول چاہے آج کا ہو یا پہلے کا، 'ریڈیبلٹی' (readability) (لائق مطالعہ)

ہونی چاہیے۔ خواتین کے لیے رضیہ بٹ نے سیدھی سادی عام فہم زبان میں ناول لکھے ہیں جو پسند کیے گئے ہیں۔ جہاں تک کلاسکس کا تعلق ہے، وہ ٹھوس ادبی ناول ہوتے ہیں اور انھیں ادب سے تعلق رکھنے والے ہی زیادہ پسند کرتے ہیں۔ نذیر احمد کا ناول 'مراۃ العروس' باوجود کلاسیکی خصلت کا ہونے کے خواتین میں بہت پسند کیا گیا۔ ویسے ادبی ناول طالب علموں میں زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ ناولوں کا انداز بیان اور پلاٹ سیدھا سادہ اور ہلکا پھلکا ہونا چاہیے۔

فیروز بخت:

آپ اتنی اچھی آرٹسٹ کیسے بنیں؟

قرۃ العین حیدر:

اوہ گاڈ! بچپن سے ہی میری آرٹ اور پینٹنگ میں اسی طرح دلچسپی تھی جس طرح کہانیاں تخلیق کرنے کی۔ مصوری بسا اوقات میرا مرغوب مشغلہ رہی ہے۔ میں نے اپنی والدہ کی بھی تصویر بنائی ہے اور اپنی تین کتابوں کے ٹائٹل بھی ترتیب دیے ہیں۔ میری تصویروں کی نمائش لندن کی آرٹ گیلریز میں بھی کئی مرتبہ ہو چکی ہے۔

فیروز بخت:

عالمی سہارا کے ذریعہ قارئین کو کیا پیغام دینا چاہیں گی؟

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے ہم آپس میں ایک دوسرے کو لاعلمی کی وجہ سے سمجھ نہیں پاتے ہیں اور تعصب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دراصل اسی وجہ سے ہمیں ایک دوسرے سے متعلق غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ ہماری ہندستانی تہذیب کچھ اس قسم کی ہے کہ چاہے ہم کسی بھی خطہ کے ہوں یا ہماری کوئی بھی زبان ہو، ہم لوگ آپس میں شیر و شکر رہتے ہیں۔ یہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ لاعلمی، تعصب اور وسیع الذہنی کی کمی کی وجہ سے ہمارے بیچ دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔

(ہفت روزہ 'عالمی سہارا'، 17 مئی 2003)

میں نسوانی آزادی کی قائل نہیں

گفتگو : شمع افروز زیدی

قرۃ العین حیدر برصغیر پاکستان و ہند کی معروف ناول نگار، افسانہ نویس ہیں گو وہ بہت کم لکھتی ہیں لیکن جو کچھ لکھتی ہیں وہ اردو میں 'کلاسیکی ادب' شمار کیا جاتا ہے۔ موصوفہ نے اب تک چار پانچ ناول لکھے ہیں لیکن اس کے باوجود عینی کا نام لیے بغیر اردو ناول نگاروں کی فہرست نامکمل رہے گی۔ عینی نے یہ رتبہ، یہ مقام اپنا مشہور و معروف ناول 'آگ کا دریا' لکھ کر حاصل کیا ہے۔ یہ ناول اردو کے 'ادب عالیہ' میں شمار کیا جاتا ہے۔ 'آگ کا دریا' سے پہلے یوں تو ان کے دو اور ناول 'میرے بھی صنم خانے' اور 'سفینۂ غم دل' شائع ہو کر شہرت دوام حاصل کر چکے تھے۔ خود عینی صرف انیس سال کی عمر میں اپنا پہلا ناول 'میرے بھی صنم خانے' لکھ کر باذوق قارئین اور ناقدین کو اپنی طرف متوجہ کر چکی تھیں۔ ان ناولوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عینی یہ ابتدائی دو ناول لکھ کر 'آگ کا دریا' لکھنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہی تھیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ عینی کے ناولوں میں باضابطہ کوئی پلاٹ نہیں ہوتا کیونکہ زندگی خود کسی پلاٹ کے تابع نہیں۔ زندگی کا نہ کوئی سوچا سمجھا آغاز ہے اور نہ کوئی طے شدہ انجام۔ زندگی صرف گزر رہی ہے، لوگ صرف بسر ہو رہے

ہیں۔اسی لیے تو بعض اوقات ان کے ناولوں پر 'ناول' کا لیبل چسپاں کرتے ہوئے بھی دقت پیش آتی ہے۔کیونکہ ان کے ناول مروجہ اصول ناول نگاری کے پابند نہیں، ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک طویل تحریر ہے جو کہیں رپوتاژ کا رنگ اختیار کرگئی ہے تو کہیں افسانے کے قریب پہنچ گئی ہے۔اسی سبب ان کے ناول بعض حلقوں میں متنازعہ فیہ بھی رہے ہیں۔لیکن اسے اب کیا کہا جائے کہ عینی کی یہی کمزوری ان کی پہچان، انفرادیت اور خوبی بن گئی ہے۔

قرۃ العین حیدر کا شاہکار اور سدا بہار ناول 'آگ کا دریا' ایک ناول ہی نہیں بلکہ تاریخ کا ایک دمکتا ہوا صفحہ ہے۔لیکن اردو کی روایتی تاریخی ناولوں سے بالکل جدا اور منفرد، اس میں ڈھائی ہزار سالہ ہندستان مختلف ادوار میں منقسم ہے۔ہر حصہ اپنے اندر اپنے دور کی صداقت و تہذیب اور ثقافت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔عینی نے خصوصاً ابتدائی حصہ بہت ہی محنت، لگن اور شوق کے ساتھ لکھا ہے۔عینی کے ناولوں کا ماحول اور کردار بیشتر قاری کے لیے اجنبی ہوتے ہیں۔اکثر کردار آئی سی ایس اور پی سی ایس آفیسر، فنون لطیفہ اور دوسرے موضوعات پر بحث کرنے والے لڑکے لڑکیاں، بڑی بڑی حویلیاں انگلش پھولوں سے ڈھکی ہوئی کوٹھیاں، کلب پارٹیاں، پکنک، مصوری، رقص، موسیقی، یقیناً یہ سارا ماحول، یہ سارے کردار بیشتر قاری کے لیے اجنبی ہیں۔گو قاری ماحول کی رومانیت و خوابنا کی اور کرداروں میں خوش طبعی و خوش مزاجی کے سحر میں گرفتار کچھ دور تک، کچھ دیر تک تو ساتھ چلتا ہے لیکن وقفہ کے بعد وہ ہانپ کر ٹھہر جاتا ہے اور عینی کے کردار ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔کیونکہ وہ بے حد ذہین ہیں، ہر شے پر، ہر موضوع پر فلسفیانہ بحثیں کرنا ان کا وطیرہ ہے۔اسی وجہ سے عینی پر ایک حلقہ یہ بھی الزام لگاتا ہے کہ انھوں نے عام زندگی سے تعلق رکھنے والے کرداروں پر قلم نہیں اٹھایا۔لیکن ہم عینی پر یہ الزام نہیں لگا سکتے۔یہ تو قرۃ العین کی دیکھی بھالی، جانی پہچانی اپنی دنیا ہے جسے انھوں نے بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔یہ انگریزی تہذیب سے متاثر جاگیردارانہ ماحول، یہ زوال آمادہ فیوڈل طبقہ کے لوگ، اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود اپنی روایتوں اور اپنی تہذیب کے پابند ہیں۔ان لوگوں کے سینوں میں بھی دل دھڑکتے ہیں۔انھیں اپنے اچھے اصولوں کا پورا پورا احساس ہے جس کے وہ امین اور

پاسدار بھی ہیں۔

قرۃ العین کے ناول، افسانے اور رپورتاژ کی زبان مترنم، کلاسیکی اور بے پناہ شعریت کی حامل ہوتی ہے۔ عینی نے ماحول اور کرداروں کی مناسبت سے زبان کا خلاقانہ استعمال کیا ہے۔ عہد عتیق کے ہندستان کے لیے سنسکرت کے الفاظ کا استعمال، لکھنؤ اور دلی والوں کے لیے شائستہ اردو اور نوکروں کی گفتگو کے لیے بھوجپوری الفاظ سے پر اردو استعمال کرنا عینی کے گہرے مشاہدے کو ظاہر کرتا ہے اور یہی بات عینی کو دوسروں سے منفرد بناتی ہے۔ عینی نے 1972 میں 'دلربا' کے نام سے ایک ناولٹ لکھا، 1977 میں طویل ناول 'آخر شب کے ہم سفر' قلم بند کیا۔ کافی طویل عرصے سے عینی اپنی سرگزشت 'کارِ جہاں دراز ہے' کے عنوان سے قلم بند کر رہی تھیں۔ اس آپ بیتی کی پہلی جلد 1978 کے اواخر میں اور دوسری جلد ابھی حال ہی میں (وسط جون) 1979 شایع ہو کر ادب کے شائقین تک پہنچ چکی ہے۔ ایران کے حالیہ ہنگاموں سے متاثر ہو کر انھوں نے ایران کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ پر محیط ایک نہایت دلچسپ رپورتاژ 'کوہِ دماوند' کے نام سے قلم بند کیا جو ابھی کتابی صورت میں شایع نہیں ہو سکا ہے۔ کشمیر پر لکھا ہوا ان کا تازہ ترین رپورتاژ 'گلگشت' آپ 'حنا' میں پڑھ ہی رہے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کا نام کئی دہائیوں کا سفر طے کر کے ایسے مقام پر آن پہنچا ہے جہاں کسی کو معلم کا درجہ حاصل ہوتا ہے جس سے دوسرے سیکھتے ہیں، جسے نمونہ بنا کر سامنے رکھتے ہیں اور قبلہ رات کرتے ہیں۔ وہ نئی نسل کے لیے وافر سامانِ ہدایت رکھتی ہیں۔ ان کا قلمی سفر ادب، فن اور علم کے شاہکاروں سے سجا پڑا ہے۔ بلاشبہ ان کا شمار ان چند قلم کاروں میں ہوتا ہے جس نے ادب کو نئی توانائی دی، نئی جلا دی اور پرانی بجی دور کی، داستانوں کے گھسے پٹے دور کے بعد ناول اور افسانوی ادب کو تازگی اور شگفتگی بخشی۔ انھوں نے اپنے گھر سے علم و فن کی جو دولت سمیٹی اور جو روایتیں ورثے میں لیں ان میں قابل قدر اضافہ کیا اور نئی خوب صورتی دی۔ بعض کے نزدیک اپنے ادب پاروں کے حوالے سے وہ 'برو بیں' (Extrovert) ہیں اور یہ خیال درست ہے لیکن وہ اپنی بروں بینی کو اپنے جذبات، محسوسات، جمالیاتی وصف کی ایسی پٹ دیتی ہیں کہ بروں بینی محض عکاسی نہیں

رہتی بلکہ ان کی ذات اور داخلی کیفیت کا جزو لاینفک معلوم ہوتی ہے۔ وہ صرف لکھتی نہیں پڑھتی بھی ہیں۔ کتاب بھی اور کتاب زندگی بھی۔ اپنے مطالعہ کو معاشرے کے مطالعے میں منتقل کر کے اپنے ادب پاروں کو نئی جہت، وسعت اور دلآویزی دیتی ہیں۔ مختصر یہ کہ قرۃ العین حیدر بزرگ نسل کی ممتاز ترین ادبی شخصیت ہیں۔ وہ آج کل جامعہ ملیہ اسلامیہ دلّی کی اعزازی لیکچرار ہیں۔ جب بھی وہ دلّی تشریف لاتی ہیں اور انھیں وقت اور موقع ملتا ہے وہ جامعہ کے طلبہ کو اپنے علم و فیوض کی برکات سے مستفید فرماتی ہیں۔ محترمہ عینی کا مستقل قیام بمبئی میں ہے۔ پچھلے دنوں 'حنا' کی جانب سے شمع افروز نے ان سے ملاقات کی۔ اس مختصری ملاقات میں عینی سے جو بات چیت ہوئی وہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ (ادارہ)

اس روز خلاف معمول میری آنکھ بہت دن چڑھے کھلی۔ میں عموماً بہت سویرے اٹھنے کی عادی ہوں۔ یوں تو مشینی اور تجارتی شہروں میں بہت جلد صبح کے ہنگامے شروع ہو جاتے ہیں۔ میں ایک ادبی نشست میں دیر تک جاگنے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی سوئی تھی۔ دستی گھڑی پر نظر پڑی تو آٹھ بج کر ۴۵ منٹ ہو رہے تھے۔ مجھے ٹھیک ساڑھے نو بجے اپنے ایک مخلص دوست کی رہنمائی میں آنجہانی کرشن چندر کی مسز سلمیٰ صدیقی صاحبہ کے پاس پہنچنا تھا۔

تقریباً بیس منٹ کے اندر اندر غسل اور دیگر ضرورتوں سے فارغ ہو کر میں ٹیکسی اسٹینڈ تک پہنچی تو نہ جانے کیوں یہ ایک کارنامہ سا لگا۔ اور سچ پوچھیے تو کسی عورت کا بیس منٹ میں کسی سے ملاقات کے لیے تیار ہو جانا ایک کارنامہ ہی ہے۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے میں اپنے مخلص رہنما کے ساتھ 'ونیش' (آنجہانی کرشن چندر کی قیام گاہ) کے سامنے تھی۔

ونیش میں داخل ہوتے وقت نہ جانے کیوں میرے پیر کانپ رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ وہی مکان ہے جہاں کبھی ایشیا کے عظیم ادیب نے اپنے شب و روز گزارے تھے۔ یہ وہی دہلیز تھی جس پر بارہا کرشن چندر جی کے پیر پڑے ہوں گے۔ اندر پہنچ کر سب سے پہلے جس

شخصیت سے ملاقات ہوئی وہ سلمٰی بھابی تھیں۔ ان کی بڑی بڑی اداس آنکھوں میں وہ سب کچھ تھا جسے ایک عورت بڑی آسانی سے پڑھ سکتی ہے۔

ان سے میں ٹیلی فون پر ہی اپنا تعارف کرا چکی تھی۔ میرا نام سنتے ہی وہ مسکرائیں۔ لیکن ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ان کی آنکھوں کی گہری اداسی پر غالب نہ آسکی۔

کچھ لمحہ کی رسمی گفتگو کے بعد وہ مجھے کرشن جی کے مطالعہ کا کمرہ دکھانے لے گئیں۔

''یہ ان کے لکھنے کی میز ہے... یہ بستر ہے... اور یہ وہ چھوٹے چھوٹے سفید رومال ہیں جن سے کرشن اپنا چہرہ صاف کرتے تھے... یہ کرشن کی ڈائری، یہ کتابیں؟... قلم...''

وہ نہ جانے کیا کیا کہتی رہیں۔ لیکن اردو زبان کے عظیم ترین ادیب کے مختصر کمرے کی فضا میری آنکھوں میں گھومتی رہی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے آج بھی کرشن جی کی مخصوص مسکراہٹ ان کی نرم آواز اور ان کے لہجے کی تازگی اسی چھوٹے سے کمرے میں بکھری ہوئی ہے۔

کرشن جی کے کمرے سے نکل کر میں سلمٰی بھابی کے ساتھ دوبارہ ڈرائنگ روم میں آئی تو یہیں سلطانہ آپا (علی سردار جعفری کی بہن) اور عینی آپا سے ملاقات ہوئی۔ پہلی نظر میں ہی عینی آپا مجھے اپنے اس تاثر سے کچھ مختلف لگیں جو میرے ذہن میں تھا۔ جب میں نے ان سے انٹرویو کی بات کی تو لگا کہ انھیں اس سلسلہ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ابتدائی گفتگو بھی کچھ اکھڑی اکھڑی سی رہی۔ پھر بھی انھوں نے مجھے اگلے روز کے لیے وقت دے دیا۔

کہتے ہیں پہلا تاثر کبھی آخری تاثر نہیں ہوتا۔ یہ قول میں نے عینی آپا سے دوسری ملاقات کے وقت سچ ہوتے دیکھا۔

اگلے روز تقریباً 11 بجے میں ان کی رہائش گاہ پر پہنچی تو عینی آپا نہایت خندہ پیشانی سے ملیں۔ اس بار لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ کل کی روکھی پھیکی عینی ہیں۔ انھوں نے مجھے بہت گرم جوشی سے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ پھر ہنستے ہوئے بولیں ''بھئی تم سچ سچ خوب آئیں... اٹ از ونڈر... اچھا تو تم 'حنا' کے لیے انٹرویو لینے آئی ہو۔ میں ہمیشہ انٹرویو دینے سے گریز کرتی ہوں لیکن یہ کیونکہ انشا جی کا پرچہ ہے اس لیے جو کچھ بھی مجھ سے بن پڑا کروں گی۔

میں عینی آپا کے قریب صوفے پر بیٹھی دھیرے دھیرے ان کے چھوٹے چھوٹے سوالوں کے جواب دیتی رہی۔

انھوں نے ایک ساتھ مجھ سے اتنی باتیں پوچھ لی تھیں کہ میں چکرا کر رہ گئی۔ لگ رہا تھا جیسے میں انٹرویو لینے نہیں دینے آئی ہوں۔ کبھی دل میں سوچتی کہ 'شمع بری پھنسی'۔ آخر جب عینی آپا سانس لینے کو رکیں تو میں نے فوراً اپنے انٹرویو کا پہلا سوال کیا...

شمع:

آپ نے پہلی کہانی کب لکھی؟

عینی:

میری پہلی کہانی 1945 میں چھپی تھی۔ کہانی کا نام تھا 'یہ باتیں' اور 'ہمایوں' لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ اس کہانی میں Abstract اور Stream of Cosclousness تھی۔ گو کہ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے کیا لکھا تھا لیکن اس کا Credit مجھے نہیں ملا۔ آج 25 سال کے بعد پھر اسی طرح کی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں جنھیں تجریدی افسانہ کہا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ سب میں نے تب لکھا جب میں ٹین ایجر تھی اور مجھے اس کا احساس نہیں تھا۔

شمع:

پریم چند کے دور سے آج تک ہر ذمہ دار ادیب نے کہانی کے فن کو آگے بڑھایا ہے۔ کہانی میں نئے تجربات بھی ہوئے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے دور میں بھی کہانی پر کافی کام ہوا۔ لیکن کیا آج کا ادیب جدت کے نام پر کہانی کے ساتھ جو کر رہا ہے وہ مناسب ہے؟

عینی:

جدت کے نام پر بھی تجربے ہونے چاہئیں۔ کچھ اچھی چیزیں بھی لکھی گئی ہیں لیکن جب اسے فارمولا بنا لیا جائے اور فیشن کے طور پر لکھا جائے تو میں اس کی قائل نہیں وہ جدیدیے کہتے ہیں کہ ہم اپنی داخلیت کو دریافت کر رہے ہیں جبکہ ادیب کو وہی لکھنا چاہیے جیسا وہ محسوس کرے۔ اگر ہم فرانس کی نقل کریں تو کہاں تک جائز ہے۔ ہمارا معاشرہ ہماری سوسائٹی کی شناخت ہی الگ ہے۔

شمع:

کہانی کی مکمل تعریف کیا ہے۔

عینی:

ضروری نہیں کہ کہانی کا آغاز، درمیان اور کلائمکس بھی ہو۔ کوئی بھی چیز جو کہیں متاثر کرے اسے ہم بیان کر سکتے ہیں اور وہ کہانی بن سکتی ہے۔

شمع:

ایک اچھے اور ذمہ دار ادیب کا سماجی مسائل اور ادب دونوں کے لیے کیا فرض ہے؟

عینی:

ہر ادیب کی تخلیقات پر سماجی مسائل کا اثر پڑتا ہے۔ لیکن اسے کسی بھی طرح معاشرے کو یا کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔ کسی بھی ادیب کو پابند نہیں ہونا چاہیے۔

شمع:

کیا ہندستان میں اردو کا ادیب بننا قابل فخر نہیں؟ سنا ہے یہ زبان اپنے ادیب کو روٹی نہیں دیتی؟ کیا ادب کو برائے پیشہ اپنانا ایک مہلک عمل ہے؟

عینی:

یہ سچ ہے۔ اس ملک میں جینے کے لیے ادیب کو مختلف ذریعہ معاش اپنانا پڑتے ہیں۔ پھر بھی ادیب کو لکھنے کی لگن ہے تو ضرور لکھے گا۔ میرے ناول 'آگ کا دریا' کے لکھنؤ، کشمیر، دہلی اور لاہور سے سترہ اٹھارہ ایڈیشن چھپ چکے ہیں لیکن مجھے آج تک کسی پبلشر کی طرف سے ایک پیسہ بھی نہیں ملا۔ پبلشر غلط نام سے بھی چھاپ لیتے ہیں۔ مگر مجھے اس کا رتی بھر فائدہ نہیں ہوا۔ حالانکہ مغرب میں پبلشر ایک ناول لکھوانے کے لیے لاکھوں روپے دیتا ہے۔

شمع:

آپ سماج میں عورت کی آزادی کی کس حد تک قائل ہیں؟

عینی:

میں نسوانی آزادی (ؤومن لب) کی قائل نہیں۔ آخر کوئی حد تو ہونی چاہیے۔ عورت جذباتی طور پر مجروح ہو کر رہ جاتی ہے۔ یوں بھی مرد کی فطرت بنیادی طور پر جارحانہ ہے۔ جتنی اذیت عورت کو ہوتی ہے اتنی مرد کو نہیں۔ یہ مغلوطیین (Promis cuous) ہمیں جنسی بد نظمی کی طرف لے جائے گی۔ ہمیشہ عورت ہی مظلوم ہوتی ہے۔ یہ اس کے حق میں ہے کہ وہ اپنے لیے کوئی حد قائم کرے۔ عورت کی اپنی زیبائش اور وضع داری ہے۔ وہ یہ آپ کھودے گی۔

شمع:

سعادت حسن منٹو آپ کی نظر میں کیسے ادیب ہیں؟

عینی:

منٹو کی کردار نگاری کمال تھی۔ وہ بہت ہی اچھے ادیب تھے اور فالتو باتیں نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ منٹو کہانی کے فن کے استاد تھے۔

شمع:

آج کے لکھنے والے جدیدیت کے نام پر جو کہانیاں لکھ کر دیتے ہیں کیا اس طرح کے تجربوں سے کہانی آگے بڑھے گی؟

عینی:

جدیدیت میں تجربے ہوتے ہیں کچھ کامیاب، کچھ ناکام پھر بھی کہانی تو آگے بڑھتی ہی ہے۔ تخلیقی عمل اتنا پراسرار ہے کہ یہ کہنا بہت مشکل ہے کوئی کیوں لکھتا ہے؟ بس جب ادیب لکھتا ہے تو وہ آپ سے آپ قلم سے نکلتا ہے۔ ہمیں سوچنا نہیں پڑتا۔

شمع:

اگر اردو ہندستان میں زوال پذیر ہے تو کب تک زندہ رہے گی؟ کیا آپ اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں؟

عینی:

ملک کے سیاسی حالات کا اثر زبان پر ضرور پڑتا ہے۔ لیکن آج کے لوگ زبان کے مسئلے کو کس طرح حل کریں گے، یہ ان پر منحصر ہے۔ میں اردو کے مستقبل سے مطمئن نہیں ہوں۔ جب تک اسے اسکولوں میں نہیں پڑھایا جائے گا تب تک اس کا مستقبل تاریک ہے۔ نئے پڑھنے والوں کو یہ زبان پڑھنی چاہیے۔ پرانے کب تک زندہ رکھیں گے؟ جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے، انھیں ہی نہیں پڑھائی جائے گی تو بچے کیسے سیکھیں گے۔ جو ہندی کتاب کی زبان ہے وہ عام زبان سے مختلف ہے۔ یہی بات الجھن پیدا کرتی ہے۔

شمع:

اگر اردو کا رسم الخط بدل کر ہندی کر دیا جائے اور زبان وہی رہے تو کیا اردو تبدیل شدہ قالب میں زندہ رہ سکے گی؟

عینی:

اگر لپی بدل دی تو زبان کی شخصیت ہی ختم ہو جائے گی۔ اگر اردو کی لپی بدلتی ہے تو تامل کی بدلی جا سکتی ہے۔ اگر لپی بدل دی گئی تو ظاہر ہے زبان زندہ نہیں رہے گی۔ یہ صرف تعصب کی وجہ سے کیا جا رہا ہے۔ اگر اردو بھی دوسری زبانوں کے ساتھ رہے تو کیا مضائقہ ہے؟ یہ زبان خود زندہ رہنے سے دوسروں کو بھی آراستہ (Enrich) کرے گی۔ اگر یہ زبان مسلمانوں کی ہے تو بھی اسے زندہ رہنے کا حق ہے۔ یہ سارا جھگڑا ہی حماقت ہے۔ میں پوچھتی ہوں اس کا کوئی معقول حل کیوں نہیں سوچا جاتا؟

شمع:

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کی کہانیوں کے زیادہ تر کردار مغربی ماحول سے آئے ہوئے لگتے ہیں۔ آپ انھیں مشرقی لباس پہنا کر پیش کرتی ہیں۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ مغربی تہذیب سے بے حد متاثر ہیں۔

عینی:

جو لوگ ایسی بات کرتے ہیں وہ نہایت بیوقوفی کی بات کہتے ہیں۔ جب میرا ماحول ہی

نیم مغربی رہا ہے تو میں کیا کروں؟

شمع:

منٹو، عصمت، بیدی، ندیم قاسمی، انتظار حسین اور عباس میں آپ بحیثیت ادیب کسے پسند کرتی ہیں؟

عینی:

میں اس بارے میں کوئی رائے نہیں دوں گی۔ اس سوال کو رہنے دیجیے۔

شمع:

کیا آپ رسالہ کے ذریعہ اپنے پڑھنے والوں کے لیے کوئی پیغام دینا پسند کریں گی۔

عینی:

میری نیک خواہشات ان تک پہنچا دیجیے۔

میں نے محسوس کیا کہ آخری دو سوالوں کے جواب دیتے ہوئے عینی آپا پھر ایک روز پہلے کی 'عینی' بن چکی تھیں۔ مجھے عصمت آپا کا انٹرویو لینے جانا تھا۔ اس لیے مزید کوئی سوال کرنے کے بجائے ان سے رخصت کی اجازت لے کر میں باہر نکل آئی۔

(یہ انٹرویو 9 جون 1979 کو عینی آپا کے گھر بمبئی میں لیا گیا اور 'حنا' ڈائجسٹ، لاہور کے جولائی 1979 کے شمارہ میں شائع ہوا)

شہر آرزو

گفتگو : امجد حسین

اُردو کی کچھ شخصیتیں ایسی ہیں جنھوں نے اپنے عہد میں ہی اساطیری حیثیت حاصل کر لی ہے۔ محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ بھی ہمارے عہد کی ایسی ہی شخصیت ہیں۔

لکھنؤ ان کا شہر آرزو تھا اور ہے۔ ان کی برہمی اور ان کا غصہ اسی بے پایاں الفت کا مظہر تھا جو انھیں اُردو سے ہے۔ پہلے وہ مجھ پر خفا ہوئیں۔ از راہِ شفقت انھوں نے جو کچھ فرمایا وہ نذر قارئین ہے۔ کوئی سوال پوچھنے کا سوال ہی نہیں رہ گیا تھا۔ لکھنؤ کے بارے میں ان سے جو کچھ پوچھنا چاہتا تھا انھوں نے ایک ہی جواب میں سب کا احاطہ کر لیا ہے۔ امجد حسین

میں نے لکھنؤ کے بارے میں پچھلے چند برسوں میں دو ناول لکھے ہیں جن میں ایک ناول 'گردشِ رنگ چمن' ہے جس کا نام اگر انگریزی میں رکھا جائے تو 'The Death of City' ہوگا۔ میں نے دوسرے ناول 'چاندنی بیگم' میں لکھنؤ کے تیزی سے بدلتے ہوئے منظر کو پیش کیا ہے۔

ہمارے یہاں اس وقت خاص طور پر رویہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ اپنے قومی، تہذیبی

سرمائے کو برباد کیا جائے۔ دوسرے ملکوں میں یہ سرمایہ سجا کے، سنوار کے بڑی احتیاط سے رکھا جاتا ہے۔ ہم نے اسے ایک سیاسی اکھاڑہ بنا دیا۔ لہٰذا کتب خانے، آرٹ کے ذخیرے، تاریخی عمارتیں، ادبی اور تہذیبی روایات۔ ان سب کو دھڑلے سے برباد کیا جا رہا ہے۔ جب تاج محل کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی ہے تو لکھنؤ کے امام باڑے کا کیا ذکر کیا جائے۔ میں نے اپنے کسی مضمون میں چند سال قبل لکھا تھا کہ پیرس (Paris) کا پرانا شہر قانوناً اس طرح محفوظ ہے کہ اس کی ایک اینٹ کو بھی نہیں ہٹایا ہے۔ لکھنؤ میں تاریخی عمارتیں باضابطہ طور پر منہدم کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر روشن الدولہ کی کچہری، جو عمارتیں باقی ہیں ان میں نیلے اور پیلے رنگ پوت دیے گئے ہیں جس طرح پرانی عمارات کو نئی عمارتوں کے ساتھ طرز تعمیر کی مناسبت سے (Blend) کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس لکھنؤ میں انتہائی بھدی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں اور افسوس یہ ہے کہ کسی نے اس صورت حال پر توجہ نہ کی۔ شاید کسی نے بھی نہیں۔ اس شہر کو جو اہل ذوق کے لیے جنت نگاہ تھا، کس بے دردی سے تاراج کیا گیا۔ ایک وقت تھا کہ منشی نول کشور خود بیل گاڑی پر جگہ جگہ دوسرے شہروں میں جاتے تھے اور اپنی کتابیں فروخت کرتے تھے اور اس طرح انھوں نے اردو کی عظیم الشان خدمت انجام دی۔ ایک وقت یہ ہے کہ ان کے وارثوں نے اردو والوں سے کہا کہ ان کے گودام میں جو کتابیں ہیں لے لو اور انھیں محفوظ کر لو۔ لیکن کسی نے پروا نہیں کی۔

آج سے قریب دس سال پہلے کی بات ہے کہ میں نے اردو اکادمی کے ارباب اقتدار سے بار بار درخواست کی کہ وہ اس نایاب ذخیرے کو اپنے یہاں منتقل کر لیں۔ مجھے جو جواب ملا، میں سناٹے میں آ گئی۔

مجھ سے کہا گیا کہ میں پرانے لکھنؤ کی کچھ یادیں تازہ کروں۔ میں موجودہ لکھنؤ کے بارے میں اتنی غم و غصہ میں بھری بیٹھی ہوں کہ میں پرانے لکھنؤ کے بارے میں کیا لکھوں؟ کیا میں یہ بتاؤں کہ میرے بچپن کے لکھنؤ میں پرانے شہر کی گلیاں کتنی صاف ستھری تھیں۔ فرقہ وارانہ تاثرات ناپید تھے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نظام تعلیم بہت اچھا تھا، پڑھائی ہوتی تھی۔ غنڈہ گردی، امتحان میں نقل کرنا اور نگرانوں کو چاقوں دکھا کر بھگا دینا اس قسم کے خواب و خیال کسی کے

دماغ میں نہ آسکتے تھے۔

ابھی کچھ سال پہلے کی بات ہے کہ ایک صاحب نے بتایا کہ وہ شیعہ کالج میں Law کے امتحان کے سنٹر میں نگرانی کر رہے تھے۔لڑکوں نے ان کو چاقو دکھا کر بھگا دیا۔وہ اس وقت وہیں سے پریشان حال چلے آرہے تھے۔اس صورت حال کا ذمہ دار پورا عمرانی اور اقتصادی انقلاب ہے،جس میں بے پناہ بڑھتی ہوئی آبادی اور بے لگام اور بے کار راج نیتی (سیاست) کی وجہ سے ابھی سدھرنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

مسئلہ یہ ہے کہ جس نسل نے وہ گزشتہ تہذیب یا ماحول نہیں دیکھا ان کی سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اگلے وقتوں کے لوگ اب کتنے دکھی اور شاکی ہیں۔آخر اس زمانے کی ایسی کیا بات تھی؟

مجھے بہت افسوس ہوا اور میں نے جب حال ہی میں ایک خاتون نقاد کا مضمون پڑھا جس میں انھوں نے Generation Gaps کے باوجود میرے لیے ایسا لہجہ اختیار کیا کہ جو میں ذاتی طور پر اپنے کسی بزرگ ادیب کے لیے سوچ بھی نہیں سکتی۔انھوں نے بڑے استہزا کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ میں تہذیب وغیرہ کے بارے میں لکھتے لکھتے نہیں تھکتی۔ان کے الفاظ کچھ اس قسم کے تھے...تو بی بی اس طرح تو میں برابر لکھتی رہوں گی اور نہ تھکوں گی۔

ہر مصنف کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی ترجیحات کے مطابق لکھے اور قاری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسے مسترد کردے۔مجھے یاد ہے کہ جمیل مہدی مرحوم (ایڈیٹر'عزائم') نے لکھا تھا کہ اب ہم لوگ جس زبان میں بات کر رہے ہیں اس کو سمجھنے والا اب کوئی نہیں ہے۔میں نے امیر الدولہ لائبریری میں نایاب کتابیں باہر پڑی دیکھیں۔مجھے ایسا لگتا ہے کہ لکھنؤ پر کچھ زیادہ ہی آفت آئی ہے۔ان حالات میں یہ کون بیٹھ کر سوچے اور تجویز کرے کہ فلاں فلاں مکان اور کوچے ان کی ادبی اہمیت کی وجہ سے محفوظ کردیے جائیں۔مثال کے طور پر میں نے یہ اندازہ لگایا کہ چوک میں پرانی سبزی منڈی کا وہ حصہ جہاں سے کوچہ میر انیس شروع ہوتا ہے شاید یہی مثنوی'زہر عشق' کی جائے وقوع تھی یا بھیم کا اکھاڑہ ستھٹی وغیرہ کا علاقہ وہی ہے جس کا تذکرہ حسن شاہ کے قصہ رنگیں میں کیا گیا ہے۔اس کا ترجمہ نشتر کے نام سے سجاد حسین کسمنڈوی نے کیا ہے۔

گولہ گنج اور بارود خانے میں نواب آصف الدولہ کے زمانے میں انگریزوں نے اپنی پہلی چھاؤنی چھائی تھی اور بحیثیت Camp Followers خانم جان کا کنبہ وہیں اترا۔ انگریزوں کا قدیم فوجی قبرستان بھی اسی علاقے میں ہے جو اب گنجان آبادی کا علاقہ ہے اور کلن کی لاٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آس پاس لوگوں نے اپنے مکان بنا لیے ہیں۔ کمپنی باغ بھی اسی طرف ہے یعنی میڈیکل کالج کے آس پاس تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا جہاں جہاں تسلط ہوتا تھا، عوام کے لیے ایک باغ لگاتی تھی جو کمپنی باغ کہلاتا تھا۔ 1973 میں گومتی کے کنارے جو صنعتی نمائش (Industrial Exihibition) ہوتی تھی اور غالباً کمپنی باغ تک پھیلی تھی اس میں ایک پرستان تھیٹر (Paristan Theatre) تھا اس میں سہگل اور اختری بائی فیض آبادی نے پارٹ (Part) ادا کیا تھا۔ اس نمائش کے انچارج لکھنؤ کی مشہور شاعرہ محترمہ داراب بانو وفا کے دادا تھے۔

دوسری نمائش جو 1938 میں لگی تھی وہ بھی گومتی کے کنارے تھی۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں پان کی گلوریوں میں کیلیں لگائی جاتی تھیں۔ ہمارے گھر میں پان دان تھا مگر میں نے کبھی پان نہیں کھایا۔ میں اپنی والدہ، بھائی اور چند رشتہ داروں کے ساتھ نمائش میں گھوم رہی تھی تو پان کی دکان پر مجھے کسی نے دو بیڑے پان دیے جن میں لونگ کی جگہ چھوٹی کیلیں لگائی گئی تھیں۔ میں وہ دونوں کھا گئی۔ وہ کیلیں جا کر میری آنتوں میں چبھیں۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ فوراً میڈیکل کالج پہنچایا گیا۔

میں لکھنؤ میں جس اسکول میں پڑھتی تھی یعنی ماسٹر صاحب ٹنڑ والا اسکول۔ میں اپنے ناولوں اور کہانیوں میں اس کا ذکر کرتے نہیں تھکتی۔

پٹرول راشننگ (Rationing) شروع ہو گئی تھی۔ میں گھوڑا گاڑی پر ماسٹر صاحب کے اسکول جایا کرتی تھی۔ ماسٹر صاحب یعنی پریتی سنگھ سریواستو ابفضل خدا حیات ہیں اور لکھنؤ میں ان کا وہ اسکول اب مہاتما گاندھی گرلس کالج کہلاتا ہے۔

میرا ایک مضمون موسیقی بھی تھا تو میں گھوڑا گاڑی پر طنبورہ سامنے رکھے اسکول جاتی تھی

اور شام کو جھٹ پٹے وقت گھوڑا گاڑی موتی محل برج پر پہنچتی تھی۔ میں نے یہ سارا منظر 'آگ کا دریا' میں پیش کیا۔ طلعت گھوڑا گاڑی پر طنبورہ لیے اسکول آتی اور جاتی ہے۔ یہ ناول عرصہ ہوا ہندی میں بھی چھپ چکا ہے اور بڑا توارد یہ ہوا ہے کہ ہندی کے ایک مشہور ادیب کا ناول جو ابھی حال ہی میں چھپا ہے، اس کی ہیروئن بھی طنبورہ لیے گھوڑا گاڑی پر میوزک (Music) سیکھنے جاتی ہے اور پھر موتی محل برج پر گاڑی واپس پہنچتی ہے اور وہاں سے دریا کنارے کوٹھی میں جاتی ہے، جس طرح 'آگ کا دریا' میں طلعت سنگھاڑے والی کوٹھی جاتی تھی۔

اس زمانے میں لکھنؤ شہر کے اندر پالکیاں اور چو پہلے چلتے تھے۔ میری والدہ اپنے چند رشتہ داروں کے یہاں مجالس محرم میں کٹرہ ابوتراب خاں (لکھنؤ) وغیرہ جاتی تھیں۔ کار باہر چھوڑ کر ایک چو پہلے پر بیٹھتی تھیں، اور میں بھی بڑے شوق سے چو پہلے کی سواری کرتے ہوئے قدیم حویلیوں میں جاتی تھی جہاں میراثنیں نوحہ ماتم کرتی تھیں۔

اب جبکہ مجھے اکثر لندن میں مجالس محرم میں شرکت کا اتفاق ہوا تو میں نے انقلاب زمانہ پر عش عش کیا۔ اب لکھنؤ اور کراچی وغیرہ کے ذاکر اور مرثیہ خوان لندن اور شکاگو میں مجلسیں پڑھ رہے ہیں۔

یہ عالمی سیاست اور عالمی اقتصادیات کے نئے منظرنامے کا ایک پہلو ہے جس نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے۔ برمنگھم میں محرم کے جلوس نکلتے ہیں اور شکاگو میں گھوڑے جوڑے کی شادیاں ہوتی ہیں۔ لکھنؤ کی میراثنیں لندن میں بڑی مقبول آرٹسٹ بن چکی ہیں اور مرسیڈیز گاڑی پر گھومتی ہیں لیکن غالباً کسی NRI کو یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ تاریخی عمارتوں اور آثار کی تھوڑی بہت مرمت ہی کرا دیں۔

('نیا دور'، اکتوبر-نومبر 1994)

میں اردو میں ترقی پسند تحریک کی حامی ہوں

گفتگو : احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی:

آپ ادب برائے ادب کی قائل ہیں یا ادب برائے زندگی کی؟

قرۃ العین حیدر:

میرے نزدیک ادب برائے زندگی کا نظریہ بہتر ہے، لیکن اس حد تک نہیں کہ ادب محض پروپگنڈا بن کر رہ جائے۔ زندگی کتنی ہی بیمار اور حقیقتیں کیسی ہی غلیظ اور تلخ کام سہی، لیکن تصویر کے روشن اور خوش گوار رخ کو نظر انداز کر کے صحت مند ادب کسی طرح سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ رومان کو فراری ادب ماننے سے مجھے انکار ہے، فنکار کا کینوس 'قومی جنگ' اور 'سرخ سویرا' کی حدود سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی:

اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے متعلق آپ کے خیالات کیا ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

میں اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی حامی ہوں، زندگی ایک نئے موڑ پر آ چکی ہے، انسانیت ایک عالمگیر انقلاب سے ہم کنار ہو رہی ہے، دنیا ایک نئے پیغام کی منتظر ہے اور اس Transitional اور تجرباتی دور میں وہی ادب ہمارے لیے صحت مند تعمیری اور Positive ثابت ہو سکتا ہے جو زندگی کے اس بدلتے ہوئے دھارے، اس تیز بہاؤ کا ساتھ دے اور جو زندگی کی صحیح تنقید ہو، ایک نئی اور بہتر دنیا کا پیغام ترقی پسند ادب کا پیغام ہے، یاسیت اور قنوطیت کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں، ادب کی افادیت اور واقعیت ایک ہی قسم کے Stereotyped نظریوں کی نمائندگی اور Cynical note پر منحصر نہیں جو ہمارے ترقی پسند ادب کے زیادہ حصہ میں پایا جاتا ہے۔ کہیں نہ کہیں سے مارکس، اینگلز یا فرائیڈ کو افسانے میں گھسیٹ لانے سے افسانہ لازمی طور پر ترقی پسند نہیں بن جاتا، زندگی کا بہاؤ ایک مقررہ اور طے شدہ حد فاصل سے نہیں روکا جا سکتا۔ میں جمالیات کو حقیقت پسندی کے منافی اور داخلیت پرستی پر مبنی نہیں سمجھتی۔ افادیت اور جمالیات کی زندگی سے ہم آہنگی ہی صحیح ترقی پسندی ہے۔

احمد ندیم قاسمی:

جدید اردو افسانہ نگاری میں جنسی تجزیہ کی رو کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

قرۃ العین حیدر:

جدید اردو افسانے میں جنسی تجزیہ کی رو کی میں مخالف نہیں ہوں۔ اگر ہمیں زندگی کی صحیح عکاسی اور نمائندگی کرنی ہے تو ہم اپنی تخلیقات میں جنسیات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ عصمت، ممتاز مفتی اور منٹو کے بغیر ہمارے جدید ادب کا کینوس مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں ان لوگوں سے نہیں ہوں جو ڈی ایچ لارنس کا نام سن کر بھویں چڑھا لیتے ہیں۔ اگر جنسی مسائل کو صحت مندی کے ساتھ پیش کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس رجحان کے علم برداروں کو گردن زدنی قرار دیں، لیکن آج کل ہمارے بیش تر ادیب جس بے رحمی سے اس رجحان کو بغیر کسی مقصد کے محض تفریحاً Exploit کر رہے ہیں، میں اس کے خلاف ہوں۔ Sex if life اِ متحمل نین کا خیال ہے، لیکن میں جنس کو اس قدر

لامحدود نہیں سمجھتی۔ زندگی کی وسعتوں کو اتنا محدود نہیں کیا جا سکتا کہ انسان ان ذہنی پیچیدگیوں سے آگے بڑھ ہی نہ سکے۔ ہمارے افسانہ نگار جنسیات کو جس قدر گمراہ اور بے ترتیب Perverted انداز سے پیش کر رہے ہیں، اسے دیکھ کر ایک نوع کی کراہت سی محسوس ہوتی ہے اور یقین نہیں آ سکتا کہ زندگی اتنی بیمار اور غلیظ ہے۔

احمد ندیم قاسمی:

آپ افسانے میں پلاٹ کو ضروری سمجھتی ہیں یا کردار نگاری کو، یا دونوں کو؟

قرۃ العین حیدر:

میں افسانہ کی تکنیک میں پلاٹ پر کردار نگاری اور خیالات و تاثرات کے خوب صورت اظہار کو ترجیح دیتی ہوں۔ میں نے پلاٹ کی تعمیر کی طرف اب تک توجہ نہیں کی اس لیے میرا خیال ہے کہ میں ناول کامیابی سے کبھی نہ لکھ سکوں گی۔

احمد ندیم قاسمی:

آپ کے فن پر غیر ارادتاً کس افسانہ نگار کی زبان اور بیان اثر انداز ہوئے ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

میں نہیں کہہ سکتی کہ کسی خاص افسانہ نگار کا طرز بیان میرے اسلوب پر اثر انداز ہوا ہے یا نہیں۔ کرشن چندر میرا پسندیدہ فن کار ہے۔ میں اس کے اسٹائل سے بہت متاثر ہوں، ممکن ہے کہ غیر ارادتاً میں نے کہیں اس کا طرز اختیار کرنے کی کوشش کی ہو۔

احمد ندیم قاسمی:

اپنے فن کو موجود اسلوب اپنانے میں آپ نے ارادتاً کیا کیا کوششیں کیں؟

قرۃ العین حیدر:

اپنا موجودہ طرز نگارش اپنانے میں میں نے ارادتاً قطعی کوئی کوشش نہیں کی۔ شروع میں مجھے اپنی تحریروں کی طرف سے کبھی اچھی طرح سے اطمینان نہ ہوتا تھا، لیکن جب مجھ سے کہا گیا کہ مجھے افسانہ نگاری کا شوق چھوڑنا نہیں چاہیے تو گزشتہ برس میں نے چند افسانے لکھے۔ کسی خاص ادیب کا اسلوب

میرے پیش نظر نہیں تھا۔ میں رسالے بہت کم پڑھتی ہوں اور کرشن چندر، عصمت چغتائی وغیرہ اپنے چند پسندیدہ ادیبوں کی تصانیف کے علاوہ اردو کی زیادہ کتابیں پڑھنے کا اتفاق بھی نہیں ہوا۔ دراصل افسانہ نگاری میرے نزدیک ایک بہت ہی فضول مشغلے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ جب کورس کی کتابوں یا تفریحی مشاغل سے اکتانے لگتی ہوں تو افسانے لکھنا شروع کر دیتی ہوں اور ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ افسانے کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے اس قدر ''بور یت'' پھیلتی ہے کہ اسے مدتوں کے لیے ادھورا چھوڑنا پڑ جاتا ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ فضول افسانہ آج تک نہیں لکھا گیا ہوگا۔

احمد ندیم قاسمی:

اپنے فن کے بارے میں آپ نے مستقبل کے لیے کیا پروگرام سوچ رکھا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

اپنے فن (کس قدر گرینڈ لفظ ہے!) کے بارے میں تو میں نے اس وقت تک کچھ نہیں سوچا، بہت ممکن ہے کہ افسانہ نگاری کے مشغلے سے بہت جلد طبیعت اکتا جائے۔ مجھے انگریزی میں لکھنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ انگریزی جرنلزم کا Career بنانے کی کوشش کی جائے۔ لیکن یہ خیال خاصا Fantastic سا ہے اور پھر اس ہندستان، جہاں وحیدہ عزیز کے متعلق لکھا جاتا ہے کہ یہ خاتون تو ہو ہی نہیں سکتیں، قطعی کوئی مرد ہے، جو نسوانی نام سے اتنے عمدہ مضامین لکھتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی:

کیا آپ ناول لکھنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

ناول لکھنے کا اب تک تو کوئی ارادہ نہیں ہوا۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ جب ایک افسانہ ختم کرنا مصیبت ہو جاتا ہے تو ناول اس رفتار سے برسوں میں بھی مکمل نہ ہو سکے گا۔

ایک زمانے میں احمد ندیم قاسمی نے اس دور کی سترہ اہم خواتین افسانہ نگاروں کے نمائندہ

افسانوں کے ساتھ ساتھ ادبی نظریات پر ان کی رائے ایک سوالنامے کی صورت میں جاننے کی کوشش کی تھی۔ آٹھ سوالوں پر مشتمل 'نقوش لطیف' کے عنوان سے یہ مجموعہ شایع ہوا۔ ان سوالوں کے جوابات میں قرۃ العین حیدر نے جو کچھ کہا وہ غالباً ان کی پہلی باضابطہ تنقیدی رائے ہیں۔ اور قاسمی صاحب قرۃ العین حیدر کے تعاون میں جو رائے ظاہر کی وہ بھی ان کی پہلی بے باک رائے کہی جاسکتی ہے:

> ''قرۃ العین حیدر کی انفرادیت اس درجہ نمایاں ہے کہ بورژوا طبقے کی ابھی مدتوں تک کوئی ان سے بہتر نمائندہ شاید ہی مل سکے۔''

ان سوالات و جوابات کو میں نے مدغم کر دیا ہے اور ایک انٹرویو کی شکل دے دی ہے۔ اس کی اصل 'نقوش لطیف' ہے۔

میں نے پہلی بار حقیقت پسندانہ انداز کی کہانی لکھی

ڈاکٹر محمد صادق

بھارتیہ گیان پیٹھ کے 25دیں انعام کے اعلان سے کچھ وقت پہلے کی بات ہے۔ 'ہندستانی افسانہ نگار' سیریز کے ماتحت پیش کردہ کتاب کے لیے 22 جون 1990 کو قرۃ العین حیدر سے ایک انٹرویو ریکارڈ کیا گیا تھا۔ ویسے تو اردو ناول کی باوقار روایت میں قرۃ العین حیدر ایک اہم اور مقبول دستخط کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن اس ملاقات میں ان کی افسانہ نگاری کی حیثیت مدنظر رکھی گئی ہے۔ گفتگو کرنے والے ہیں اردو کے نوجوان شاعر اور ناقد ڈاکٹر صادق۔

صادق:

آپ اپنے یا اپنے لکھنے کے انداز کے بارے میں کچھ کہنا یا لکھنا پسند نہیں کرتیں۔ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

قرۃ العین حیدر:

دیکھیے، ایسا ہے کہ یہ اپنے اپنے مزاج پر منحصر کرتا ہے۔ کچھ لوگ اپنے بارے میں باتیں کرنا، لکھنا پسند کرتے ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں، ناولوں کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ ان کے بارے میں

انٹرویوز دیتے ہیں اور کچھ لوگ یہ پسند نہیں کرتے۔ یہ مزاج پر ہے۔

میرے اندر اتنا غرور نہیں ہے کہ بیٹھی اپنے ہی بارے میں لکھتی رہوں۔ اپنے سلسلے میں بات کرنے یا لکھنے سے مجھے بہت اکتاہٹ اور کوفت ہوتی ہے۔ میرے خیال میں صرف لکھنا کافی ہے۔ میں نے لکھ دیا، لوگوں نے پڑھ لیا، اور بس۔

صادق:

پھر بھی کچھ ایسے موقعے تو ضرور آتے ہیں، جب کسی رائٹر کا اپنے یا اپنے فن کے بارے میں کچھ کہنا ضروری ہو جاتا ہے؟

قرۃ العین حیدر:

ہاں، اگر کوئی اکیڈمک بحث ہو تو میں ضرور ہی اس کے بارے میں بات کروں گی، لیکن اب یہ کہا جائے کہ صاحب، یہ اپنی کہانیوں میں انگریزی کے الفاظ کا استعمال کرتی ہیں یا یہ کہ ان کے یہاں ناسٹلجیا بہت ہے یا اسی طرح کی بیوقوفی کی باتیں، تو میں ان کا کیا جواب دوں؟ میں جو کچھ کہتی ہوں، اکثر انٹرویوز میں وہ اسی طرح رپورٹ بھی نہیں کیا جاتا۔ پھر مجھے غصہ آتا ہے۔

صادق:

جس زمانے میں آپ نے لکھنا شروع کیا، اس زمانے میں اردو ادب میں ترقی پسند مصنفین کا بول بالا تھا۔ کیا آپ بھی ترقی پسند تحریک سے متاثر رہی ہیں؟

قرۃ العین حیدر:

جس زمانے میں یہ تحریک چلی، میں اس وقت کالج میں پڑھتی تھی۔ پہلے، دوسرے اور تیسرے سال کے جو طلبا ہوتے ہیں، وہ پالیٹکلی کانشس بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن میں ایک ایسے کالج میں پڑھتی تھی جس کا ماحول بالکل الگ تھا۔ میرے اپنے گھر کا رہن سہن انگلش قسم کا تھا۔ جو میرے آس پاس کی سوسائٹی تھی، اسی ماحول کے بارے میں میں نے لکھنا شروع کیا۔ اس میں سیاسی دخل بھی موجود تھا، لیکن جس طرح کی میں نے زندگی پیش کی وہ زیادہ تر لوگوں کے لیے اجنبی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو کچھ میں نے لکھا، شروع سے آج تک، اس کے لیے مجھے

پراسیکیوٹ کیوں کیا جاتا ہے کہ آپ نے اس طرح کیوں لکھا؟

صادق:

واقعی اس زمانے میں ترقی پسند ناقدین نے آپ کی کہانیوں پر زبردست مخالفت ظاہر کی تھی؟

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں! انھوں نے کہا کہ میں جانے کس دنیا کی باتیں کرتی ہوں۔ پاکستان کی۔ حالانکہ وہ کوئی پری کی داستانیں نہیں تھیں۔ ایک خاص کولونیل طبقہ کی زندگی تھی جس کے بارے میں پہلے نہیں لکھا گیا تھا، یا اگر لکھا گیا تھا تو 'آؤٹ سائیڈرز' کے طور پر۔ میں نے اس کو 'ان سائیڈرز' کی طرح لکھا۔

ایک خاص ماحول اور فضا میں میری پیدائش ہوئی اور پرورش ہوئی۔ یہ لوگ مجھ سے ایسی امید کیوں کرتے ہیں کہ میں اس زندگی کی تصویر کشی کروں جس سے میں متعارف نہیں؟ گاؤں کی زندگی کی حد تک تو میں کچھ واقف ہوں کیونکہ اس کا مجھے تجربہ تھا لیکن وہ تجربہ ایک بڑے فاصلے کا تھا۔ جو ترقی پسندوں نے مجھ کو بہت برا بھلا کہا اور اس طرح مذاق اڑایا جیسے میں عوامی تحریک کی مخالف ہوں۔ تو وہ لوگ یہ بھول گئے کہ میں کالج میں پڑھنے والی ایک سولہ سترہ سال کی 'کیئر فری' لڑکی تھی۔

صادق:

ابھی آپ نے اپنے گھر کے خاص ماحول اور فضا کا حوالہ دیا، تو کیا اس میں ترقی پسند نظریات کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی؟

قرۃ العین حیدر:

ایسی بات نہیں۔ میرے والدین سماجی بیداری کی تحریک میں اہم کردار نبھا چکے تھے۔ ماں نے سودیشی تحریک میں حصہ لیا تھا اور اس کے بارے میں ایک ناول بھی لکھا۔ میرے والدین ہندستان کے شروعات کے ترقی پسند لوگوں میں سے تھے اور بڑے رائٹر تھے۔ خاندان کے بہت

سے نوجوان سیاسی تحریک میں شامل تھے۔ پروفیسر احمد علی، مجاز اور سجاد ظہیر وغیرہ ہمارے یہاں آیا جایا کرتے تھے لیکن میں ان سے برابری سے نہیں مل سکتی تھی۔ اس لیے کہ وہ دوسرے نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ منشی پریم چند سے والد کے تعلقات اس وقت سے تھے جب پریم چند نے مقبول عام اردو رسالہ 'زمانہ' میں 'نواب رائے' نام سے والد کی کہانیوں کے پہلے مجموعہ کا تجزیہ لکھا تھا۔ خیر... تو ایسی ایسی باتیں ترقی پسند ناقدین نے میرے بارے میں لکھیں۔ پڑھ کر بڑا افسوس ہوتا تھا کہ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیوں یہ میرے لیے ایسا لکھتے ہیں؟ لیکن میں نے پروا نہیں کی، کیونکہ لکھنے کی میرے اندر Urge تھی۔

صادق:

آپ کی کہانیوں میں حقیقت پسندی کا شمولیت کب سے اور کیسے ہوئی؟

قرۃ العین حیدر:

میں نے پہلی بار جو حقیقت پسندانہ انداز کی کہانی لکھی، وہ چیلنج کے طور پر لکھی۔ غالباً 1957 کی بات ہے، مجھ سے ایک صاحب (مشہور اداکار ضیا محی الدین، جو اب لندن میں بس گئے ہیں) نے کہا کہ تم منٹو کی طرح ریلسٹک کہانی نہیں لکھ سکتیں۔ میں نے کہا کہ میں لکھ کر دکھاؤں گی۔ مطلب منٹو کی طرح تو نہیں، لیکن میں نے 'پت جھڑ کی آواز' لکھی۔ سیدھے سادے بیانیہ اسٹائل میں۔ بالکل ریلسٹک۔ اس سے پہلے میں 'جلا وطن' بھی لکھ چکی تھی۔ اس سے پہلے بھی جو کہانیاں لکھتی رہی تھی وہ بھی بالکل اسی دنیا ہی کی تھیں۔ بھائی حجاب امتیاز علی والی فنتاسی نہیں تھی لیکن کیریکٹر اور جوان کا ماحول تھا، وہ الگ تھا اور لوگوں کو فنتاسی معلوم ہوتا تھا اور اس میں اگر آپ کا انداز بیاں ذرا شاعرانہ ہو اور پرسپشن الگ ہو تو ظاہر ہے کہانی مختلف معلوم ہوگی۔

صادق:

اسی زمانے میں آپ نے سمبالسٹ کہانیاں بھی تو لکھی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

ہاں، میری ایک کہانی ہے 'کیکٹس لینڈ'۔ بنیادی سطح پر آپ اسے ریلسٹک سمبالسٹ کہانی

کہہ سکتے ہیں۔ یہ میں نے 1949 میں لکھی تھی۔ یا 'یہ داغ داغ اجالا' یہ شاید 1950 میں لکھی تھی۔ یہ بالکل سیاسی سمبالسٹ کہانی ہے۔ 'کیکٹس لینڈ' کی طرح 'یہ داغ داغ اجالا' کو بھی لوگ نہیں سمجھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک نے کافی 'برین واشنگ' کر رکھی تھی پڑھنے والوں کی۔ یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ خود اکثر ناقدین میں فکشن کو اندر سے گرفت کرنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی یا تھی ہی نہیں۔ وہ جو بندھے ٹکے ترقی پسند کے اصول قائم کر دیے گئے تھے وہ ان پر چل رہے تھے۔ میں تو خیر اب بھی اسی طرح لکھ رہی ہوں۔ ناقدین اور پڑھنے والوں کے نظریے البتہ بدلتے جا رہے ہیں۔ جدیدیت اب شروع ہوئی ہے۔ اس وقت اپنی کہانیاں بغیر یہ سوچے ہوئے لکھیں کہ میں کوئی نئی چیز لکھ رہی ہوں۔

صادق:

'یہ داغ داغ اجالا' اور 'آہ اے دوست' جیسی کہانیاں لکھتے وقت کیا یہ بات آپ کے ذہن میں تھی کہ یہ کہانیاں اردو ادب میں نئے ٹرینڈ کو جنم دیں گی؟

قرۃ العین حیدر:

میرے خیال میں اس طرح کی کوئی بات میرے ذہن میں نہیں تھی کیونکہ جیسے میں نے پہلے آپ کو بتایا کہ میں تو لکھتی چلی گئی۔ 'آہ اے دوست' میں نے اس طرح لکھی تھی کہ کالج کے برآمدے میں ایک پروگرام کے لیے ہم لوگ ریہرسل کر رہے تھے۔ کچھ لڑکیاں ڈانس کر رہی تھیں۔ کچھ ایک اسکٹ کی پریکٹس میں مصروف تھیں۔ وہیں پر جو کچھ باتیں میرے دماغ میں آئیں، لکھیں۔ وہ ایک کہانی سی بن گئی۔ وہ میں نے معروف ماہنامہ 'ساقی' میں بھیج دی اور شائع ہو گئی۔ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ میں نیا ٹرینڈ شروع کر رہی ہوں۔ میں نے آپ سے کہا نہ کہ بالکل انجانے میں اچانک ہی یہ کہانی لکھی۔ کچھ عرصے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ جو میں لکھتی ہوں وہ اس وقت کا ادبی چلن نہیں۔ کہانی 'یہ داغ داغ اجالا' بھی میں نے یہ سوچ کر نہیں لکھی کہ یہ کوئی نیا اسٹائل ہے یا اس کا ٹرینڈ بن جائے گا۔ اصل میں فیض صاحب کا ایک شعر مجھے انسپائر کر گیا۔

صادق:

'ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی' عنوان سے آپ کی کہانی، اردو زبان میں ایک بالکل دلچسپ تجربہ ہے۔ اس تصنیف کے پیچھے جو تجربہ یا انسپریشن ہے، اس کے بارے میں کچھ بتائیں۔

قرۃ العین حیدر:

بنگلہ دیش کی لڑائی کے کچھ وقت بعد ایک دن میں کسی کام سے 'نیشنل اسکول آف ڈرامہ' گئی تھی۔ وہاں ایک لڑکا کھڑا ہوا تھا... بنگالی۔ اس کے ایک ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ اسکالرشپ پر بنگلہ دیش سے آیا تھا۔ وہاں کافی ایسے لوگ تھے جن کو میں بھی جانتی تھی اور وہاں کے قتل عام کے بعد ان کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ تو میں نے پوچھا کہ فلاں کہاں ہے؟ فلاں فلاں کہاں ہیں؟ اس نے بتایا۔ پھر میں نے پوچھا، فلاں کہاں ہیں؟ وہ ایک آرٹسٹ تھے۔ بہت مشہور۔

''وہ تو میرے فادر تھے۔ وہ بھی مارے گئے۔'' اس نے اس طرح کہا کہ اس کے چہرے پر کسی قسم کا اثر، کوئی ایکسپریشن نہیں تھا۔ اصل میں اس نے اتنی غارتگری دیکھی کہ اب اس کے اندر کوئی احساس باقی نہیں رہا تھا۔ پھر میں نے پوچھا کہ تم یہاں کیسے آئے؟ کہنے لگا، مجھے حکومت ہند نے ایک اسکالرشپ دی ہے، ایکٹنگ کی۔ پھر میں نے پوچھا کہ کیسا لگ رہا ہے انڈیا؟ وہ بولا... آل رائٹ۔ ٹھیک ہے۔ مطلب یہ کہ اس کے اندر کسی قسم کا کوئی جذبہ، کوئی اموشن باقی نہیں رہا تھا۔ ایک تو یہ چیز میرے ذہن میں تھی۔ دوسری چیز یہ ہوئی کہ بنگلہ دیش کی جنگ کے زمانے میں میرے پاس ایک خط آیا کلکتہ سے، اور وہ خط کوئی 50 صفحات کا تھا۔ میری ایک دوست کا۔ تو وہ مارکسوادی اور انگریزی اور بنگلہ کی مصنفہ تھیں۔ ان کا خط مجھے بڑا عجیب لگا۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ میرا میاں بنگلہ دیش میں مارا گیا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ مرا نہیں ہے۔ زندہ ہے، اور تم کسی پیر فقیر سے ملو بمبئی میں، یا کسی سادھو سنت سے، اور اس سے پوچھا کہ میرا میاں کہاں ہے۔ تو وہ خط پڑھ کے میں بڑی اَپ سیٹ ہوئی کہ یہ لڑکی ذہنی طور پر کتنی پریشان ہے کہ جو بڑی پکی مارکسوادی

تھی، اب مجھ سے کہہ رہی ہے کہ پیر فقیر سے ملوں۔

کچھ عرصے پہلے میں ارمینیا گئی تھی۔ اریوانا ائیر پورٹ سے ارارات پہاڑ صاف نظر آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت نوح کی کشتی وہاں جا کے ٹھہری تھی۔

تیسرا عنصر اس کہانی میں صوفیوں کا ہے۔ مطلب بیکتاشی ترکی سلسلہ ایک زمانے میں اس ایریے میں دور تک پھیلا ہوا تھا۔ عثمانی خلافت میں ہنگری بھی شامل رہ چکا تھا۔ بیکتاشی صوفی سلسلے کے ایک بڑے بزرگ وہاں ہنگری میں دفن ہیں۔ یہ بیکتاشی قلندر سمرقند، بخارا اور ترکی وغیرہ میں پھیلے ہوئے تھے۔ اتاترک نے وہاں سارے صوفی سلسلے ختم کروادیے۔ ادھر کمیونسٹ حکومت نے روس میں ختم کروادیے۔ میں نے اسے لے کر ایک سمبالک میٹافزیکل یا مسٹکل جو بھی کہیے، اس کے دو کردار بنا لیے۔ حاجی گل بابا بیکتاشی تو خیر تاریخی ہیں، حاجی سلیم آفندی اور بنالیا۔ وہ مجھے ایبسٹریکٹ سطح پر ملتے ہیں۔ وہ خود بھی ایبسٹریکٹ ہیں لیکن میں ایبسٹریکٹ نہیں ہوں۔ میں ان سے پوچھتی ہوں۔ میں تلاش میں نکلی ہوں۔ میرے پاس یہ خط آیا ہے۔ اس عورت کا جو اپنے میاں کا پتہ پوچھتی ہے کہ میرا 'وہ' کہاں ہے؟ کیونکہ جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ اس کے بعد میں ہندستان واپس آتی ہوں۔ ایک ہی وقت میں مختلف سطح کے ہندستان میں گھومتی ہوں۔ پہلے تغلق آباد، اس کے بعد اندر پرستھ اور پھر ماڈرن دلی۔ اور پھر ایک بنگلہ دیشی لڑکا مجھے ملتا ہے اور اپنی بات کرتا ہے۔ آخر میں مولانا روم کی بانسری اور سمبالزم آتا ہے۔ پوری کہانی جو ہے مانو ایک معمہ ہے۔ اکثر صوفیوں کا قاعدہ تھا کہ نصیحت معموں میں کرتے تھے تو مانو یہ پوری کہانی پالیٹکل بھی ہے اور میٹافزیکل بھی۔

صادق:

''سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات'' اردو میں اپنی طرز کی ایک بے مثال کہانی ہے۔ اس تصنیف کے پس منظر کے بارے میں بھی کچھ بتایئے۔

قرۃ العین حیدر:

میں 1974 میں سوویت جارجیا گئی تھی۔ جارجیا، آذربائیجان اور آرمینیا، یہ سارے

علاقے مجھے بے حد Fascinate کرتے ہیں۔ان کے بارے میں فارسی لٹریچر میں ایک پوری متھ بنی ہوئی ہے۔کوہ قاف، چشمہ حیات، صد سکندری وغیرہ۔'ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی' میں بھی یہ اشارے موجود ہیں۔تو یہ سارے علاقے بہت ہی اہم ہیں۔تاریخی اور کلچرل لحاظ سے یہ ایریا پورب اور پچھم کا سنگم ہے۔ میں وہاں ایک چرچ میں گئی۔ وہاں تہہ خانوں میں پتھر کے تابوت رکھے تھے۔سنیاسنوں اور سنیاسیوں کی ہڈیاں، کھوپڑیاں اور پنجر تھے ان میں۔روسی گائیڈ نے بتایا کہ یہ آٹھویں صدی عیسوی کے تابوت ہیں۔ وہیں گیارھویں صدی کے ایک چرچ میں ہال کے اندر مزار تھے۔عباسی خلافت کے دور میں آذربائیجان، بغداد حکومت کا ایک صوبہ تھا۔اس میں ایک مزار عباسی شہزادے کا بھی موجود تھا۔ بہرحال، میں نے یہ کہانی لکھی کہ تہہ خانے کے دو پنجروں میں جان پڑ جاتی ہے اور آج کی دنیا میں ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔وغیرہ،وغیرہ۔

جب یہ دونوں پنجر سوویت جارجیا سے بھاگتے ہیں تو ایک زندہ آدمی ان کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہے اور وہ بھی ویسٹرن یورپ پہنچ جاتا ہے۔اس کا پس منظر یہ ہے کہ میں ماسکو کے رائٹرس یونین میں بیٹھی ہوئی تھی اور سامنے میز پر شطرنج کی بازی لگی ہوئی تھی۔روس میں قاعدہ ہے کہ اگر آپ وہاں اکیلے بیٹھے ہیں تو کوئی بھی، اجنبی بھی آکر بیٹھ جائے گا اور کھیلنا شروع کر دے گا۔

اب ایک صاحب روسی آکر بیٹھ گئے۔ مجھے کھیل میں بری طرح ہرانے لگے۔اتنے میں ڈاکٹر ملک راج آنند آگئے۔ میں نے ان سے اردو میں کہا کہ یہ آدمی تو مجھے بہت ہی بری طرح شکست دینے والا ہے۔مجھے آپ پکار لیجیے تاکہ میں یہاں سے اٹھوں۔انھوں نے مجھے آواز دی تو میں نے اس آدمی سے معذرت کی اور اٹھ گئی۔شاید یہ وہی رائٹر تھا جو کچھ روز بعد کرشن ساگر میں کود کر دوسری طرف نکل گیا۔چنانچہ اس کہانی میں مانو وہی رائٹر ان پنجروں کے ساتھ بھاگا۔

صادق:

ہندستان اور پاکستان کے اردو ادب میں کیا آپ کوئی فرق محسوس کرتی ہیں؟ کیا دونوں ملکوں کے ادب کی الگ شناخت بن گئی ہے؟

قرۃ العین حیدر:

اردو کی تقسیم ممکن نہیں۔ بنگلہ کا بھی ممکن نہیں اور پنجابی کی تقسیم بھی نہیں ہو سکتی۔ زبان اگر ایک ہی ہے تو ہر ملک کے اپنے اپنے حالات ہیں، اپنے اپنے تقاضے ہیں اور جو ادیب وہاں رہتے ہیں یا وہاں پیدا ہوئے ہیں، خاص طور سے آزادی کے بعد جو پیدا ہوئے ہیں، ہندستان یا پاکستان میں ان کی اپنے اپنے مسائل ہیں اور ان کی اپنی سوسائٹی الگ ہو گئی ہے۔ یہ بات ہے تو مانو ان کا چیزوں کو اور زندگی کو دیکھنے کا انداز بدل گیا ہے۔ ہندستان اور پاکستان کی نئی نسلیں اپنے اپنے حالات سے متاثر ہیں۔ وہاں کے جو حالات ہیں اور جو نیا سماج بنا ہے، وہ وہاں اس کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی ان کی جو نئی شخصیت، تہذیب بنی ہے، اس کے لحاظ سے لکھ رہے ہیں۔

ہندستان اور پاکستان کی نئی نسل کے بارے میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ پاکستان میں اُردو سرکاری زبان ہے اور تعلیم کا ذریعہ بھی ہے اور اس کی وہاں وہی حیثیت ہے جو ہندستان میں ہندی کی ہے۔ لہٰذا وہاں کے لکھنے والوں کو وہ فرسٹریشن نہیں ہے جو ہندستان میں نئے اردو کے لکھنے والوں کو ہے کہ ہم کس کے لیے لکھیں اور کن رسالوں میں لکھیں، کیونکہ گنتی کے رسالے ہیں اور ان کی اشاعت بھی محدود ہے۔ مجھے یاد ہے، آج سے کوئی بیس پچیس سال پہلے بلراج مینرا نے مجھ سے بہت تلخی کے ساتھ کہا تھا کہ جب آپ نے لکھنا شروع کیا تو اس زمانے میں اتنے رسالے نکل رہے تھے، اتنی بڑی ریڈر شپ تھی۔ اب ہم کس کے لیے لکھیں اور کہاں لکھیں؟ پاکستان میں میڈیا، ٹی وی، رسائل یہ سب لکھنے والوں کے لیے موجود ہیں، جبکہ یہاں ایسا نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ ہندی میں لکھ کر یا ترجمہ کروا کے ایک بڑی ریڈر شپ تک پہنچیں۔

صادق:

ایک بات اور۔ ہندستان میں آپ کی گیارہ بارہ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ جبکہ پاکستان میں آپ کے نام سے شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد تیس چالیس کے قریب ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

قرۃ العین حیدر:

اس کی وجہ یا جواب تو آپ کو ہندستان اور پاکستان دونوں کی حکومتوں سے پوچھنا چاہیے، کیونکہ دونوں ملکوں کے درمیان کوئی کاپی رائٹ قانون نہیں ہے۔ دونوں ملکوں کے جو ادیب زیادہ پڑھے جاتے ہیں ان کی کتابیں دونوں طرف چوری سے چھپتی ہیں۔ یہی صورت حال بنگلہ دیش اور مغربی بنگال کی ہے کہ بنگلہ کتابیں دونوں طرف کھلے خزانے کی طرح چھپتی ہیں، کیونکہ کوئی کاپی رائٹ قانون وہاں بھی نافذ نہیں ہوتا۔ پاکستانی پبلشر جانتے ہیں کہ وہاں میری کتابیں ہاتھوں ہاتھ بکتی ہیں اس لیے دھڑا دھڑ چھاپ کر فروخت کر رہے ہیں، لیکن ان سے مجھے ایک پیسہ رائلٹی آج تک نہیں ملا ہے۔ میری کتابیں 12 ہیں، لیکن ان کو وہ مختلف عناوین سے شایع کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر میرے کہانی کے مجموعہ میں اگر ایک کہانی کا عنوان 'پت جھڑ کی آواز' ہے، تو دوسرا پبلشر اسی مجموعہ کو اسی میں سے کوئی دوسری کہانی لے کر اس کے نام سے شایع کر دے گا۔ اچھا، کئی بار وہ نہایت بے ہودہ بھونڈے نام بھی اپنی طرف سے رکھ دیتے ہیں، جسے میں تو کبھی نہ رکھوں۔

بہر حال، چالیس ناموں سے میری کتابیں وہاں فروخت ہوتی ہیں اور ان سے وہاں کے پبلشروں نے لاکھوں روپیہ بنایا ہے۔ آپ کو اس سوال کا جواب ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی حکومتوں سے لینا چاہیے۔

(یہ انٹرویو ہندی مجموعہ 'یہ داغ داغ اجالا' میں شامل ہے جسے بھارتیہ گیان پیٹھ نے 1990 میں شایع کیا۔)

ہم سب تاریخ کے چوکھٹے میں بندھے ہیں

راجندر اُپادھیائے

قرۃ العین حیدر کو سال 1989 کا گیان پیٹھ ایوارڈ دینے کا اعلان سنیچر 7 جولائی 1990 کو کیا گیا۔ اتوار کو اخبار ان کی تصاویر اور خبروں سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ ٹیلی ویژن پر دکھائی گئیں۔ ٹیلی ویژن پر انھیں دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے کیمرے کے سامنے مائک پر اپنی تصنیفات کے بارے میں کچھ بولنے میں انھیں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ پھر بھی 25ویں گیان پیٹھ ایوارڈ نے انھیں ایک بار پھر کیمرے اور مائک کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

یہ دوسرا موقع ہے جب کسی اردو مصنف کو اس ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ 1969 میں اس ایوارڈ سے سرفراز ہونے والے فراق گورکھپوری بھی اپنی تحریروں کی وجہ سے مقبول تھے ہی، وہ اپنے سلوک کی وجہ سے بھی مشہور رہتے تھے۔ قرۃ العین بھی اپنے سلوک کی وجہ سے مقبول رہی ہیں، 'آگ کا دریا' کی وجہ سے تو وہ مقبول ہیں ہی۔

گیان پیٹھ ایوارڈ کے ضمن میں میں ان پر کچھ لکھنے کی سوچ رہا تھا اور ان سے ملنے کی خواہش بھی کہیں اندر کچوٹ مار رہی تھی، لیکن ان سے ملنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ میں انھیں

پہلے سے جانتا بھی نہیں تھا۔ کہیں سے ان کا پتہ اور ٹیلی فون نمبر تو پتہ کر لیا تھا، لیکن ان کو ٹیلی فون کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ جس دن مجھے ان کا ٹیلی فون نمبر ملا، اسی دن انگریزی کے ایک اخبار نے ان کے بارے میں لکھا کہ انھیں 'انٹرویو' دینے میں سخت نفرت ہے، اس لیے انھیں ٹیلی فون کرنے کی اور بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پھر بھی شام کے وقت میں نے ان کا ٹیلی فون نمبر گھما دیا۔ ایک سیکنڈ میں ٹیلی فون لگ گیا۔ اور اُدھر قرۃ العین کھڑی تھیں۔ ''بتائیے، کب آئیں گے؟'' مجھ سے کچھ بولا نہ گیا، میں حیران، حیرت زدہ سا کھڑا رہا۔ یہ وہی خاتون تھیں جو کسی کو انٹرویو نہیں دیتیں، جس کے بارے میں سنا ہے کہ دعوت کے لیے بلا کر گھر پر تالا لگا کر چلی جاتی ہیں۔

سنیچر 11 بجے صبح کا وقت طے تھا، ہم اپنے فوٹوگرافر کے ساتھ ٹھیک وقت پر پہنچے۔ اپنی کھڑکی کے پاس لگے گملوں کے پاس بیٹھ کر انھوں نے فوٹو کھنچوائے اور انٹرویو شروع ہوا۔ تقریباً گھنٹے بھر کے اس انٹرویو میں ہم نے سوال و جواب کا سلسلہ جوں کا توں رکھا ہے، انگریزی اردو کے لفظ بھی رہنے دیے ہیں۔ کہیں کہیں مشکل جملوں کو دیکھ کر کچھ تبدیلی کی گئی ہے۔

راجندر:

اتنے طویل عرصہ کے بعد آپ کے ذریعہ اردو ادب گیان پیٹھ ایوارڈ سے سرفراز ہوا ہے، اس کے لیے آپ کو بہت بہت مبارکباد۔

حیدر:

شکریہ۔

راجندر:

آپ اس پر کیا سوچتی ہیں؟ کیا یہ دورانیہ زیادہ تھا؟ کیا یہ ایوارڈ آپ کو بہت پہلے مل جانا چاہیے تھا؟

حیدر:

مجھے اس بارے میں کچھ نہیں کہنا ہے۔

راجندر:

آپ کے نام کا کیا مطلب ہے؟

حیدر:

قرۃ العین میرا نام ہے۔ قرۃ العین کا مطلب ہے آنکھ کی پتلی، روشنی۔ 'عین' عربی میں کہتے ہیں آنکھ کو۔ عینک اسی سے نکلا ہے۔ جیسے 'نین تارا' ہے ویسے قرۃ العین ہے۔

راجندر:

چونکہ آپ کے والدین بھی ادیب تھے، اس لیے ادب آپ کو وراثت میں ملی ہے؟

حیدر:

لگتا تو ایسا ہی ہے۔ ماں، باپ دونوں لکھیں گے تو بچے بھی ہوں گے ہی لکھنے والے۔ میرے والد سجاد حیدر یلدرم افسانہ نگار تھے، شعر بھی کہتے تھے کبھی کبھی۔ میری والدہ نذر سجاد حیدر اردو کی بہت مشہور اور اہم ناول نگار تھیں اور خواتین کے ادب میں ان کا بہت بڑا تعاون ہے۔

راجندر:

کیا آپ کو بچپن سے ہی ادب میں دلچسپی تھی؟

حیدر:

جی ہاں۔ بچپن میں ایسا شوق تھا۔ میری ماں کی بوا (اکبری بیگم) اس وقت کی بہت بڑی مصنفہ تھیں۔ ان کا مشہور ناول 'گودڑ کا لال' 1910 میں شائع ہوا تھا اور لڑکیوں کو جہیز میں دیا جاتا تھا۔ ان کا پہلا ناول 1898 میں شائع ہوا تھا۔

راجندر:

آپ کا ناول 'میرے بھی صنم خانے'، جو آپ نے 19 سال کی عمر میں لکھا تھا اور جو 1949 میں شائع ہوا تھا، کیا آپ اسے اپنا بہترین ناول تصور کرتی ہیں؟

حیدر:

نہیں، بہترین تو کوئی بھی نہیں ہوتا، اگلی چیز اچھی ہوگی، ایسا سوچتے ہیں۔ یہ ناول میں

نے ایم اے کرنے کے بعد 1947 میں ہی لکھ لیا تھا، لیکن شایع ہوا 1949 میں۔

راجندر:

تو آپ اپنی بہترین تصنیف کسے مانتی ہیں؟

حیدر:

اس کا جواب میں کئی دفعہ دے چکی ہوں۔ 'آخر شب کے ہمسفر'، 'گردش رنگ چمن' اور اب 'چاندنی بیگم'۔

راجندر:

'چاندنی بیگم' آپ کا نیا ناول ہے۔ اس ناول کے ذریعہ آپ نے کیا کہنے کی کوشش کی ہے؟

حیدر:

اس میں بہت کچھ کہنے کی کوشش کی ہے، لیکن اسے بتانا مشکل ہے۔ آ جائے تب، چھپ جائے تب پڑھ لیجیے گا۔ میری کہانی میں کوئی ہیرو۔ہیروئن نہیں ہے، کوئی ایک کہانی نہیں ہے۔ بہت سی باتیں ہیں۔ میری کہانی میں کئی 'انڈر کرنٹس' چلتے ہیں۔ 'ٹریڈیشنل پلاٹ' نہیں ہوتا ہے۔ 'میٹافزکس' ہوتے ہیں۔ آج کے حالات جو دنیا کے ہیں، ہمارے سماج کے ہیں، انسانیت کی جدوجہد ہے۔ بہت سی باتیں ہیں۔

راجندر:

آپ نے کبھی شعر وغیرہ کہے ہیں؟

حیدر:

نہیں۔ بہت پہلے انگریزی میں کبھی کبھی کچھ لکھا ہے۔ چھپا بھی ہے۔

راجندر:

زیادہ تر آپ نے تاریخی ناول لکھے ہیں؟ کہا جاتا ہے کہ آپ کے ناول تاریخی داستانیں ہیں؟

حیدر:

دیکھیے، ان کو تاریخی نہیں کہہ سکتے۔ کلاسک تو اس کو کہتے ہیں جو انگریزی میں والٹر اسکاٹ لکھتے ہیں۔ اردو میں مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے تھے، وہ تاریخی کہلاتا ہے...

راجندر:

ہندی میں جیسے ورنداون لال ورما لکھتے تھے۔

حیدر:

ایک چیز ہوتی ہے 'فلاسفی آف ہسٹری'، اس کو لے کر اگر آپ کوئی چیز لکھیں، اس کے ساتھ اس کا '......کرنٹ'، اس کا 'فریم ورک' لے کر... ہم سب 'ہسٹری' کے رابطہ میں ہی تو ہیں۔ کوئی لنک تو رہے نہیں ہیں آسمان میں۔ اس کو ذہن میں رکھو تو ہر چیز تاریخ میں ہے۔ 'سائنس'، 'فکشن' میں بھی تاریخ ہوتا ہے۔ جس طرف دنیا جارہی ہے اس کی نمائندگی کرتا ہے۔

راجندر:

'آگ کا دریا' تو آپ نے پاکستان میں لکھا تھا۔ اس وقت آپ کیسے حالات سے گزر رہی تھیں؟ کس ذہنی حالت میں مبتلا تھیں آپ؟

حیدر:

جی ہاں، 'آگ کا دریا' میں نے پاکستان میں ہی لکھا تھا۔ لیکن کوئی ایسے حالات نہیں تھے، ذہنی حالت ایسی نہیں تھی، کچھ بھی نہیں تھا۔ بہت اچھی تھی۔

راجندر:

نہیں، میرا مطلب یہ تھا کہ ایک دور ہوتا ہے جس میں کوئی بڑی کتاب لکھی جاتی ہے....

حیدر:

دیکھیے، مجھے شوق ہے ہسٹری کا، میں نے سوچا تھا کہ 'ٹوٹل ناول' جسے کہتے ہیں، حالانکہ تب مجھے 'ٹوٹل ناول' کا مطلب پتہ نہیں تھا، وہ تو مجھے گزشتہ دو تین سال میں معلوم پڑا ہے۔ ہندستان میں جو اتنے مسائل ہیں، ان کی جڑیں کہاں ہیں؟ ہندستان کی 'کلچرل پرسنالٹی' کی ترقی

کیسے ہوئی؟ جو سوچنے والے انسان ہیں، انھوں نے کیا کیا سوچا، کہا، کیا...اس کی دریافت کرنے کی کوشش میں نے اس میں کی ہے۔

راجندر:

'ٹوٹل ناول' آپ اس کو کہہ سکتی ہیں؟

حیدر:

میں نے نہیں کہا، ایک سویڈش پروفیسر نے کہا ہے کہ "آپ 'ویسٹ' میں جو 'ٹوٹل ناول' لکھے جا رہے ہیں، 'ٹوٹل ناول' کا جو کنسپٹ چل رہا ہے، وہ تو آپ نے بہت پہلے لکھ دیا تھا' آگ کا دریا' کے ذریعہ سے۔

راجندر:

اس کا پاکستان میں کیا ردِعمل رہا؟

حیدر:

پاکستان میں یہ ناول جب سے شائع ہوا ہے، 'ٹاپ بیسٹ سیلر' ہے۔ پاکستان میں 3 تحریریں ٹاپ بیسٹ سیلر ہیں، اقبال، فیض اور یہ ناول۔ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈس میں یہ لکھا جانا چاہیے کہ مجھے اس ناول سے نہ ہندستان میں اور نہ پاکستان میں ہی آج تک کوئی رائلٹی ملی۔

راجندر:

آپ کو کوئی رائلٹی نہیں ملی!

حیدر:

ناٹ اے سنگل پینی۔ اب جا کر انڈیا میں اس کا ایک ایڈیشن میری اجازت سے نکلا ہے۔ ورنہ اب تک کتنے ہی غیر قانونی ایڈیشن نکل گئے ہیں، بغیر میری اجازت کے۔

راجندر:

پاکستان میں آپ کو کیا کیا دقتیں پیش آئیں؟

حیدر:

کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ یہ سوال سب پوچھتے ہیں۔ اِٹس اے پولیٹکل کوئیچن۔ میں پاکستان سے نہیں آئی ہوں، انگلستان سے آئی ہوں۔ میں چاہتی تو انگلستان میں ہی رہتی۔ لکھیے اسے۔ ابھی ایک صاحب نے ایک انگریزی اخبار میں لکھا کہ پاکستان میں مجھے سرکاری طور پر بہت ستایا گیا، جو کہ بالکل غلط ہے اور 'آگ کا دریا' کے بارے میں 'جنگ' اخبار نے جو بیہودہ مضمون لکھے تھے، اس پر میں نے اپنی سوانح حیات 'کارِ جہاں دراز ہے' (دوسرا ایڈیشن 1979) میں تفصیل سے لکھا ہے اور وہ صاحب اسے پڑھ بھی چکے ہیں، لیکن کسی بھی مضمون نگار کے بارے میں بے بنیاد باتیں لکھنا میں اچھا نہیں سمجھتی۔ ابھی ایک اخبار نے شائع کیا کہ 'عام آدمی میرا موضوع نہیں ہے۔'' یہ بات میں نے کبھی ہی نہیں تھی۔ میں بہت افسردہ ہو جاتی ہوں یہ سب دیکھ کر۔ میں پاکستان میں اعشار یہ نظام پرپنی سکوں پر ٹیلی فلم کی اسکرپٹ تیار کر کے اور اس ٹیلی فلم پر کام شروع کروا کر لندن گئی تھی۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ لوگ محض سنسنی پیدا کرنے کے لیے بے بنیاد باتیں لکھتے ہیں۔

راجندر:

آپ کو لکھنے کی ترغیب کہاں سے ملی؟ کون آپ کے پسندیدہ نثر نگار، شاعر تھے؟

حیدر:

مجھے لکھنے کی ترغیب اپنے گھر سے ہی ملی۔ ہمارے گھر کی پوری روایت لٹریری تھی۔ میں بچپن سے لکھ رہی ہوں۔ پہلے بچوں کے لیے لکھتی تھی، بچوں کے رسالے میں۔

راجندر:

خاتون کی رائٹنگ اور مرد کی رائٹنگ کو کئی لوگ الگ الگ نظر سے دیکھتے ہیں۔ کیا کوئی ایسی تقسیم درست ہے؟

حیدر:

اردو میں ایسی کوئی تقسیم نہیں ہے۔ رائٹر، رائٹر ہے۔ عورتوں کے لیے لکھنے والی خاتون

رائٹرس بہت ہیں۔ وہ گھریلو عورتوں کے لیے ہی لکھتی ہیں۔ گھریلو مسائل پر، رومانس پر لکھتی ہیں۔ وہ 'ویمنس لٹریچر' کہلاتا ہے اور وہ دنیا کے ہر ادب میں موجود ہے۔ اس کو عورتیں ہی پڑھتی ہیں۔ وہ عورتوں کی دلچسپی کا ہی ہوتا ہے۔

راجندر:

دنیا میں آج مصنفین کی جو حالت ہے، مصنف کا درجہ آج کل گھٹ گیا ہے، ادب اب لوگوں کے لیے اتنا دلچسپی کا مظہر نہیں رہ گیا ہے، جتنا پہلے تھا، وقت کاٹنے کو اب بہت سی دوسری چیزیں آگئی ہیں....

حیدر:

اس میں دو طرح کی باتیں ہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے یہاں 'لٹریسی' کا فیصد بہت کم ہے۔ دنیا کے رائٹروں کی سوچ، ترجیحات الگ ہیں، بیرون ممالک میں زیادہ سہولیات ہیں۔ ہم ایک ایسے سماج کے لیے لکھ رہے ہیں جہاں تعلیم بہت ہی کم ہے۔ عام طور پر لوگوں کی پڑھنے کی عادت چھوٹتی جا رہی ہے۔ لوگ ٹی وی دیکھتے ہیں۔ انھیں پڑھنے کی فرصت نہیں ہے۔

راجندر:

تو ایسے میں ادیب کو کیا کرنا چاہیے؟ بس لکھتے رہے!

حیدر:

بس یہ اپنا کام کرتا رہے۔ زندگی کا اب تو ڈھنگ ہی بدل گیا ہے۔ میوزک کا رجحان دیکھیے، کس طرف جا رہی ہے۔ پہلے کیسی عمدہ موسیقی ہوتی تھی۔ اب دنیا کس طرف جا رہی ہے۔

راجندر:

ہندی اور اردو کہانی میں کیا فرق ہے؟ ہندی اور اردو کہانی میں کتنی نزدیکیاں اور دوریاں ہیں؟

حیدر:

میرے خیال میں تو کوئی فرق نہیں ہے۔ لوگ آج کل صاف زبان میں لکھتے ہیں۔ میں نے کملیشور، موہن راکیش اور دوسرے افسانہ نگاروں کو پڑھا ہے۔ دودھ ناتھ سنگھ کی کہانی میں نے 'ویکلی' میں شایع کی تھی۔ ہندی کہانی بہت اچھی ہوتی ہے۔

راجندر:

پریم چند کو بھی پڑھا ہوگا؟

حیدر:

پریم چند تو اردو ہی کے رائٹر ہیں، ان کو تو پڑھنا ہی ہے۔ بعد میں وہ دونوں زبانوں میں لکھنے لگے۔

راجندر:

ہندی خاتون رائٹرس کو بھی پڑھا ہوگا؟

حیدر:

پڑھا ہے میں نے۔ وہ بھی ماڈرن سنسبلیٹی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ وہی ان کے مسائل ہیں۔ مراٹھی، بنگلہ کے ناول نگار بھی ایسے ہی ہیں۔ مسائل تو سب کے ایک ہی ہیں، 'ٹریٹمنٹ' الگ ہے۔

راجندر:

یہ جو انگریزی کے رائٹرس ہیں ان میں تو فرق ہے تھوڑا سا؟

حیدر:

وہ ہندستان کے بارے میں جب بھی لکھتے ہیں، وہاں جا کر کیسی کیسی باتیں لکھتے ہیں۔ ویسٹرن ریڈر کے 'پوائنٹ آف ویو' سے لکھتے ہیں۔ ایسے بھی رائٹر ہیں جو ہندستان کے 'ایکسورک ایلیمنٹ' کو ابھارتے ہیں۔

راجندر:

ملک راج آنند ہے؟

حیدر:

نہیں، ملک راج ایسے نہیں ہیں۔ ملک راج آنند نے ہمارے اس وقت کے رائٹر ہیں جب بہت کم لوگ انگریزی میں لکھتے تھے۔ آپ کو پتہ ہے 'ویسٹ' میں سب سے زیادہ مشہور نام ٹیگور کے بعد ملک راج آنند کا ہے... آج تک۔

راجندر:

سلمان رشدی کے بارے میں....

حیدر:

جو اسلام کے بارے میں اس نے لکھا ہے۔ انگلینڈ میں آپ عیسیٰ کے بارے میں کوئی بیہودہ بات نہیں کہہ سکتے۔ اس نے محمد صاحب کے بارے میں لکھا ہے۔ 'بیڈ لی ریٹن ناول'۔ اس کا مزاح بھی بہت بیہودہ ہے... 'فلائٹ نمبر 420' کہتا ہے۔ اس قسم کا 'ہیومر' ہے۔ نیرد چودھری لارڈ کلائیڈ کی سوانح حیات لکھتے ہیں۔ ان کو 'نائٹ ہڈ' ملتا ہے۔ اسے ہندستان میں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ عیسیٰ کی فلم پر فرانس اور انگلینڈ میں پابندی لگی ہوئی ہے، تو کچھ نہیں۔ ہندستان میں رشدی کی کتاب پر پابندی لگا دی تو فریڈم آف ایکسپریشنز پر حملہ ہو گیا؟ نائپال نے لکھ دیا ہندستان کے بارے میں 'ایریا آف ڈارکنیس' بڑا آسان نسخہ ہے۔ ہندستان کی غلط اور اندھیری تصویریں پیش کرنا ان کا مقصد ہے۔ وہ وہاں بہت بکتی ہیں۔

راجندر:

اپنے ترجموں کے بارے میں کیا سوچتی ہیں؟ کیا ان میں آپ کی روح آ پائی ہے؟

حیدر:

ہندی میں تو بہت ہی خراب ترجمے ہوئے زیادہ تر۔ انگریزی میں ٹھیک ہوئے ہیں، کیونکہ میں نے ہی کیے ہیں۔

راجندر:

آپ نے کیے اس لیے اچھے ہیں، لیکن مصنف اپنی ہی کتاب کا اچھا ترجمہ نہیں کر سکتا

ہے...ایسا کہا جاتا ہے۔

حیدر:

میں نے تو کیے ہیں۔ میں تو اپنا جانتی ہوں۔ میں نے انھیں کہانیوں کو دوبارہ انگریزی میں لکھا ہے۔

راجندر:

اردو میں اب کوئی بڑی صلاحیت سامنے نہیں آ رہی... غالب اور میر جس زبان میں ہوئے، اس زبان میں....

حیدر:

کتنے شیکسپیئر سامنے آئے ہیں انگریزی میں؟ کتنے کالی داس ہوئے ہندستان میں؟ آپ مجھے بتائیے۔ ایسے لوگ تو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ غالب، میر تو ہر ایک نہیں ہو جاتا ہے۔ بہت لوگ لکھ رہے ہیں اور ان میں سے بھی کافی لوگ اچھا لکھ رہے ہیں۔

راجندر:

معروف ناقد گوپی چند نارنگ نے بھی کہا تھا ''ہم شاعری کے مارے ہوئے ہیں۔'' کیا یہ بات سچ ہے؟ کیا اردو شاعری نے دیگر اصناف کو فروغ نہیں پانے دیا ہے؟

حیدر:

ہاں، یہ بات بھی سچ ہے۔ اردو کی شاعری بہت ہی اچھی رہی ہے۔ شاعری مشاعرے کی چیز ہے۔ جو پڑھ نہیں سکتے وہ بھی مشاعروں میں جا کر انجوائے کرتے ہیں۔ شاعری گانے کی چیز ہے۔ افسانے تو پڑھنے پڑیں گے۔

راجندر:

اردو افسانے کی آج کل کیا حالت ہے؟ ہندستان میں اور پاکستان میں اردو کے افسانہ نگار کیا لکھ رہے ہیں؟ اردو ادب کی پاکستان میں کیا حالت ہے؟

حیدر:

اردو افسانے کی بہت اچھی حالت ہے پاکستان میں۔ وہاں سرکاری زبان اردو ہے اس لیے وہاں زیادہ سہولیات ہیں۔ وہاں زیادہ پبلشر ہیں اور زیادہ پڑھنے والے ہیں۔ اصل چیز یہی ہے۔

راجندر:

شہریار نے کہیں کہا ہے کہ ''اردو کے زیادہ تر افسانہ نگاروں کا شہروں سے تعلق رہا ہے اور ہندی کے افسانہ نگار گاؤں سے اور قصبوں سے وابستہ رہے ہیں۔'' ایسا کیوں؟

حیدر:

اردو میں گاؤں کے بارے میں اتنے افسانے ہیں۔ پریم چند کے علاوہ بھی لوگوں نے لکھا ہے۔ یہ تو ایک متھ ہے۔ دیہاتوں کے بارے میں خوب لکھا گیا ہے۔ سبھی نے لکھا ہے ایک نے نہیں۔ بیدی ہیں، راجندر سنگھ بیدی۔ بلونت سنگھ، حیات اللہ انصاری، علی عباس حسینی وغیرہ۔ شاعری بھی گاؤں سے اردو میں اتنی اچھی آئی ہے۔

راجندر:

اردو میں کیا مراٹھی جیسا دلت ادب بھی ہے؟

حیدر:

نہیں، اردو میں ایسا 'مسئلہ' نہیں تھا۔ مسئلہ نہیں تھا نہ؟

راجندر:

آپ کا ناول 'کارِ جہاں دراز ہے' اردو کا پہلا غیر تصوراتی ناول کہا جاتا ہے؟

حیدر:

ہاں، اس میں پہلی بار 'غیر افسانوی' ناول اردو میں لکھا گیا، اس میں نسلوں کی کہانی ہے، غیر تصوراتی ہے، فکشن نہیں ہے صرف طرز ہے ناول کا۔ حقیقت کے زیادہ قریب ہے۔ یہ ایک خود نوشت طرز کا ناول ہے۔ اس میں آبا کی کہانی ہے جو 8 ویں صدی سے شروع ہو کر موجودہ وقت

تک جاری رہتی ہے۔ ناول کے طرز پر لکھی گئی ہے۔

راجندر:

آپ کے کسی ناول پر کوئی فلم بنی ہے؟

حیدر:

نہیں، بہت آفر آئے، اب بھی سیریل کے لیے لوگ آتے رہتے ہیں۔

('آج کل' ہندی، 1990)

ناچ گرل خالص برطانوی اصطلاح ہے

وہاج الدین علوی

وھاج الدین علوی:

عینی آپا! پچھلے ہفتے ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے آپ کے فیلو منتخب ہونے کی خبر اخبارات میں شایع ہوئی۔ اردوداں حلقوں میں اس خبر کا خیر مقدم بڑی مسرت سے کیا گیا اور کئی دن تک یہ اعزاز موضوع گفتگو رہا۔ میں ممنون ہوں گا اگر آپ اس فیلوشپ کی نوعیت پر کچھ روشنی ڈالیں۔

قرۃ العین حیدر:

بڑی دلچسپ بات ہے کہ اکثر لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کو اس فیلوشپ میں کتنے پیسے ملیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ UGC یا کسی یونیورسٹی کی گرانٹ کی قسم کی چیز ہے جو کسی پروجیکٹ کے لیے دی جاتی ہے۔ بھئی یہ فیلوشپ نہیں بلکہ ساہتیہ اکاڈمی یعنی نیشنل اکاڈمی آف لیٹرز کا اعزاز ہے جو تاحیات ہوتا ہے 1968 سے یہ اعزاز شروع ہوا ہے اس میں اکیس ادیب سے زیادہ نہیں لیے جاتے یعنی جس طرح فرانس میں اکاڈمی آف فرانس ہے اور اس کے چند فیلو منتخب کیے جاتے ہیں اسی طرز پر ساہتیہ اکاڈمی کی فیلوشپ ہے۔

علوی:

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آپ اردو زبان کی پہلی ادیب ہیں جنھیں اکاڈمی نے فیلو منتخب کیا ہے۔ اس سے قبل ہندستان کی کئی دیگر زبانوں کے ادیبوں کو یہ اعزاز دیا گیا ہے۔

اس سے قبل آپ کی ادبی و علمی خدمات کے اعتراف میں گیان پیٹھ ایوارڈ اور اقبال سمان دیا گیا۔ ہندستان کے مشہور اخبارات میں آپ پر write up آئے اور انٹرویو شایع ہوئے جس سے قارئین واقف ہیں۔ میں اس وقت آپ کے ترجمہ کردہ ناول ''ناچ گرل'' کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ غالبًا چار پانچ ماہ قبل اس ناول کا امریکن ایڈیشن شایع ہوا ہے مگر اس کے ناشر نے ناول کا نام تبدیل کر کے Dancing Girl رکھ دیا ہے کیا نام کی اس تبدیلی پر آپ کچھ روشنی ڈالیں گے۔

قرۃ العین حیدر:

بھئی ناچ گرل خالص برطانوی اصطلاح ہے New Direction new York جنھوں نے اس کا امریکن ایڈیشن چھاپا ہے انھوں نے ہی اس کا نام Dancing Girl کر دیا کیونکہ امریکن ناچ گرل نہ سمجھ پاتے۔

علوی:

London Times Literary Suppliment نے تو اس پر بہت مفصل اور بے حد توصیفی Review شایع کیا لیکن یہاں اردو میں اس ناول کے سلسلے میں بعض حضرات نے بہت اعتراضات کیے ہیں کچھ لوگ تو اسے حسن شاہ کا ناول ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں! وہ اپنی اپنی سمجھ بوجھ اور استعداد کی بات ہے۔ میرے خلاف یعنی میری تحریروں کے خلاف لکھا جاتا ہے تو میں اس کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی۔ ابھی پاکستان کے اخبار Nation میں مظفر علی سید نے بھی ناچ گرل کی تنقیص کی ہے۔ اب اگر میں ان تمام کرم فرماؤں کے اعتراضات کا جواب لکھنے بیٹھ جاؤں تو اور کچھ کر ہی نہ سکوں۔

علوی:

عینی آپا! اگر آپ اجازت دیں تو میں ادب سے ہٹ کر ادیب کے بارے میں کچھ دریافت کرلوں۔ دراصل پروفیسر احمد علی صاحب کے بارے میں سنا گیا ہے کہ وہ انتقال فرما گئے۔ کیا یہ خبر صحیح ہے؟ آپ کی اطلاع ہے۔

قرۃ العین حیدر:

جی ہاں! میری کزن امینہ سید جو آکسفورڈ یونیورسٹی پریس پاکستان کی مینجنگ ڈائرکٹر ہیں۔ کتاب میلے کے لیے یہاں آئی ہوئی ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا مجھے بے حد صدمہ ہوا میری ان سے آخری ملاقات چار سال قبل کراچی میں ہوئی تھی انھوں نے مجھے اپنا قرآن شریف کا ترجمہ عنایت کیا تھا پروفیسر احمد علی سے میرے خاندان کے تعلقات بہت پرانے تھے جب میرے نانا دہرہ دون میں مقیم تھے۔ شاید 1928 کی بات ہے اس وقت نوجوان احمد علی ان کے پڑوسی تھے اور روزانہ صبح کو آکر انھیں اخبار پڑھ کر سناتے تھے میری والدہ نے جو فوٹوگرافی کی ماہر تھیں، احمد علی کی تصویر بھی کھینچی تھی وہ میرے پاس موجود ہے۔ احمد علی انگارے گروپ میں شامل ہوئے اور ان کی بے مثال کہانی ''ہماری گلی'' بھی چھپی۔ مجھے تفصیل سے معلوم نہیں شاید انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں انگریزی بھی پڑھائی پھر وہ پاکستان چلے گئے ان کی شادی بلقیس جہاں بیگم سے ہوئی جو دہلی کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ بلقیس باجی کی چھوٹی بہن نفیس مرزا محمد حسن عسکری کی بیوی ہیں۔ عسکری چند سال قبل یہاں پاکستان سفارت خانے میں منسٹر پریس تھے۔ وہ نامور ماہر تعلیم پروفیسر محمد سعید مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ ان کے چھوٹے صاحبزادے حسن جعفر سے میری پھوپھی زاد بہن کی لڑکی کی شادی ہوئی ہے۔ یہ سب پرانی دہلی کے شرفا کے خاندان تھے موجودہ ہندستان کے لوگ آج ان کے ناموں سے بھی واقف نہیں۔ بیگم مرزا محمد سعید مرحوم سرسید کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ پروفیسر احمد علی کا ناول Twilight in Delhi بہت مشہور ہوا۔ ملک راج آنند کی طرح ان کا شمار ہندستان کے اولین Indo Anglian ناول نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ جب E.M. Forster سے میری پہلی ملاقات انگلستان میں ہوئی تو انھوں نے پہلا سوال

مجھ سے احمد علی کے بارے میں کیا تھا۔ ان کی خیریت پوچھی تھی۔ احمد علی کا ایک اور ناول Mermaids in Lucknow بھی شایع ہو چکا ہے لیکن اس کو اتنی شہرت نہیں ملی۔ Twilight in Delhi کا اردو ترجمہ بلقیس باجی نے اردو میں بھی کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے "ہماری گلی" اسی ناول کا ایک حصہ ہے۔ اس ناول میں جس دلی کو پیش کیا گیا ہے وہ خواب و خیال ہو چکی ہے۔

ہمارے یہاں اکثر ادیب و شاعر ذرا سی شہرت اور Recognition حاصل کرنے کے بعد ایک عجیب و غریب نخوت اور تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مگر ان کے یہاں اس قسم کا کوئی Personality Problem نہیں تھا

علوی:

عینی آپا! آپ کا بہت بہت شکریہ!

(رسالۂ جامعہ، مارچ-اپریل 1994)

ظ. انصاری کے جملوں میں
طباعی اور ذہانت کی چنگاریاں پوشیدہ ہوتی تھیں

وہاج الدین علوی

جناب ظ. انصاری صاحب مرحوم سے قرۃ العین حیدر صاحبہ کے دیرینہ تعلقات تھے۔ ظ. صاحب کے انتقال پر انھوں نے اپنے جن تاثرات کا اظہار کیا اسے ہماری درخواست پر جناب وہاج الدین علوی نے انٹرویو کی شکل میں قلم بند کیا ہے۔ ذیل میں ہم پورا متن دے رہے ہیں۔ کہیں کہیں سوالات کو حذف کر دیا گیا ہے۔ — ادارہ 'آج کل'

وہاج الدین علوی:

ظ. انصاری سے آپ کی پہلی ملاقات کب ہوئی؟

قرۃ العین حیدر:

ظ. انصاری سے میری ملاقات غالباً 1963 میں لطیفی صاحب کے گھر ڈنر پر ہوئی اور

آخری غالباً 1980 میں وہ ایک روسی ادیب کے ساتھ میرے یہاں آئے تھے۔ افسوس یہ ہے کہ ابھی دسمبر میں میں بمبئی گئی تھی اور میں نے سنا بھی کہ ظ صاحب بیمار ہیں، لیکن کسی کو صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ کون سے ہاسپٹل میں اس وجہ سے میں اپنے چند روزہ قیام کے دوران ان کی عیادت کو نہ جا سکی۔ جس کا بے حد افسوس ہے۔ مرحوم بہت شگفتہ مزاج تھے اور دلچسپ گفتگو کرتے تھے۔ ان کے جملوں میں طباعی اور ذہانت کی چنگاریاں پوشیدہ ہوتی تھیں اور یہی وصف ان کی تحریر کا بھی ہے۔

وھاج الدین علوی:

عینی آپا، ظ انصاری نے کبھی اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتلایا؟

قرۃ العین حیدر:

ظ۔ انصاری پہلی جنگ عظیم کے بعد پیدا ہونے والی اس جنریشن سے تعلق رکھتے تھے جو نہ صرف ذہین اور طباع تھی بلکہ انقلاب اور فرسودہ نظام سے بغاوت اس کی سرشت میں داخل تھی۔ 1930 سے 1942 تک نئی انقلابی تحریکوں نے جن نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچا ان میں ظ۔ انصاری بھی شامل تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ اگست آندولن کی کاروائیوں میں بھی عملی طور پر شامل رہے۔ وہ اس قدر Anti establishment تھے کہ انھوں نے اپنی کنیت بدل ڈالی اور اپنے نام کے ساتھ انصاری لکھنے لگے ورنہ ان کا اصل نام ظل حسنین تھا۔

وھاج الدین علوی:

عینی آپا کیا آپ انصاری صاحب کی صحافتی تحریروں پر کچھ روشنی ڈالیں گی؟

قرۃ العین حیدر:

میرا تعلق عملی طور پر اردو صحافت سے نہیں رہا۔ لیکن انصاری صاحب کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ اعلیٰ درجہ کے صحافی تھے۔ انھیں بحث ومباحثہ سے بہت شغف تھا جو اچھی جرنلزم میں ہونا چاہیے۔ غالباً 1963 میں 'آئینہ' باتصویر میگزین کا اجرا کیا۔ لیکن وہ بہت جلد بند ہو گیا جیسا کہ عام طور پر ایسے پرچوں کا مقدر ہے۔ مجھے یہ پرچہ بہت اچھا لگا تھا۔ ایک بار

مجھ سے ایلیٹ پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ حالانکہ میں فرمائشی مضامین نہیں لکھتی لیکن میں نے "آئینہ" کے لیے وہ مضمون لکھا۔

وہاج الدین علوی:

کیا آپ بتائیں گی کہ خلاف عادت آپ نے یہ فرمائشی مضمون کیوں لکھا؟

قرۃ العین حیدر:

ہوا یہ تھا کہ سردار جعفری نے اپنے کسی مضمون میں ایلیٹ کو رجعت پسند اور امپریلسٹ بتایا تھا۔ اس سلسلے میں "آئینہ" میں ایک بحث شروع ہوگئی اور انصاری صاحب اس کو ہوا دیتے رہے۔ مرحوم خاصے ظریف الطبع واقع ہوئے تھے۔ جملہ بازی، ضلع جگت ان کی گفتگو کی جان تھی۔ اکثر اس کا استعمال وہ تحریروں میں بھی کرتے تھے گو اس میں وہ اکثر حد اعتدال سے تجاوز کر جاتے تھے۔ یہ ایک ایسی کمزوری ہے جس سے کہ بہ چند ہی ثقہ ادیب اور نقاد بھی (اگر وہ چٹخارے دار زبان لکھتے ہیں) دامن بچا سکے۔ ایک بار انصاری صاحب نے ایک مشہور فلم ایکٹریس کے بارے میں کچھ لکھا تھا۔ مجھے پورا واقعہ یاد نہیں۔ اس میں ایک جملہ یہ بھی تھا کہ موصوفہ کی نانی پر کبھی کوئی بپتا پڑی تھی۔ اس سلسلے میں "آئینہ" میں بہت سے خطوط چھپے اور عصمت آپا نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا تھا۔ "کاش ہماری نانی پر بھی وہ بپتا پڑی ہوتی تو آج ہم بھی عیش کر رہے ہوتے۔" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انصاری صاحب کی طباعی اور ظرافت نے ان کے رسالے کو بہت جان دار بنا دیا تھا۔

وہاج الدین علوی:

انصاری صاحب کے اداریوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

قرۃ العین حیدر:

صحافتی تحریروں کی زندگی بہت کم ہوتی ہے یا تو وہ اس قدر غیر معمولی ہوں کہ لوگوں کو برسوں یاد رہیں لیکن ایک تخلیقی صحافی کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی بیش تر تحریریں نقش بر آب ہوتی ہیں۔ مگر ایک اچھا صحافی اپنی قابلیت اور طرز تحریر دونوں کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ اور یاد رکھا جاتا

ہے۔ ظ۔ انصاری بے حد پڑھے لکھے انسان تھے۔ عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور روسی زبان ان کی فکر کی جولاں گاہیں تھیں۔ تقریباً ہفت زبان تھے۔ وہ بہ یک وقت محقق، نقاد، صحافی اور خطیب تھے۔ فارسی ادب پر گہری نظر تھی۔ ترجمہ کرنے کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے۔ روسی سے ترجمے بھی کیے اور باہے یونیورسٹی میں روسی زبان کے استاد بھی رہے۔ فارسی میں خسرو شناسی ان کی مشہور کتاب ہے۔ ان کا بڑا کارنامہ اردو روسی لغت کی شکل میں موجود ہے۔ ان تمام کارناموں کے باوصف انھیں یہ احساس شدید تھا کہ انھیں وہ Recognition نہیں ملا جو انھیں ملنا چاہیے تھا اور خود میں بھی یہی سمجھتی ہوں۔

وھاج الدین علوی:

Recognition نہ ملنے کا سبب کیا تھا؟

قرۃ العین حیدر:

اصل میں تنقید میں اب socialisation کا زور ہے۔ مثلاً غالبیات، اقبالیات، لسانیات وغیرہ لیکن وہ ہر میدان کے آدمی تھے۔ اسی لیے ان کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی اور اکثر وہ کھلکھنے بھی کہلائے۔ وہ خود مارکسی تھے۔ لیکن ترقی پسندوں نے بھی ان کو وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ مستحق تھے۔

وھاج الدین علوی:

ترقی پسندوں نے باوجود ہم مشرب ہونے کے انھیں کیوں نہیں سراہا؟

قرۃ العین حیدر:

اس کا جواب شاید شخصیتوں کا ٹکراؤ (Personalilty Clash) ہے۔ ہمارے یہاں اس قسم کے ٹکراؤ انشا اور مصحفی کے زمانے سے چلے آرہے ہیں۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ لوگوں کو ناخوش کر دیتے تھے۔ ان میں ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ چونکا دینے والی بات کہہ کر لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانا چاہتے تھے اور یہ کمزوری ہمارے بہت سے نقادوں میں پائی جاتی ہے۔

وہاج الدین علوی:

صحافت اور ادب سے ہٹ کر ظ۔انصاری کی معاشرتی زندگی اور ان کے حلقہ احباب کے بارے میں کچھ بتلائیں۔

قرۃ العین حیدر:

بنیادی طور پر ظ۔انصاری یو پی کے ایک شریف مہذب، میاں بھائی قسم کے انسان تھے۔انصاری صاحب اپنے اوپر چاہے جس قسم کی نظریاتی کیفیت طاری کریں، لیکن اندر سے وہ ایک اردو کلچر کے نمائندہ انسان تھے اور اردو کے بڑے پرستار اور شیدائی تھے۔ان کی ایک بیوی ششی سے میری دوستی تھی۔وہ مہاراشٹرین برہمن روی واں گھریلوں خاتون تھیں۔انصاری صاحب کے لڑکے کی شادی جب مجروح سلطان پوری کی لڑکی سے ہوئی تو وہ اپنے تمام دوستوں کو اورنگ آباد لے گئے۔انصاری صاحب کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ایک طرف ان کی دوستی ملا طاہر سیف الدین داؤدی بوہروں کے رہنما سے تھی تو دوسری طرف ستارہ دیوی اور دوسرے فلمی ستاروں سے ان کی یاد اللہ تھی۔نوشاد صاحب سے بھی ان کی بہت دوستی تھی۔چنانچہ اس تقریب میں ستارہ دیوی بھی گئی تھیں۔وہاں انھوں نے محفل میں اپنے بے مثال فن کا مظاہر بھی کیا۔اسی محفل میں ظ۔انصاری نے اپنے ایک اور دوست جو مولانا اور مبلغ تھے کو مدعو کیا تھا۔لہٰذا اب منظر یہ تھا کہ اندر ہال میں ستارہ ناچ رہی تھیں اور ایسے خلاف شرع حرکت سے پرہیز کرتے ہوئے مولانا رات بھر باہر آسمان کے نیچے ایک دری لپیٹے سویا کیے تا کہ گھنگھروؤں کی آواز بھی ان کے کانوں میں نہ پڑے۔سورت کی پرانی تھیٹر کمپنی کے ایک ایکٹر بھی وہاں موجود تھے جو ظ۔صاحب کے بہت عزیز دوست تھے۔مجھے چونکہ اس طرح کے رنگا رنگ کریکٹرز سے ملاقات میں بہت لطف آتا ہے لہٰذا مجھے وہ تقریب اب تک یاد ہے۔

ظ۔انصاری صحیح معنوں میں دانشور اور بہت اچھے نثر نگار تھے۔وہ اسلامی تاریخ کے اسکالر بھی تھے یعنی ان کی علمیت کثیر الجہت تھی۔یہ بھی یو پی کے پرانے اردو والوں کا ایک وصف تھا۔ماسکو سے جب وہ Ph.D کی ڈگری لے کر لوٹے تو مجھے فون کیا۔میں نے ان سے کہا کہ آپ

روسیوں کی آنکھوں میں بھی دھول جھونک آئے۔ بہت خوش ہوئے۔ قہقہہ لگایا۔ اس کے بعد جب وہ مجھ سے ملے تو انھوں نے کہا کہ فلاں صاحب (جو وزیر باتدبیر اور سنجیدہ اردو والے تھے) جب آپ نے فون پر مجھ سے یہ کہا اور میں نے ان کو یہ بات بتلائی تو موصوف نے بہت افسوس و تعجب ظاہر کیا کہ عینی صاحبہ کو آپ سے ایسی نامناسب بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ صاحب پھر خوب ہنسے اور کہنے لگے دیکھیے لوگوں میں sense of humour ہی نہیں۔

عام طور پر لوگ انصاری صاحب کے بارے میں شاید اس لیے زیادہ سنجیدہ نہیں تھے کیونکہ وہ اپنے سلسلے میں اکثر تھوڑی سی نوٹنکی بھی کرتے تھے۔ خصوصاً جب وہ تقریر کرتے تھے۔ اصل میں وہ انتہائی دراک اور نبض شناس مقرر تھے۔ وہ لوگوں کو بہت ہنسا بھی دیتے تھے اور بہت جھنجھلا بھی سکتے تھے۔ ظ۔ انصاری نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بھی اپنے ایک مضمون سے جھنجھلا دیا۔ جس میں اپنے سابقہ سیاسی نظریات سے برات کا اعلان کیا تھا۔ یہ ظ۔ انصاری کی زندگی کی آخری تہلکہ خیزی تھی۔ مجھے اور ان کے سبھی دوستوں کو ان کی رحلت کو بڑا صدمہ ہے۔ چونکہ ایسے قابل اور پراگندہ طبع لوگ اس نسل کی تمام خوبیوں، کارناموں اور کمزوریوں کے ساتھ تیزی سے عمر طبعی کو پہنچ رہے ہیں اور ایسا ہونا اٹل ہے۔

(ماہنامہ 'آج کل'، نئی دہلی)

ذکر اس پری وش کا...

گفتگو : ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی دہلی نے فروری 1999 میں مرزا غالب کے جشن صد سالہ کی تقریبات میں پاکستان کی نمائندگی کے لیے دعوت نامہ بھجوایا تو مجھے جتنا اشتیاق غالب کی دلّی دیکھنے کا تھا اتنا ہی اشتیاق اردو کی سب سے بڑی ناول نگار اور کہانی کار قرۃ العین حیدر کو دیکھنے اور سننے کا تھا۔ قرۃ العین حیدر نے 'ستاروں سے آگے' (1947ء)، 'شیشے کے گھر' (1956)، 'پت جھڑ کی آواز' (1966) میں شامل افسانے لکھنے کے علاوہ 'آگ کا دریا' (1959)، 'میرے بھی صنم خانے'، 'کار جہاں دراز ہے'، 'آخر شب کے ہم سفر'، 'گردشِ رنگ چمن' اور 'چاندنی بیگم' جیسے شاہکار ناول اور 'سیتا ہرن'، 'ہاؤسنگ سوسائٹی'، 'چائے کے باغ'، 'دلربا' اور 'اگلے جنم مجھے بٹیا نہ کیجو' جیسے عہد ساز ناولٹ لکھ کر اردو دنیا کے دل موہ لیے تھے۔ صرف یہی نہیں ہنری جیمز کے ناول 'ہمیں چراغ ہمیں پروانے' شولوخوف کے ناول 'ڈان بہتا رہا'، اعتماد توف چنگیز کے ناول 'ماں کی کھیتی'، ویرا پانووا کے ناول 'یودوکیہ' شولوخوف کے ناولٹ 'آدمی کا مقدر'، آر فریمن کے ناول 'ڈگو' کے تراجم 'ستمبر کا چاند' (رپورتاژ)، 'کوہ دماوند' اور 'گلگشت' (سفرنامے) بھی ان کی پہچان تھے۔

وہ حد درجہ تنک چڑھی اور بد دماغ مشہور تھیں۔ لیکن انھوں نے جس سطح اور معیار کا کام کیا، یہ سب ان پر سجتا تھا۔ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ (1967)، سوویت نہرو ایوارڈ (1969)، غالب ایوارڈ، اقبال سمان (1987) اور 'گیان پیٹھ ایوارڈ' (90-1989) انھیں ملے تو ان ایوارڈز کی قدر بڑھی۔

میں نے سیمینار کی پہلی ہی شام ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے مدد چاہی، میں نے ان سے کہا ''قرۃ العین حیدر تو آئی نہیں، پر مجھے مطلق ملنا ہے، ان سے۔'' وہ بولے ''وہ ہجوم سے گھبراتی ہیں۔ ملنا ہے تو نوئیڈا جانا پڑے گا، جمنا پار۔ میں فون پر بات کروں گا۔ بلا لیا تو چلے چلیں گے۔'' یوں نارنگ صاحب نے اسی رات فون پر ان سے بات کرتے ہوئے خیریت دریافت کی اور کہا ''مرزا حامد بیگ پاکستان سے آئے ہیں، کیا کسی وقت آپ کی طرف آ جائیں؟'' اس کے جواب میں وہ دیر تک بات کرتی رہیں۔ نارنگ صاحب نے فون بند کرنے سے پہلے صرف اتنا پوچھا ''دوپہر تین بجے گاڑی بھجوادوں؟'' ان کا جواب سن کر انھوں نے فون کا کریڈل رکھ دیا۔ میں کچھ سمجھ نہیں پایا تھا۔ میں نے استفہامیہ نظروں سے نارنگ صاحب کی طرف دیکھا۔ فرمانے لگے: ''کہہ رہی تھیں، وہ تو مہمان ہیں، میں آ جاؤں گی گاڑی بھجوا دیجیے گا۔''

اگلے روز ۷ افروری 1999 کی شام نارنگ صاحب نے اردو اکادمی دہلی کی جانب سے سیمینار کے غیر ملکی مندوبین کے استقبالیہ کا اہتمام کر رکھا تھا۔ میں ستیہ پال آنند، ڈاکٹر عطش مرزا اور دیگر مندوبین کے ہمراہ ساڑھے چار بجے شام جب اردو اکادمی پہنچا تو نارنگ صاحب کہنے لگے: ''ارے اتنی دیر کر دی۔ عینی آپا تو چار بجے ہی پہنچ گئی تھیں وہ باہر لان میں بیٹھی ہیں۔''

میں نارنگ صاحب کے ہمراہ چل دیا۔ وہ ایک درخت کے نیچے کرسی پر بیٹھی تھیں اور ان کے سامنے ایک خالی کرسی دھری تھی۔ نارنگ صاحب نے صرف اتنا کہا: ''آپا، یہ آ گئے'' اور اپنے آفس پلٹ گئے۔

میں نے خالی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے جھک کر ان کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر چوما تو بولیں ''بھئی ایسا نہیں، بیٹھ جایئے۔'' میں نے عرض کیا ''آپ کو پڑھ کر لکھنا سیکھا۔ آپ نے میری عزت افزائی کی، میں شکر گزار ہوں۔'' کہنے لگیں ''آپ کی تنقیدیں پڑھی ہیں۔''

''کیسی لگیں؟'' میں نے استفسار کیا۔ بولیں '' آپ نے یہ جو لکھا ہے کہ میں اپنی تحریروں میں اپنے خاندان کو Glorify کرتی ہوں، پاکستان کے مظفر علی سید بھی یہی کہتے ہیں تو کیا ایسا ہی ہے؟'' وہ مسکرائیں۔ میں نے جانے کیا جواب دیا، کچھ یاد نہیں۔ میں تو بس انھیں تکے جا رہا تھا۔ پھر ان کے پاکستان سے چھپنے والے افسانوں کے جعلی ایڈیشن اور پاکستان میں لکھا جانے والا افسانہ زیرِ بحث آیا۔ جب ہم لان میں سے اٹھ کر نارنگ صاحب کے آفس کی جانب چلے تو کہنے لگیں ''میری ملازمہ بہت اچھا کھانا پکا لیتی ہے لیکن وہ ان دنوں چھٹی پر ہے۔ پھر بھی کل شام آپ میرے ہاں کھانا کھائیں۔ ڈاکٹر صغرا مہدی پکا لیں گی کھانا۔ لیکن زیادہ لوگ نہیں ہوں گے۔'' میں نے کہا ''صغرا مہدی تو مجھ سے ناراض ہیں، شاہد علی خاں صاحب نے بتایا ہے کہ میں اپنی کتاب 'اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ' میں ان کا ذکر کرنا بھول گیا تھا۔'' بولیں ''کوئی بات نہیں، میں کہوں گی تو آ جائیں گی۔ بھلے آپ سے ناراض ہی کیوں نہ ہوں۔''

جب اردو اکادمی، دہلی کی جانب سے مخمور سعیدی صاحب نے انھیں اس استقبالیہ تقریب کی صدارت کرنے کو کہا تو بولیں ''نہیں نہیں۔ میں ابھی واپس جاؤں گی۔'' جس پر نارنگ صاحب بولے'' آپ کو کوئی تقریر تو کرنا نہیں۔ بس اسٹیج پر بیٹھ جایئے گا۔'' کچھ تامل کیا، پھر مان گئیں اور اس تقریب کی صدارت فرمائی۔ اگلے روز ہم لوگوں کا آگرہ جانا طے تھا۔ یہ سوچ کر نکلے کہ شام کو جمنا پار نوئیڈا ابھی پہنچنا ہے لیکن سکندرہ کی سیر نے کافی وقت لے لیا اور جب ہم واپسی پر دِلّی کی حدود میں داخل ہوئے تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ وہاں سے نوئیڈا دو گھنٹے کی مسافت تھی۔ اس کے بعد تین بار دہلی گیا لیکن وہ دو گھنٹے کی مسافت جوں کی توں رہی۔

21 اگست 2007 کی صبح قرۃ العین حیدر کے فن اور شخصیت پر ڈاکٹریٹ کرنے والے ڈاکٹر جمیل اختر کا دہلی سے فون آیا تو کہنے لگے'' قرۃ العین حیدر کی کلیات تین جلدوں میں شائع ہو گئی۔ اب دہلی آئیں تو ساتھ لیتے جایئے گا۔'' میں نے خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن ہم دونوں کو کہاں معلوم تھا کہ قرۃ العین حیدر اس وقت نوئیڈا کے کیلاش ہسپتال میں آخری سانس لے رہی ہیں۔

اس کی باتوں میں غضب کی خوشبو ہے

گفتگو : مشتاق احمد شیدا

1. قرۃ العین حیدر (1988)

اکیڈمی سے باہر نکلے تو مجھے قرۃ العین کی ڈھنڈیا پھر سے پڑ گئی۔ ایک دکان سے ٹیلی فون ڈائرکٹری اٹھائی اور انگریزی حرف کیو کی تختی پر انتہائی انہماک کے ساتھ اوپر سے نیچے انگشت شہادت چلانے لگا۔ ہندو ناموں کی بھرمار کے سب قاف والے کیو کے نام ویسے بھی تھوڑے تھے دوسرے نصیب اچھا نکلا۔ نام اور نمبر ملتے ہی ڈائل گھمایا۔ دوسرے سرے پر کوئی ملازم بولا کہ گھر یہی ہے مگر مس حیدر دو بجے سے پہلے نہیں آئیں گی۔ غریب الدیار سمجھ کر اس نے تین بجے کی ملاقات طے کر دی۔ گڈ گاڈ! یہ اچانک ہو گیا؟

قرۃ العین حیدر۔ اپارٹمنٹ نمبر ے، سیکنڈ فلور، ذاکر ناور، اوکھلا روڈ، دہلی۔ ایک اعلیٰ ہوٹل کے مقابل آٹھ منزلہ ذاکر ناور۔

عہد حاضر کی عظیم ناول نگار کا مسکن۔ اپنی تصویر کی طرح خوب صورت تحریر کی قلم کار جسے تیس سال پہلے حلقہ ارباب ذوق لاہور کے ایک اجلاس میں دیکھا تھا آج ایک تہائی صدی کے

بعد اس سے ملنا مجھ جیسے کم نام بے نشاں شخص کے لیے زندگی کا اہم ترین واقعہ تھا۔

ٹاور کے احاطہ میں داخل ہوا تو ریاض انور کی وارننگ یاد آئی۔ ''اس خاتون کے پاس کوئی شخص دس پندرہ منٹ سے زیادہ بیٹھنے کی تاب نہیں لاسکتا۔ فرخ درانی کی روایت اور بھی اعصاب شکن تھی جس کے مطابق ایک ادبی تقریب میں جب مرحوم اختر انصاری اکبرآبادی نے قرۃ العین حیدر کے قریب بیٹھنے کی کوشش کی تو انھوں نے انگریزی میں یہ کہہ کر اسے اٹھا دیا تھا:

''تم اتنے بدصورت ہو کہ میرے قریب بیٹھنے کے لائق نہیں۔''

ایک دوسرے سے پیوستہ اپارٹمنٹس کے بار بار گھومنے والے زینے اور موڑ کاٹ کر میں نے سات نمبر کی کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ (خدایا! مجھے سب طرح کی استقامت بخشنا) میں نے دعا کی۔

ملازم نے دروازہ کھولا۔ '' آپ ہی پاکستان سے آئے ہیں؟ فون آپ نے کیا تھا؟'' اس نے تصدیق چاہی۔ میں نے اقرار کیا تو وہ مجھے جگہ دینے کے لیے دروازے سے ایک طرف ہٹا اور اندر آنے کا کہا۔

یورپی طرز آرائش کی یہ نشست گاہ مس حیدر کے افسانوی ماحول سے مختلف نہ تھی۔ داخل ہوتے ہی دائیں طرف امریکن کچن تھا، سامنے طعام گاہ کی میز کرسیاں جن کے اطراف میں بیڈ روموں کے دروازے کھلتے تھے۔ لیونگ روم کی کچن سے ملحقہ دیوار کے ساتھ کتابوں کا ایک بڑا شیلف۔ سامنے طعام گاہ کا راستہ جس کی پارٹیشن وال کے ساتھ پھر کتابوں کی الماریاں، آگے سلائیڈنگ شیشے کا ایک وسیع دریچہ جس میں ان کا کوئی نہ کوئی نسوانی کردار اکثر کود کر بیٹھتا ہے، فی الحال اس میں گملے دھرے تھے۔ میرے بائیں جانب دیوار کے ساتھ ایک بار پر کتابوں کا چار منزلہ ریک، پرانی خاندانی تصویروں کے علاوہ کچھ گروپ فوٹو، فنی اہمیت کی فریم شدہ تصاویر، گل دان، مجسمے اور پینٹنگ کے برش اور وہ سب کچھ جو قرۃ العین حیدر کی کہانیوں میں ہوتا ہے۔

انتظار زیادہ نہ تھا۔ مس حیدر تشریف لائیں اور میرے روبرو کافی فاصلے پر رکھے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ لبوں پر لپ اسٹک کا ہلکا سا شیڈ بہت اچھا لگا اور اس سے زیادہ ان کا فاصلہ۔ میں نے

گفتگو کا آغاز ان کے اتا پتا معلوم کرنے کی تگ و دو کے بیان سے کیا، جسے وہ مسکرا مسکرا کر سنتی رہیں۔ آغاز بہتر رہا تو میں نے بلا تکلف ان کی اس ہیبت کا ذکر کیا جو ان کی قد آور ادبی شخصیت کے سبب مجھ پر طاری تھا۔ اس کی انھوں نے تردید نہیں کی (اور کیوں کریں۔)

رام سنگھ نے چائے اور دال بھجیا کی پلیٹ میرے آگے رکھ دی۔ وہ سوال جو میرے ذہن میں مس حیدر کے لیے تھے ابھی ترتیب ہی دے رہا تھا کہ انھوں نے پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ پر بات چھیڑ دی۔ ان کے خیال میں اس طرح اسلام کی صحیح صورت نکھرنے کی بجائے مزید دھندلا گئی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کراچی کی کسی عورت کو سنگ ساری کی سزا کا حوالہ دے کر کہا کہ اسلام میں ایسی سزا کہاں ہے؟ میں نے اس بارے میں حدود اللہ میں انسانی ترمیم کی گنجائش نہ ہونے اور سزاؤں کی قرآنی و شرعی تفسیروں پر وفاقی شرعی عدالت اور مختلف علما کی وقتاً فوقتاً بحث و تمحیص کا مختصر تذکرہ کرتے ہوئے تشفی کرنے کی کوشش کی، جسے انھوں نے بڑی توجہ کے ساتھ سنا۔ پھر انھوں نے پاکستان میں عورتوں کے حقوق اور سماجی مساوات کا پوچھا تو میں نے کہا، آئینی اور سماجی طور پر ہمارے ہاں انھیں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ اسمبلی کی ممبر ہیں، وزیر ہیں، اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ تاہم مسلمان ہونے کے ناطے زیادہ تر عورتیں پردے کی پابندی کے سبب معاشرے میں اتنی فعال نظر نہیں آتیں، جتنی آپ توقع کرتی ہیں اور یوں بظاہر مرد کی دست نگر نظر آتی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ٹھیک ہے انھیں زیادہ ایکسپوز نہیں ہونا چاہیے۔

"کیوں ٹھیک ہے؟ آپ کی نظر میں عورت کس لحاظ سے کم تر ہے...؟" لہجے میں احتجاج تھا۔

"دیکھیے! مس حیدر میں آپ کو تو استثنا میں رکھتا ہوں۔"

"کیوں استثنا میں رکھتے ہیں؟"

"وہ اس طرح کہ آپ نے جس فیلڈ کو اپنایا اس میں کمال تک پہنچیں۔ کوئی مرد بھی اس سے زیادہ باکمال تو نہ ہو سکتا تھا۔ شاید اس رائے میں میری آپ سے عقیدت بھی شامل ہو مگر یہ میری ہی نہیں سبھی کی رائے ہے۔

باقی آپ صنفی اور خلقی لحاظ سے یہ ہر حال مرد سے کمزور تر اور اس کی حفاظت کی متقضی ہیں۔ اگر ضد نہ کریں تو یہ بات ہے بھی ٹھیک۔ دیکھیے نا! جو حفاظت کا حصار دے گا برتر تو نظر آئے گا ہی۔ ادھر انسانی تاریخ میں بھی عورت ویسی ہی نظر آرہی ہے جیسے میں کہہ رہا ہوں۔

رہا یہ کہ میرے نزدیک مرد کے مقابلے میں عورت کا مقام کیا ہے، تو میں ذاتی طور پر اسے مرد کا سب سروی انٹ (Subservient) سمجھتا ہوں۔ ہو سکتا ہے میرا خیال غلط ہو۔ میرے نزدیک اس کرۂ ارض کی انسانی دنیا میل اور ینئڈ ہے اور یہ مردانہ تسلط شاید منشائے الٰہی بھی ہے کہ صنفی اعتبار سے عورت اس تسلط کی نہ صرف خواہاں ہے بلکہ ضرورت مند بھی ہے۔ جب میں یہ کہتا ہوں تو اس میں عورت کی تحقیر مقصود نہیں۔

آپ میرے اس فلسفہ سے یہ ہرگز نہ سمجھیں کہ عورت کو جو رول میں دے رہا ہوں اس میں وہ کسی طرح سے ہیچ ہے۔ قطعاً نہیں بلکہ وہ ہر روپ میں ایک مکمل ہستی ہے۔ کبھی ماں بن کر، کبھی بہن، کبھی محبوبہ اور کبھی بیوی۔ یہ رول عورت کے سوا کوئی دوسرا ادا ہی نہیں کر سکتا بلکہ ایک طرح مرد کی بالیدگی عورت ہی کی مرہون ہے۔ دونوں کی تخلیق خدا نے کی اور خدا کی تخلیق ناقص نہیں مکمل ہوتی ہے اور مکمل وہ ہے جو اپنی غایت اور مقصد کے مطابق ویسا ہو جیسا اسے ہونا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں یہی وہ احسن تقویم ہے جس کے تحت انسان خلق ہوا۔ مرد بھی اور عورت بھی۔"

میرا خیال تھا مس حیدر مجھ سے کچھ حد تک متفق ہوں گی مگر انھوں نے یہ کہہ کر سب کچھ مسترد کر دیا کہ "آپ عورت کے بارے میں اپنے خیالات بدلیں۔" سند کے طور پر کچھ حدیثوں کے حوالے دیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازدواج مطہرات سے اکثر امور میں مشورہ کیا کرتے تھے۔ میں نے کہنا تو چاہا مگر تکلفانہ کہہ سکا کہ حضور کا مشورہ لینا تسلیم مگر یہ واضح نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان مشوروں پر عمل بھی کیا کرتے تھے یا محض خوش نودیٔ ازدواج مقصود تھی۔

پاکستان میں خواتین شعرا کا پوچھا تو میں نے کہا "صرف ڈیڑھ شاعرہ ہیں۔ چلیے پونے دو۔"

پوچھنے پر میں نے ان کے نام بتائے۔ افسانہ نگار خواتین کے بارے میں استفسار پر میں نے کہا ڈھیر ساری ہیں، کچھ پیسے کے زور پر اور کچھ پی آر شپ کے سہارے افسانہ نگار بھی ہیں اور کالم نگار بھی، جنھیں میں افسانہ نگار سمجھتا تھا ان کے صرف تین نام بتائے۔ ناول نگاری میں دو نام۔

باتوں باتوں میں 'شہاب نامہ' کا ذکر آیا تو کہنے لگیں لندن میں ایک نظر دیکھا تھا میرے بارے میں شہاب صاحب نے جو لکھا ہے وہ قطعاً غلط ہے۔ جو گفتگو انھوں نے مجھ سے منسوب کی ہے میں ایسی زبان استعمال نہیں کرتی۔

جوش مرحوم کی پاکستان میں ان کی شایان شان پذیرائی نہ ہونے اور ریڈیو ٹی وی پر ممنوع رکھنے پر انھیں افسوس تھا میں نے کہا، ایسا بھی نہیں۔ ریڈیو نے ان کی وفات کی خبر دی اور ٹی وی نے جنازے کی جو پندرہ سیکنڈ کی تصویر کاسٹ کی وہ میں نے خود دیکھی دس بارہ آدمی جنازے کے پیچھے چلتے دکھائے گئے تھے اور کیا...؟

میرے اس سوال پر کہ آپ نے پاکستان سے مراجعت کیوں کی حالانکہ آپ کی پذیرائی تو شایان شان تھی، انھوں نے الٹا مجھ سے پوچھا کہ آپ امریکہ سے دو مرتبہ کیوں چلے آئے۔

میں نے کہا دل نہیں لگا۔ وطن شدت سے یاد آتا تھا۔ کہنے لگیں "تو پھر ہندوستان میرا وطن تھا۔ کیا مجھے یاد نہ آتا۔"

اب پانچ بجنے کو تھے میں نے اپنے دوست زوار حسین کی مصور شاعری 'شاخ دریاتہ دل' کی ایک جلد مس حیدر کو پیش کی۔ ساتھ ہی زوار پر لکھا ہوا اپنا خاکہ گوتم نیلمبر یہ کہہ کر پیش کیا کہ آپ نے گوتم کو 'آگ کا دریا' میں جس مقام پر چھوڑ دیا تھا اس سے آگے وہ کہاں گیا اور اب کہاں ہے وہ اس خاکے میں دیکھیے اور پاکستان آکر اپنا ناول مکمل کرلیں۔

رخصت سے پہلے میں نے انھیں تصویر بنوانے کے لیے کہا، جو از راہ کرم انھوں نے مان لیا۔ میں نے بک شیلف کے پس منظر میں کیمرہ فوکس کیا اور ساتھ کھڑا ہوا تو کہنے لگیں "تصویر کھینچے گا کون؟"

میں نے کہا "رام سنگھ، اسے سمجھا دیتا ہوں صرف شٹر دبانا ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لیے آمادہ ہوئیں پھر شستہ انگریزی میں انکار کر دیا، جس کا ترجمہ یہ تھا کہ میں نہیں چاہتی میرا ملازم میری تصویر کھینچے۔

پھر ساتھ والے فلیٹ سے ایک صاحب کو بلا کر لائیں اور یوں دو تصویریں بنائی گئیں۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ باہر آیا تو شام ہو چکی تھی۔

2. امریکہ کی ایک شام...قرۃ العین حیدر کے نام (1992)

گزرے صدیوں کے خوابیدہ زمانوں اور گزرتے وقت کے سرکش لمحوں پر یکساں دسترس رکھنے والی قرۃ العین حیدر جہاں سے گزرتی ہیں، تیموری جلال و جمال ان کے ہم رکاب ہوتا ہے۔ ٦ جون کی شام اسی سلطانی تمکنت کے ساتھ وہ مسز عطیہ خان کے ہاں میری لینڈ امریکہ میں خیمہ زن تھیں۔ وائس آف امریکہ کے اظہار کاظمی کا دیا ہوا فون نمبر لایا تو مسز خان کے ہاں ڈاکٹر طارق نے یوں رہنمائی کی۔

''495- نیو یارک بالٹی مور بیلٹ وے لے کر کولمبیا کی طرف جانے والی 29- نارتھ کی شاہراہ پر اتر جائیں۔ چلتے چلتے جب ٣٢- ویسٹ کا سائن نظر آئے تو اس پر ہولیں۔ پہلی ٹریفک لائٹ پر دائیں طرف سینڈر لین پر مڑ جائیں۔ جہاں سڑک ختم ہو جائے۔ وہاں بائیں ہاتھ ہار بر فارم کا راستہ شروع ہوتا ہے اس پر سیدھے چلتے ہوئے جہاں ٹریفک لائٹ آئے اسے عبور کرنے کے بعد جو پہلا بایاں موڑ آئے اس پر مڑ جائیں۔ یہ ماسٹرز رن اسٹریٹ کہلاتی ہے۔ اس پر سیدھے جائیں اور پہلا دایاں موڑ مڑ کر لانگ جمپ ٹریل کی سڑک پر آجائیں۔ یہ سڑک بل کھاتی گزرتی ہے اور اس پر دائیں طرف ساتواں گھر مسز عطیہ خان کا ہے۔ یہیں مس حیدر کے ساتھ سات بجے شام نشست ہے۔''

راستے کے نوٹس لے کر میں نے خاصا لمبا سانس چھوڑتے ہوئے پنسل ایک طرف پھینکی اور راستے کی تفصیل بیٹے کو تھما دی کہ امریکہ کے بھول بھلیاں راستوں کی آنکھ مچولی اسے خوب آتی ہے۔ ایک نظر دیکھنے کے بعد وہ بولا ''نو پرابلم پہنچ جائیں گے۔''

''پسرِ عزیز! پھر بھی ہمیں آدھے پونے گھنٹے کی گنجائش راستہ بھولنے کے لیے رکھنی چاہیے۔''میں نے سابقہ تجربوں کی بنا پر نصیحت کی اور کیمرہ لوڈ کرنے لگا۔

بیٹے نے پھر یقین دلایا''نو پرابلم! میں ان راستوں پر بھولتے بھولتے ماہر ہو چکا ہوں آپ کو سات بجے پہنچنا ہے پہنچادوں گا۔''

بیلٹ وے کی ٹریفک کے ریلے میں اترے تو میں نے بیٹے سے کہا''ننھے آج کا دن یاد رکھنا۔تم قرۃ العین حیدر کو دیکھنے والے ہو۔''وہ مجھے عقیدت میں شرابور دیکھ کر مسکرایا اور گاڑی ٹاپ گیئر میں ڈال دی۔

بیلٹ وے چھوڑ کر دائیں بائیں کے بے شمار موڑ اور ٹریفک لائنس کی بھرمار کے سبب ہم حسبِ معمول راستہ بھول گئے۔یہاں ہائی وے پر راستہ بھول کر گویا آپ تیز پانی کے بہاؤ میں پاؤں اکھڑ جانے کی کیفیت میں ہوتے ہیں۔تیروں کی طرح گزرتی کاروں کا ہجوم نہ کہیں رکنے دیتا ہے نہ ٹھہر کر راستہ پوچھنے کی مہلت۔بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہتے رہو اور پندرہ بیس میل بعد کسی شاپنگ مال یا گیس اسٹیشن پر رک کر منزلِ مقصود کے بارے میں لکھی چٹ پڑھ کر سناؤ اور مزید پندرہ بیس میل کا چکر کاٹ کر صحیح راستے پر آؤ۔

شام کا اندھیرا اترنے لگا تو ہم راستوں کے سانپ اور سیڑھی کا کھیل کھیلتے ساڑھے آٹھ بجے کے قریب واشنگٹن کی نواحی ریاست میری لینڈ کے ایلی کاٹ سٹی پہنچ گئے اور لانگ جمپ ٹریل کی ڈھلان اتر گئے۔کروڑپتیوں کا یہ علاقہ وسیع وعریض اونچے نیچے گھاس کے میدانوں پر ایک دوسرے سے ہٹ کر بنے عالی شان مکانوں پر مشتمل ہے۔ہر مکان تک اپنی ڈرائیو وے ہے جو سڑک پر لگی نام کی تختی اور کوکوکلاک سے مشابہ لیٹر بکس سے شروع ہو کر مکان کی سیڑھیوں پر ختم ہوتی ہے۔ساتویں مکان کے قریب کاروں کا غیر معمولی ہجوم دیکھ کر اندازہ ہوا کہ منزل یہی ہے۔

ڈرائیو وے کی سیڑھیوں پر دو امریکی کریو کٹ ہیئر اسٹائل کے لڑکے مہمانوں کی کاروں کی چابیاں ٹوکن دے کر لے رہے تھے۔بتایا گیا کہ واپسی پر وہ گاڑی خود ہی سیڑھیوں تک لے آئیں گے۔یہ وی آئی پی پذیرائی خاصی مرعوب کن تھی۔عمارت کا بلند دروازہ ہال وے میں کھلتا

تھا جہاں مہمانوں کی ٹولیاں ہاتھوں میں پلیٹیں اور نیپکن تھامے ڈنر لے رہی تھیں۔ بھارت اور پاکستان کے مقامی دانشور، ادیب، شاعر، ہارورڈ یونیورسٹی کے ڈاکٹر فیروز اور وائس آف امریکہ کے اظہار کاظمی کے علاوہ ورجینیا اور واشنگٹن سے آنے والے امریکی خوش حالی سے نہال لوگ روایتی ہائی بروائی کیٹ کے ساتھ سرگوشیوں اور ہلکے قہقہوں کے درمیان اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ ان سب سے بے نیاز چند معمر حضرات لکھنوی پوشاک اور علی گڑھ شیروانی پاجامہ پہنے ڈزنیل کی کرسیوں پر فروکش تھے۔ ایک حبشی خادمہ ایپرن پہنے مہمانوں کو کھانا لینے میں مدد دے رہی تھی۔ ماحول پر خاصا افسانوی موڈ طاری تھا۔

بلندی پر واقع اس خواب ناک عمارت کے اردگرد طوفانی ہواؤں سے ڈولتے ناریل کے درخت ہوتے، سامنے نیلا سمندر ہوتا مہمانوں کو پیپسی اور کوک پیش کرنے والی بلیک ویٹرس زوناش ہوتی اور مس حیدر دریچے میں کالی سے لپٹی سیاہ بلی کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ڈاکٹر نگار سے ادھیڑ عمر میں وجع المفاصل سے بچاؤ کی طبی تدابیر پر لیکچر سن رہی ہوتیں تو بلاشبہ یہی لگتا ہم جنوبی ہندوستان کے مالابار ساحل پر مسز حجاب امتیاز کے ہاں مدعو ہیں۔

ہال وے کا ایک محرابی دروازہ ملحقہ وسیع کمرے میں کھلتا تھا، جہاں مہمان خواتین کے درمیان مس حیدر سرخ اور سبز چولی ساڑھی پہنے مختصر مسکراہٹ یا سر کی ہلکی سی جنبش سے باتوں کے جواب دے رہی تھیں۔ ایک بار وہ ہماری طرف بھی آئیں اور اپنے جاننے والوں سے باتیں کرنے لگیں۔ اپنے وقت کی حسین ترین اور اردو ادب کی عظیم ترین ادیبہ کافی معمر لگ رہی تھیں۔ چار سال قبل دہلی میں ان سے گھر ملنے گیا تھا تو باوجود عمر رسیدہ ہونے کے خاصی چاق و چوبند تھیں اور چہرے پر اس تصویر کے نشان باقی تھے جو پچاس کی دہائی کے ادبی رسالوں میں چھپا کرتی تھی۔ ان کی تصویر اور تحریر کے سحر میں گرفتار 1975 کی ایک گرم سہ پہر کو محض ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے میں لاہور کے حلقہ اربابِ ذوق میں سائیکل پر ہانپتا کانپتا پہنچا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ حلقے کی اس میٹنگ میں منیر نیازی بھی موجود تھے جو قرۃ العین حیدر کی موجودگی کے سبب کچھ زیادہ ہی ایکسائیٹڈ تھے۔ 35 سال کے اس فاصلے نے اس چہرے کو جس طرح دھندلایا اسے دیکھ کر دکھ

ہوا۔ بڑھاپا جوانی کی رعنائیاں یوں نوچ لے گا، یہ سوچ کر مجھے خوف آنے لگا کہ میں خود اسی منزل کا مسافر ہوں۔

ڈنر ختم ہونے پر لوگ ایک ایک کر کے بیس منٹ کا زینہ اترنے لگے۔ معلوم ہوا نشست کا انتظام نیچے ہے۔ یہ ایک نیچی چھت کا کشادہ کمرہ تھا جہاں سفید چادریں بچھا کر فرشی نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سامنے دیوار پر سندھی نمونے کی شیشہ کڑھائی کا پردہ لگا کر آگے تخت پوش کا اسٹیج تھا۔ تعارفی کلمات کے بعد مس حیدر کو تخت نشین کیا گیا۔ اظہار کاظمی نے وائس آف امریکہ کا مائیکروفون سامنے رکھا۔ ایک کونے سے مووی کیمرہ آن ہوا۔ فلیش لائٹوں کی مسلسل چکاچوند میں تصویریں اتریں اور اس دوران مس حیدر اپنے پسندیدہ انداز میں ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ فولڈ کیے بیٹھی رہیں۔

پروگرام کا آغاز ایک خاتون کے افسانے سے ہوا جس میں لکھنوی ماحول کی ایک لندن پلٹ بوا کا کردار پیش کیا گیا تھا۔ اس کے بعد مس حیدر نے اپنے ناول 'آگ کا دریا' سے کچھ اقتباس پڑھے۔ یہ وہ حصہ تھا جہاں لڑکیاں کسی دوسرے شہر امتحان دینے جاتی ہیں اور اسٹیج ڈراما ہوتا ہے۔ مس حیدر نے انکشاف کیا کہ ڈرامے کا ایک کردار اس وقت ان کے بائیں طرف موجود ہے۔ شری متی گیان کشیپ، جو ڈرامے میں ستار لے کر گھومتی ہیں۔ دوسرا کردار طلعت خود قرۃ العین حیدر تھیں۔ اپنی بیشتر کہانیوں اور ناولوں کے کردار مس حیدر عموماً آئی ٹی کالج، لکھنؤ کی کلاس فیلوز سہیلیوں یا واقف خاندانوں سے لے کر فینٹسی اور حقیقت میں بڑی چابک دستی سے مکس اپ کر کے پیش کیا کرتی ہیں۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ گرد و پیش کی کوئی انجانی ہستی سامنے آئی اور کسی کہانی یا ناول کا ابتدائی محرک بن گئی۔ جیسے ان کے ناول 'گردشِ رنگ چمن' میں ایک عیسائی خاندان کی دو لڑکیاں بقول مس حیدر اس ناول کا ٹیک آف پوائنٹ بن گئیں۔

اب سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ لوگ کچھ دیر چپ رہے پھر آہستہ آہستہ ہاتھ کھڑے ہونے لگے۔ مس حیدر انگلی سے جس ہاتھ کی طرف اشارہ کرتیں وہ سوال پوچھتا۔ ہندوستان میں ادیبوں کیلئے سنسر سے آزادی، اردو ادب میں نئے لکھنے والوں کی اطمینان بخش رفتار،

ہند بنگلہ اور ملیالم زبانوں میں دلت لٹریچر کی توانا آمد (یہ ادب ہندستان میں نچلی ذات کے لوگوں کے معاشرتی مسائل کی عکاسی کرتا ہے۔) اور روس کی حالیہ شکست وریخت کے حوالے سے ترقی پسند ادیبوں کا رویہ خاص طور پر زیر بحث آئے۔ اسی ضمن میں روس کے سیاسی اور معاشی زوال کے پیش نظر مس حیدر نے یہ کہہ کر سب کو چونکا دیا کہ آج اگر فیض زندہ ہوتے تو کیا لکھتے۔

سوال و جواب کے اس سیشن میں ان کے ناول 'گردشِ رنگ چمن' کے اس حصے پر جہاں علامہ اقبال کا افغان شہزادہ کے نام سے فلمی کہانی لکھنا اور مولانا ابوالکلام آزاد کا مکالے لکھنا بیان کیا گیا تھا ایک صاحب یوں معترض ہوئے کہ اس انکشاف پر پاکستان والوں نے خاصا احتجاج کیا تھا کیونکہ وہاں اقبال کو نہایت عقیدت سے دیکھا جاتا ہے اور ایسی لغویات سے مبرا سمجھا جاتا ہے۔ مس حیدر نے اپنی تحقیق پر ثابت قدم رہتے ہوئے جوابا کہا کہ یہ دریافت تاریخ کا حصہ ہے اور اس سے تو فلم کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ (خود قرۃ العین حیدر نے بمبئی میں بننے والی فلم 'ایک مسافر ایک حسینہ' کے مکالمے لکھے ہیں۔)

سوال و جواب کا سلسلہ ختم ہوا تو میزبان کی طرف سے موسیقی کے آئیٹم کا اعلان ہوا۔ درمیانی عمر کی ایک خاتون اسٹیج پر مس حیدر کے پہلو میں آ بیٹھیں تو بتایا گیا کہ ناول 'آگ کا دریا' میں ستار والی لڑکی یہی مس بھٹناگر تھیں۔ اصل نام گیان کشیپ۔ عرصے سے امریکہ میں مقیم ہیں۔ پکا راگ گاتی ہیں اور وائٹ ہاؤس کی صدارتی محفلوں میں صدر کینیڈی اور جانسن کے سامنے گا چکی ہیں۔ بلا جھجکے انھوں نے کھنکار کر الاپ شروع کیا۔ پھر اسے یہ کہہ کر بدل دیا کہ اس وقت تو جے جے ونتی کا موڈ ہے۔ تھوڑی دیر بعد الاپ ایک دھن میں بدلا تو انھوں نے میرا بائی کا مشہور بھجن 'اے ری میں تو کرشن دیوانی میرا درد نہ جانے کو' شروع کیا۔ آواز واجبی اور انداز متاثر کن نہ پا کر سامعین پہلو بدلنے لگے۔ اسٹیج کے ایک طرف خواتین کے حلقے میں ایک صاحبہ منہ پر ہاتھ رکھے بار بار بہ مشکل ہنسی روک رہی تھیں۔ چونکہ تعارف زبردست ہو چکا تھا اس لیے لوگ بےزاری کے باوجود دم سادھے بیٹھے تھے۔ البتہ قرۃ العین حیدر آنکھیں بند کیے اپنی گوئیاں کی دلجوئی کے لیے گھٹنے پر رکھا ہاتھ دھن کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ لہرا رہی تھیں۔ بھجن جب 'گھائل کی گت گھائل

جانے' کے قدرے اونچے سروں میں پہنچا تو گیان کشیپ صاحبہ کا سانس ساتھ چھوڑنے لگا اور انھوں نے اختتامیہ مسکراہٹ کے ساتھ آخری بند کہتے ہوئے گویا بھجن مکمل کر دیا۔ موصوفہ جب تک نغمہ سرائی کرتی رہیں مجھے روشن کی کمپوزیشن میں فلم 'نو بہار' میں معمولی تصرف کے ساتھ لتا منگیشکر کا گایا ہوا یہی بھجن 'اے ری میں تو پریم دیوانی میرا درد نہ جانے کوئی' بار بار یاد آیا۔ مجھے یقین ہے شری متی گیان کشیپ نے بھی لتا کا یہ ریکارڈ ضرور سنا ہوگا۔ کاش وہ لتا پر ہی اعتبار کر لیتیں۔

اسی دوران حاضرین میں ایک انگریزی ناول The Natuch Girl (رقاصہ) دس ڈالر فی جلد کے حساب سے بکنے لگا۔ معلوم ہوا کہ مشہور افسانہ نگار الطاف فاطمہ کے اجداد میں سے حسن شاہ نامی ایک شخص نے قریباً دو سو سال قبل ایک ناول لکھا تھا جس کا فارسی میں ترجمہ بھی ہوا۔ قرۃ العین حیدر نے علی گڑھ یونیورسٹی لائبریری میں یہ نسخہ ڈھونڈ نکالا اور اسے اردو کا پہلا ناول تصور کرتے ہوئے انگریزی میں ترجمہ کر دیا۔ آٹوگراف کے ساتھ بہت سے نسخے بکے۔ میرے قریب ایک صاحب دیر سے 'آگ کا دریا' کی ایک جلد بغل میں دبائے بیٹھے تھے۔ اٹھے اور اس پر عینی آپا کے دستخط کرالائے۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے مگر مداحوں کا ہجوم ہنوز قرۃ العین حیدر کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ خواتین کی زد سے بچتے بچاتے میں بھی قریب آیا اور کئی سال پہلے دہلی میں ان کے اپارٹمنٹ میں ہونے والی ملاقات کے حوالے سے اپنا سفرنامہ A Passage to India پیش کیا۔ اپنے بارے میں ایک باب اور تصویر دیکھ کر بولیں ''میں اسے پڑھ چکی ہوں۔'' میں نے کہا وہ مختصر چھپا تھا۔ نوشاد، راج کپور، قلعہ آگرہ، مدھوبن اور بمبئی کے بارے میں میری یادیں صرف سفرنامہ ہی میں ہیں۔ آپ کا اسے پڑھنا میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ انھوں نے سفرنامہ کی کاپی لے لی اور میرے بیٹے نے اس لمحے کو کیمرے میں محفوظ کر لیا۔ میری اس خواہش پر کہ سال کے آخر میں شاید میں انڈیا جاؤں، کیا آپ دہلی میں موجود ہوں گی۔ انھوں نے کمال شفقت سے اپنا فون نمبر دے کر کہا کہ پہلے کال کر کے معلوم کر لیں۔ یادگار کے طور پر میں نے سفرنامہ کی کاپی پر قرۃ العین حیدر سے ملاقات کے باب میں ان کی

تصویر کے نیچے آٹوگراف لے لیے۔

واپسی پر حسب عادت مجھے بے ثباتی کی غنودگی نے گھیر لیا۔ میں سوچنے لگا کہ خوشیوں کے لمحے کتنی تیزی سے گزر کر ماضی کے اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں۔ ہماری یہ محفلیں بس کچھ دیر کی جھلک کے بعد محض یادیں بن جاتی ہیں اور ہم کہ ان محفلوں کے بڑے طرم خان کردار تھے ان یادوں کے ساتھ ہی ماضی کے اسٹاک روم میں آئندہ زمانوں کے لیے صرف ایک حوالے کے سوا کچھ نہیں ہوتے اور یہ حوالہ بھی کتنا ناپائیدار کہ آنے والے لوگوں کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ جس آسمان کے نیچے ان کی چھوٹی چھوٹی دنیاؤں کا شور برپا ہے وہاں کبھی اسی طرح کی مختلف دنیاؤں میں پہلے چلے جانے والوں کی دھڑکنیں خاموش ہو چکی ہیں۔

3. فرام انڈیا ود لو (1997)

13 مئی 1997، 7 بجے شام

حاجی گیسٹ ہاؤس، گلی قاسم جان، کوچہ بلی ماران، دریا گنج، دہلی

ایٹ، فائیو، تھری، سیون، تھری، فور، زیرو

ہلو... دِس از ایٹ فائیو تھری سیون تھری فور زیرو؟

یس!

یہ قرۃ العین حیدر صاحبہ کی ریزیڈنس ہے؟

جی!

کون صاحب؟

رام سنگھ۔

ہو! رام سنگھ! میں مشتاق شیدا ہوں۔ پاکستان سے آیا ہوں۔

جی!

پہچانا؟

جی... نہیں۔

بھئی! وہ دو سال پہلے تم مجھے رات کے وقت موٹر پر دریا گنج چھوڑنے آئے تھے، حاجی گیسٹ ہاؤس میں۔ یاد آیا؟

جی جی! بالکل یاد ہے۔ جناب! ادھر دہلی سے بول رہے ہو؟

ہاں۔

محترمہ ہیں؟

جی ہیں... بلاتا ہوں۔

ھلو... ھلو... یعنی آپا بول رہی ہیں؟

جی ہاں۔

آپا میں مشتاق شیدا ہوں ملتان سے۔

کہاں سے بول رہے ہیں؟

دہلی سے۔

کب آئے؟

جی آج ہی پہنچا ہوں۔

مگر آپ تو ادھر کہیں امریکہ میں تھے۔

جی وہاں سے تو کئی سال ہوئے لوٹ آیا ہوں۔

میری لینڈ میں تھے نا آپ؟... وہ آپ نے کچھ لکھا بھی تھا....

جی میں ورجینیا میں تھا۔ میری لینڈ تو آپ کی تقریب میں گیا تھا۔ اسی کی رپورتاژ لکھی تھی۔

مگر وہ آپ نے کیا لکھ دیا تھا کہ میں کیسی لگ رہی ہوں؟

جی آپ... وہ میں آ کر وضاحت کروں گا۔

اور وہ اسکرپٹ میں آپ نے جوزف تھامپسن کا کیریکٹر کیسے ڈال دیا؟

آپا! اس کی وضاحت میں روبرو کروں گا۔

اچھا! اس کے بارے میں کسی سے بات کی؟

کیسے کرتا؟ اس کا اجازت نامہ تو آپ نے ڈولی جینا کو دے رکھا ہے۔ کیا بنا اس کا؟

پتہ نہیں؟ اس نے بعد میں کوئی رابطہ ہی نہیں کیا۔

تو پھر مجھے اجازت دیجیے۔ مجھے بمبئی بھی جانا ہے۔ وہاں کسی معقول آدمی سے بات کروں گا۔

کب بمبئی جار ہے ہو؟

بس دو چار روز میں۔ وہاں ملتان کے ایک معروف فلم رائٹر ہیں مسٹر سورج سنیم۔ ان کے پاس ٹھہروں گا اور ان ہی کے ذریعے کسی سے بات کروں گا۔

''ڈولی کا بھی پتہ کرنا۔''

''جی بالکل کروں گا... آپا میں آپ کو آداب کہنے کے لیے آنا چاہتا ہوں۔ کوئی وقت دیجیے۔ ایک تو افتخار عارف کی چٹھی ہے آپ کے نام۔ ملتان کے ایک دوست کی کتاب بھی پیش کرنا ہے۔ ایک تحفہ میری بیٹی کی طرف سے ہے اور مجھے آداب کہنا ہے۔''

''تو کل آ جاؤ۔ شام پانچ بجے... مگر ٹھہرو بھئی۔ آج محرم کی کون سی تاریخ ہے۔ میں چھ سے دس تک کسی سے نہیں ملوں گی۔''

''ابھی بتاتا ہوں۔''

میں نے انگلیوں پر انگریزی تاریخ کے ساتھ محرم کی تاریخیں گنیں اور کہا: ''آج پانچ ہے اور کل چھ۔''

''ٹھیک ہے کل آ جائیے۔''

فون بند... اور ایک لمبی سانس۔

دو سال پہلے کے سفر میں اسی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا تھا۔ زیادہ تر گیسٹ ہاؤس محلوں کے عین بیچ دو یا تین منزلہ گھروں کو معمولی ردوبدل کر کے بنا دیے گئے ہیں جہاں ہوٹلوں کے مخصوص

ماحول کے برعکس ہوٹل اور گھر کا ملا جلا ماحول میسر رہتا ہے۔ آپ اسٹوو پر اپنی چائے خود بنا کر پی لیں یا دھوبی خانے میں اپنے کپڑے دھولیں کوئی اعتراض نہیں۔ آس پاس کے مکانوں سے بچوں کا شور اور گھریلو بات چیت میں دہلوی اردو کا تیز لہجہ آپ کو بار بار سنائی دے گا۔ سیڑھیاں اتر کر سیدھے گلی قاسم جان، جس کے ایک مکان میں ڈیڑھ صدی پہلے مرزا غالب رہتے تھے۔ پاس ہی احاطہ کالے صاحب ہے، جن کا تذکرہ 'یادگار غالب' میں کیا گیا ہے۔ زیادہ آبادی مسلمانوں کی ہے۔ اس لیے حلال میٹ کا کوئی مسئلہ نہیں۔ 'شاہد ہوٹل' میری پسندیدہ طعام گاہ رہی۔ اس کے دو سبب تھے۔ ایک تو کھانا عمدہ اور باکفایت دوسرا اس کے مالک شاہد صاحب کے بقول یہ جگہ پہلے لوہارو ہاؤس تھی جو مرزا غالب کے سسر کی ملکیت تھی اور مرزا غالب اس میں کچھ عرصہ مقیم بھی رہے۔ پچھلی مرتبہ شاہد صاحب نے مجھے ہوٹل کا پچھلا حصہ دکھایا تھا۔ بھر بھر مٹی سے جھانکتی چھوٹی اینٹوں کے چوکور ستونوں پر کھڑی چھت آدھی گر چکی تھی جس کا شہتیر دیوار کے ساتھ ترچھا پڑا ہوا تھا۔ مدھم سبز رنگ کی دیواریں ہوٹل کے چولھوں سے اٹھنے والے دھوئیں سے سیاہ پڑ چکی تھی۔ ایک چولھے پر دودھ کی کڑھائی میں ملازم کف گیر چلا رہا تھا۔ اسٹول پر رکھے تھال میں کٹے پیاز اور دوسرے میں گوشت کے پارچے رکھے تھے۔ ایک جانب دو شکستہ الماریاں جن کے پٹ غائب تھے۔ فرش پر کچی پکی اینٹوں کے ڈھیر۔ ایک طرف اندھیرے میں کھلتا محراب دار دروازہ جہاں ٹائلٹ تھی۔

میں گم سم کھڑا اس ویران کدے کو دیکھتا اور سوچتا رہا۔ کبھی یہ نواب الٰہی بخش خان معروف کا گھر تھا۔ یہیں اسی چھت کے نیچے غالب نے ان دیواروں کو بار بار دیکھا ہوگا۔ ان کی آوازیں گونجی ہوں گی۔ شکستہ الماریوں میں غزلوں اور مضامین کے مسودے رکھے ہوں گے۔ شاید کسی کونے میں یک گونہ بے خودی کا سامان بھی پڑا ہوگا۔

''شادی کے کچھ عرصہ بعد غالب احاطہ کالے صاحب کے نزدیک ایک الگ مکان میں منتقل ہو گئے۔'' شاہد بتانے لگے ''وہاں آدھے حصے میں 'مہران ہوٹل' بن چکا ہے اور باقی میں لکڑی کی ورک شاپ ہے۔''

"شاہد بھائی! آپ نے اپنے ہوٹل کو لوہارو ہاؤس کہا ہے اور یہ کہ غالب بھی یہاں کچھ عرصہ مقیم رہے۔ کیا یہ تصدیق شدہ بات ہے؟"

شاہد بولے "ہم نے یہ عمارت خریدی ہے۔ کچھ شعری ذوق بھی رکھتا ہوں۔ اسی محلے کا جنم ہے۔ عمر کافی ہو چلی ہے۔ مجھ سے زیادہ باخبر اور کون ہوگا؟"

پھر وہ مجھے ہوٹل کے ایک کمرے میں لے آئے جہاں ایک کونے میں بستر لگا ہوا تھا۔ دیواروں پر پھول دار چائنہ ٹائلز Flying Kite کے رخ لگے تھے۔ درمیان میں بڑی بھاری بھرکم میز کے ایک طرف لا کر انھوں نے مجھے میز کے پائے اور ان کے اوپر مستطیل فریم پر لگے سیاہی کے پرانے دھبے دکھا کر کہا، "یہاں میر خلیل الرحمان اپنے 'جنگ' اخبار کی کتابت کرایا کرتے تھے۔ یہ دھبے ان کے کاتب کی سیاہی کے ہیں۔ انھیں قلم جھٹک کر لکھنے کی عادت تھی۔ میر صاحب اپنا اخبار خود ہی مرتب کرتے اور سائیکل کے کیریر پر رکھ کر سپلائی کرتے تھے۔"

شاہد صاحب کا یہ بیان میرے لیے معلومات افزا تھا۔ خواجہ حسن نظامی بھی اپنا 'منادی' اس ڈھنگ سے چلایا کرتے تھے۔ میر صاحب نے گویا ان کا مقابلہ انھیں کی جرنلسٹک اسٹریٹجی سے کیا۔

شام اسی طرح گھومتے گزری۔ بلی ماراں سے نکل کر چاندنی چوک آیا۔ یہاں گوردوارہ سیس گنج کی عالیشان عمارت کھڑی تھی۔ گرو تیغ بہادر کے مقتل کی یادگار دنیا بھر کے سکھوں کے لیے متبرک استھان ہے۔ سنگ مرمر کی کشادہ نالی میں بہتے شفاف پانی کے اردگرد سکھ مرد عورتیں اور بچے جھک کر پانی میں بھرتے۔ پھر گیلے ہاتھ سر پر پھیرنے کے بعد پانی میں چلتے ہوئے گوردوارے میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ ان کے وضو کا طریقہ تھا۔ سامنے لال قلعہ کی فصیل نظر آ رہی تھی۔ چاندنی چوک سے گزرتی یہ سڑک غالب کے زمانے میں نہر ہوا کرتی تھی، جس پر لکڑی کی بلیوں سے پل بنائے گئے تھے۔ اسی نسبت سے مرزا صاحب کا محلہ 'بلی ماران' کہلاتا ہے۔

لال قلعے کے مشاعروں میں غالب اسی راستے سے گزر کر جاتے ہوں گے۔

'گردشِ ایام نے اس آبادی کا جغرافیہ کتنا بدل دیا ہے۔" واپسی پر گلی قاسم جان سے

گزرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا۔ ''راستے وہی، ان کے فاصلے بھی وہی، زمین و آسمان بھی وہی، مگر وہ لوگ جو اس گلی کو آباد کیے ہوئے تھے وہ اب نہیں تھے۔ غالب کے مسکن کی بنیاد پر اب 'مہران ہوٹل' کھڑا ہے۔ سائنس نے ٹھیک کہا ''مادہ تلف نہیں ہوتا صرف شکل بدلتا ہے۔''

برسوں پہلے شہزاد احمد نے غالب پر لکھے ایک مضمون میں باڈی بلڈنگ کی اصطلاح میں غالب کو مسٹر غزل کہا تھا۔

واہ! کیا تائٹل ہے۔

So, once upon a time, this was the home of Mr. Ghazal, now encroached upon by the Lofty Mehran Hotel.

14 مئی 1997ء، 3 بجے سہ پہر

دہلی کے پھیلتے ہوئے مضافات میں دریائے جمنا کے پار نوئیڈا کی ملٹی اسٹوری ہاؤسنگ کالونی ہے۔ یہ یوپی کے ضلع غازی آباد میں واقع ہے۔ لمبے سفر اور ٹریفک لائٹس کی رکاوٹوں کے باعث میں نے عینی آپا سے طے شدہ وقت سے دو گھنٹے پہلے نوئیڈا کی بس پکڑ لی اور ٹھیک پانچ بجے سیکٹر 25 کے ج بلاک میں اپارٹمنٹ 140 کی بیل بجائی۔ دروازے کی حفاظت کے لیے ایک اضافی آہنی گیٹ بھی تھا، جس پر چیتل کے انگریزی حروف میں قرۃ العین حیدر کا نام لکھا تھا۔

خوش گوار دیہاتی خدوخال کی ایک مودب لڑکی نے میرا تعارف سن کر دروازہ کھول دیا۔ پھر بک شیلف کے پاس لگے صوفے پر بیٹھنے کا کہہ کر سامنے کی راہ داری میں غائب ہو گئی۔ میں نے عینی آپا کے گھر میں اپنی موجودگی کے احساس کا لطف دوبالا کرنے کے لیے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ دو سال پہلے جب یہاں آیا تو جو چیز جس قرینے سے جس جگہ موجود تھی، آج بھی اسی طرح تھی۔ اسی صوفے پر دوبارہ بیٹھتے مجھے آج کا آنا پچھلے Visit کا تسلسل لگا۔

عینی آپا بغیر آہٹ سامنے کی راہداری سے آہستہ آہستہ چلتی میری طرف آئیں۔ میں نے تعظیماً اٹھ کر آداب کہا۔ وہ بولیں ''آداب! السلام علیکم!'' ہم بیٹھ گئے۔

گفتگو کا آغاز ان کی صحت یابی کے ذکر سے ہوا۔ میں نے بتایا کہ پاکستانی اخباروں میں ان کی صحت کے بارے میں بڑی تشویش ناک خبریں شائع ہوئیں۔ کہنے لگیں۔ ''مبالغہ تھا، چند روز ہسپتال ہی رہی تو یہاں بھی ایسی خبریں لگیں۔''

''میں نے اور میری بیٹیوں نے آپ کے لیے بہت دعائیں کیں آپا۔''

''ارے یہاں بھی لوگوں نے مسجدوں میں دعائیں کیں۔''

''مگر اثر صرف میری دعا کا ہوا۔ میں ملتان کا زندہ ولی ہوں۔ 'کارِ جہاں دراز ہے' کی تیسری جلد میں میری اس ملاقات کا ذکر بھی کرنا۔''

وہ مسکرائیں تو میں نے کہا:

''آپا! میری اللہ تعالیٰ کے ساتھ ڈائریکٹ ڈیلنگ چلتی ہے۔ اسی ہاٹ لائن پر آپ کے لیے دعا کی تھی، اوپر سے جواب ملا ''ٹھیک ہو جائے گی۔'' اور آگے کیا ہوا۔ یہ بھی سنیے۔''

جب آپ ہسپتال سے گھر واپس آرہی تھیں تو فرشتوں نے آپ کی فائل پر جو لکھا وہ سناتا ہوں۔

"Under orders of Almighty Allah, she is discharged cured and permitted to live another two decades in the next century. Further ordianed to write a second epic آگ کا دریا Part Two, highlighting the dismay of those freedom fighters who were typing to catch Fireflies in the Mist."

(فائر فلائز ان دی مسٹ ان کے ناول 'آخر شب کے ہم سفر' کا ترجمہ ہے۔)

عینی آپا میری اس بے تکلفانہ ستائشی گفتگو کو سر جھکائے غور سے سنتی رہیں اور کہا، ''اب بہاء الدین زکریا کے پاس جا کر میرے لیے دعا کرنا، میں سیدانی ہوں، اور پیرزادی بھی۔''

پیرزادی کا انکشاف میرے لیے نیا تھا۔ میں نے وعدہ کیا۔ پھر انھوں نے ملازمہ کو سکینہ کہہ کر آواز لگائی۔ مجھ سے پوچھا کیا پیو گے۔ چائے کہ ستو؟

عینی آپا میرے سامنے بیٹھی تھیں۔ اپنے عہد کی عظیم داستان گو۔ ماضی اور حال کے انسانی

تماشا کی سحر انگیز نقش گر۔ سادگی میں ملبوس کتھئی رنگ، قدرے پریشان بالوں کو ماتھے سے بار بار ہٹاتی ہوئیں۔

میں نے اس لمحہ موجود کو زندگی کی اہم ترین مسرتوں میں سے ایک شمار کیا اور سوچا کہ اختر الایمان نے ایک بار ٹھیک ہی کہا تھا، "اردو کے سارے ادیب مل کر بھی اس ایک خاتون کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

"ہم لوگ تو آپ کی علالت کا سن کر بڑے پریشان تھے آپا بلکہ پورے پاکستان کا ادبی حلقہ ویسے کے لیے اسلام آباد گیا تو افتخار عارف نے تسلی دی کہ آپ ٹھیک ہیں۔ اب دیکھا تو یقین آیا۔" میں نے افتخار عارف کی چٹھی انھیں دی تو یہ کہہ کر میز پر رکھ دی کہ پھر دیکھوں گی۔

"اب تو آپ کی صحت ماشاءاللہ پہلے کی طرح ہے بلکہ بہتر، آپ سلم بھی ہو گئی ہیں۔"

"کیا واقعی؟" ان کے چہرے پر ایک دم بشاشت امڈ آئی۔ "مگر آپ نے تو میرے بارے میں الٹا سیدھا لکھ دیا تھا کہ یوں لگتی ہوں اور یوں لگتی ہوں۔" انھیں امریکہ کی ایک شام پر میری رپورتاژ کا وہ جملہ یاد آ گیا جسے انھوں نے ناپسند کرتے ہوئے کاٹ دینے کا کہا تھا۔ انھیں اس جملے کے صرف نصف پر اعتراض تھا۔

ان کی خفگی کے پیش نظر میں نے مودبانہ وضاحت کی کہ اس Gathering میں، میں ایک Participant کے طور پر شریک تھا۔ جو کچھ دیکھا وہ لکھ دیا۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے دور سے آپ کو دیکھنے کے سبب ایسا گمان ہوا۔" اب انھوں نے دوسرا اعتراض اٹھایا۔

"اور پھر یہ بھی تو لکھا کہ گیان کشیپ نے جب میرا بائی کا بھجن گایا تو لوگ ہنس رہے تھے۔ یہ سراسر ان کی بدتمیزی تھی۔ ان کے شوہر کا انتقال ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ انھوں نے یہ بھجن گایا تھا۔ شاید شوہر کے سوگ میں پوری طرح فارم میں نہ ہوں۔ آپ کو بھی ایسا نہیں لکھنا چاہیے تھا۔"

میں پھر سنبھلا اور کہا "واقعی یہ تو بدتمیزی تھی۔ مردوں نے تو غور سے سنا صرف عورتیں ہنستی تھیں۔"

''خیر! تم میرے بارے میں وہ جملہ کاٹ دینا۔''

سکینہ ستو لے آئی۔ شاید آپا کی نہٹور والی زمینوں سے آئے ہوں گے مزے دار تھے۔ آپا نے نہیں پیے۔ وہ افتخار عارف کے خط کو سرسری نظر سے دیکھ رہی تھیں۔

پھر میں نے صباحت بیٹی کی طرف سے پلائی وڈ اور میٹل شیٹ کے کٹ ورک سے بنی ٹیگور کی تصویر انھیں پیش کی۔ بہت خوش ہوئیں۔ ساتھ ہی جاوید اختر بھٹی کی کتاب 'مگر تم زندہ رہنا' دے کر کہا'' آپ کی صحت یابی کے حوالے سے اس کتاب کا عنوان آپ ہی کے لیے ہے۔'' ٹائٹل پر ایک فاختہ توپ کے دہانے پر بیٹھی تھی کہ آ توپ مجھے مار... Little StupidDove بھٹی کو اس ٹائٹل کی ایک کاپی اقوام متحدہ کے دفتر بھی بھیجنی چاہیے۔

کتاب لے کر انھوں نے کہا'' ہماری طرف سے ان کا شکریہ ادا کر دیں۔''

ماحول کافی خوشگوار تھا۔ میں نے ایک دم سے بیٹی کے افسانوں کا مسودہ عینی آپا کی طرف بڑھا دیا۔

''اور یہ صباحت نے اپنی 'سات کہانیاں' تبصرے کے لیے آپ کی خدمت میں بھیجی ہیں۔ پچھلی مرتبہ آپ نے 'آگ کا دریا' پر اپنے آٹوگراف کے ساتھ اسے دلی دعائیں بھیجیں تو وہ پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اس کی خوشیاں چھلکتے دیکھ کر میں نے کہا:

''بچے! عینی آپا کی آشیرواد کے بعد اپنا افسانہ نگار ہونا پکا سمجھو۔'' لکھنے کی شدھ بدھ رکھتی تھی۔ سچ مچ کی افسانہ نگار بن بیٹھی۔ دہلی آتے اس نے مجھے یہ کہانیاں آپ کی رائے کے صرف چند جملوں کے لیے دی ہیں۔ وقت ہو تو دیکھ لیجیے۔''

مسودہ کمپیوٹر کمپوزنگ کے سبب جاذب نظر تھا۔ کچھ دیر الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولیں:

'' بھئی! یہ تبصرے اور دیباچے مجھے لکھنے نہیں آتے۔ اب یہ آپ کی بیٹی نے بھیجی ہیں تو دیکھ لوں گی۔''

میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا'' بمبئی سے واپسی پر لے لوں گا۔ امید ہے تب تک آپ دیکھ لیں گی۔''

پھران کی نظر صباحت کی بھیجی ہوئی ٹیگور کی تصویر پر پڑی تو کہنے لگیں "یہ تو اس نے تکلف کیا۔ اب مجھے بھی اسے کچھ بھیجنا چاہیے۔"

سر جھکائے بالوں کو پیچھے ہٹاتے وہ کچھ سوچنے لگیں۔ پھر اچانک کہا "مگر آج کل تو محرم ہے۔ میں ان دنوں خریداری نہیں کرتی۔ آپ بمبئی کتنے دن رہیں گے؟"

میں نے کہا "بس ہفتہ دس دن۔"

پھر ان کے ناولٹ کے اسکرپٹ کی یاد دلانے کے لیے میں نے دانستہ ڈولی جینا کا ذکر چھیڑ دیا جنھیں وہ اس ناولٹ پر فلم یا ٹی وی سیریل بنانے کی اجازت دے چکی تھیں۔ کہنے لگیں "ڈولی نے بعد میں مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔"

میں نے انھیں بتایا کہ ڈولی جینا تو اس کا اسکرپٹ لکھوانے سورج سینم کے پاس بھی گئی تھیں مگر اس نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ ثبوت کے طور پر میں نے انھیں سورج سینم کا اپنے نام آیا خط پڑھ کر سنایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس ناولٹ پر فلم یا سیریل بنانا ڈولی کے بس سے باہر تھا۔

اب میں نے ڈرتے ڈرتے اس ناولٹ پر اپنے اسکرین پلے کا ذکر کیا، جو انھیں پچھلی مرتبہ دے آیا تھا اور انھوں نے پسند بھی کیا تھا۔

"کیا خیال ہے آپا۔ اگر میں اپنے اسکرین پلے کے لیے بمبئی میں کچھ کوشش کروں تو؟ مجھے ویسے بھی جانا تو ہے۔ ڈولی جینا کا پتہ بھی کروں گا اور سورج سینم کے ذریعے کسی معقول شخص کو اس کی پروڈکشن کے لیے بھی آمادہ کروں گا۔ آپ بھی کوئی ریفرنس دے دیں تو اچھا ہے۔"

کہنے لگیں "جاوید اختر کو میرے حوالے سے مل لینا۔ مناسب رہے گا۔ اسکرین پلے کی کاپی تو آپ کے پاس ہوگی۔"

میں نے پوچھا "آپ نے میرا اسکرپٹ پورے کا پورا پڑھا تو ہوگا؟"

"بولیں "ہاں پڑھا تھا، مگر آپ نے کافی رد و بدل کر دیا ہے... اور وہ جوزف تھامسن کہاں سے ڈال دیا۔ وہ ریلوے انجینئر؟"

میں نے کہا" آپا آپ تو خود اس فیلڈ میں رہی ہیں۔ کہانی کو پلے کرنے کے لیے بصری سچوایشنز Create کرنا پڑتی ہیں، بلکہ کہانی کو مسمار کر کے دوبارہ منظر بہ منظر Re Construct کرنا پڑتا ہے۔ کہانی کے اندر رہتے ہوئے بہت سے حصے حذف اور کئی نئے Add کرنے پڑتے ہیں۔ گانوں اور رقص کی جگہیں نکالنا ہوتی ہیں۔ کچھ کردار نکال کر نئے کردار ڈالنا ہوتے ہیں۔ منظر کی صورت حال کے پیش نظر ناول میں موجود مکالموں کو مختصر یا طویل کرنا پڑتا ہے اور پھر آپ کے ناول کو چھیڑنا تو میرے لیے یوں تھا جیسے 'پکاسو' کی پینٹنگ کو موضوع تبدیل کیے بغیر Re Paint کرنا جسے 'پکاسو' بھی پسند کرلے۔ جیسے آپ نے میرا اسکرین پلے پسند کیا۔"

انھوں نے میری یہ وضاحت کمال تحمل کے ساتھ سنی اور کہا" یہ تو سب ٹھیک ہے مگر وہ جوزف تھامپسن کا قصہ اتنے لمبے فلیش بیک میں ڈالنا کیا ضروری تھا؟"

ان کے متوقع اعتراضات کے پیش نظر میں پہلے ہی اسکرین پلے کے Viva پر پوری طرح تیار ہو کر گیا تھا اس لیے انھیں جوزف تھامپسن کی اہمیت اور اسی طرح کے دوسرے Added Characters پر پوری طرح مطمئن کر دیا۔

اسکرین پلے کی وضاحتیں ختم ہوئیں تو پوچھنے لگیں" آپ نے پہلے بھی کبھی اسکرین پلے لکھے ہیں؟"

میں چونکہ اسکرین پلے کے اکھاڑے میں اتر چکا تھا۔ پہلا جوڑ بینی آپا کے ناول سے پڑا۔ میری تیکنک کے داؤ پیچ کو وہ پسند بھی کر چکی تھیں، اس لیے حوصلہ قائم تھا۔ فوراً اثبات میں سر ہلایا۔" جی ہاں! بہت سے، کالج کے زمانے میں کئی ڈرامے لکھے اور ڈائریکٹ بھی کیے۔"

دراصل اسکرین پلے کا یہ پھندا خالد سعید نے میرے گلے ڈالا تھا۔ دو سال پہلے وہ اپنی رونی صورت لیے میرے گھر آیا اور بینی آپا کا ناولٹ 'اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو' مجھے تھما کر بولا "شیدا! میں یہ ناول پڑھ کر بہت رویا ہوں۔ قسم خدا کی ایک درجن ٹشو پیپر بھگو دیے۔ تم اس کی ڈرامائی تشکیل کرو۔ ہم ایک اسٹیج ڈراما کریں گے۔"

خالد سعید کے شر سے بچنا محال ہے۔ اس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ میں نے اس کی باتوں

میں آ کر زندگی کا پہلا اسکرین پلے لکھا تو وہ میری توقعات سے کچھ زیادہ ہی اچھا ہو گیا۔ سب سے بڑی مشکل عینی آپا کے اسٹائل کو برقرار رکھنا تھا۔ پھر لکھنؤ کے پوربی ماحول میں نچلے طبقے کے لوگوں کی ڈکشن، ہر کردار کے مخصوص مزاج کا تسلسل، اپنی صواب دید کے مطابق ناول کے کچھ مکالموں کو حذف کرنا اور کچھ عینی آپا کے اسٹائل میں اضافہ کرنا، خطوں میں بیان کیے واقعات کو پلے کرنے کے Situations پیدا کرنا، زمان و مکان کی پابندیوں کے پیش نظر کچھ واقعات فلیش بیک میں دکھانا، مختلف مناظر میں کہیں کہیں کیمرے کے زاویے تجویز کرنا اور کمرشیل نمائش کے باعث رقص اور گانوں کی سچوایشنز نکالنا خاصا محنت طلب تھا۔ بہر حال عینی آپا نے اسے پسند کیا۔ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ تھینک یو خالد سعید۔

ہم باتوں میں لگے تھے کہ سکینہ آ گئی۔ آپا نے پوچھا "اور ستو لو گے؟" میں نے ہاں کی اور ستو کا دوسرا دور چلا۔ ستو پیتے پیتے میں سوچ رہا تھا کہ ڈولی جیناا گر غائب ہو گئی ہے تو اس کی جگہ ناول کی فلم بندی کی اجازت میں کیوں نہ مانگ لوں۔ لہٰذا درخواست کی۔

"آپا! آپ ڈولی کی جگہ مجھے Authorise کر دیں۔"

کہنے لگیں "کر تو دوں مگر پاکستان میں آپ لکھنؤ کا ماحول کیسے بنائیں گے؟"

میں نے کہا یہ کون سا مشکل ہے۔ اسٹوڈیو میں کسی بھی ماحول کا سیٹ لگایا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں لکھنوی تمدن کے پس منظر میں کئی فلمیں اور ٹی وی میریل بن چکے ہیں۔ لکھنؤ کی خالص 'امراؤ جان ادا' آپ کے مظفر علی سے بہتر ہمارے حسن طارق نے بنائی تھی۔ پچھلے دنوں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول پر PTV کی بہترین سیریل چلی تھی۔ ہمارے کراچی ٹی وی کے بہت سے ڈرامے لکھنوی تہذیب اور لب و لہجے کے ساتھ بنائے گئے۔ آپ کی طرح یو پی کے بہت سے ادیب کراچی ٹی وی کے لیے لکھتے ہیں۔ خاص طور پر وہ بجیا... کیا نام... جن کی ایک بہن انگلینڈ میں سیٹل ہیں۔"

"زہرا نگاہ۔" آپا نے لقمہ دیا۔

"ہاں! زہرا نگاہ کی بہن فاطمہ ثریا بجیا اور ان کے بھائی انور مقصود... اور حسینہ معین۔"

''ارے چھوڑو حسینہ معین کو۔'' بھنی آپا نے ایک طرف ہاتھ ہلا کر بے زاری کا اظہار کیا۔'' اس نے سارا اسٹائل میری تحریروں سے چرایا ہے۔ 'ہمیں چراغ ہمیں پروانے' پورے کا پورا اپنے نام کی سیریل میں ڈال دیا... یہاں آئی تھی میرے پاس کچھ سال پہلے۔ ناول چرانے پر معذرت تک نہیں کی۔ خیر چھوڑو آپ ان باتوں کو۔ آپ پاکستان میں اس ناولٹ پر لکھنؤ کی پوری یا تہذیب ان ڈور آؤٹ ڈور دکھالیں گے؟ میں نے کہا'' کیوں نہیں۔ ان ڈور کا تو سیٹ لگے گا۔ آؤٹ ڈور کے لیے لاہور، حیدرآباد، ملتان کسی بھی قدیمی شہر کا گلی محلہ کام آسکتا ہے۔ باقی آپ کے پلاٹ میں سے ایک Sting نکالنا پڑے گا۔''

''وہ کون سا؟'' انھوں نے پوچھا۔

''وہ تقسیم ہند کے بعد رشک قمر کا شوہر کی تلاش میں پیر فلفل شاہ کے مشورے پر لکھنؤ سے جوان بیٹی سمیت کراچی جانا۔ وہاں اسمگلروں کے ہاتھوں بیٹی کی ہلاکت کے بعد برباد ہو کر دوبارہ لکھنؤ آنا۔

''مگر اس میں Sting کون سا ہے؟'' انھوں نے دوبارہ پوچھا۔

''وہ ہے پاکستان اور ہندستان کی دو جنگوں کے سبب دونوں ملکوں کے رابطے اور ڈاک کے سلسلے کٹ جانا اور اس کے نتیجے میں رشک قمر کا اپنے خاندان کے احوال سے بے خبر رہنا۔ کراچی میں بیٹی کی لاش دیکھ کر حواس کھو دینا اور پولس کے سوالوں پر حواس باختگی کی آڑ میں تقسیم ہند پر طنزیہ جواب دینا۔ اسی طرح کے کچھ جواب بمبئی واپسی پر نور اسلام مسافر خانہ کے کاؤنٹر کلرک کو بھی دیے۔''

''آپا! ہمارے ادھر کے لوگ اس بارے میں زیادہ ہی چُپی ہیں۔ میں، ایسے ممکنہ قابل اعتراض مناظر اور مکالمے اسکرپٹ میں جھول ڈالے بغیر آسانی سے نکال سکتا ہوں یا بدل سکتا ہوں۔''

انھوں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد مجھے اپنے ناولٹ پر فلم بنانے کی اجازت دے دی تو میں نے یہ اجازت تحریری طور پر مانگی۔ وہ اندر گئیں اور اپنا پیڈ اٹھا لائیں۔ ''مجھے تو اپنا رائٹنگ پیڈ

چھپوانا بھی یاد نہیں رہا۔ یہ پیڈ ہمارے ایک عزیز نے امریکہ سے چھپوا کر بھجوایا ہے۔'' انھوں نے مجھے بتایا۔ پھر قلم اٹھا کر لکھنے لگیں تو رک گئیں۔ پیڈ اور قلم میز پر رکھ دیے اور کہا ''محرم میں میں لکھتی نہیں۔ بمبئی سے واپسی پر اتھارٹی لیٹر لے لینا۔''

اس عنایت پر میری خوشی کا گراف ایک دم شوٹ کر گیا۔ اس خوشی کو میں نے فوری طور پر جگ میں پڑے بقایا سکو پی کر Celebrate کیا۔ اسی دوران ان کا ایک نوجوان مہمان جوڑا ملنے آ گیا۔ میاں بی بی دونوں خوش شکل اور اسمارٹ۔

''ونگ کمانڈر مسٹر فلاں اور یہ ان کی بیگم۔'' آپا نے ان کا تعارف کرایا۔

میں اپنا سیشن کر چکا تھا۔ باقی ماندہ بمبئی سے واپسی کے لیے رکھتے ہوئے میں نے اجازت لی۔ سکینہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی... وہی خوش گوار دیہاتی خد و خال والی نوخیز لڑکی۔

''گڈ بائی سکینہ! بمبئی سے لوٹوں تو تمھیں دروازہ کھولنا۔'' میں نے دل میں کہا اور سیڑھیاں اتر گیا۔

(سطور، شمارہ 4، قرۃ العین حیدر نمبر، 2008)

اس کا انداز منفرد ہے بہت

گفتگو : ابوالفیض سحر

شہر دہلی ہندستان کا صدر مقام ہے اور دہلی کا قلب کناٹ پلیس ہے۔ حال ہی میں یہاں نیشنل بک ٹرسٹ کے زیر اہتمام مارچ کی اٹھارہ تاریخ سے دوسری اپریل تک کتابوں کا ایک یادگار عالمی میلہ منعقد کیا گیا تھا۔ ہندستان میں غالباً یہ اپنی نوعیت کا پہلا میلہ تھا۔ اس میں ہندستانی زبانوں کے علاوہ دنیا کی اہم زبانوں کے بعض نمائندہ مصنفین اور چند اہم ناشرین کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ ممتاز مصنفین کے اس کیمپ میں علی سردار جعفری، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر وحید اختر اردو شاعروں اور ادیبوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ 28 مارچ کو 8 بجے شب دہلی کے اعلیٰ درجے کے امپیریل ہوٹل کے جدید قرینے سے سجے سجائے بال روم ڈانس ہال میں ہندی، کشمیری، پنجابی اور اردو کے مصنفین سے ملاقات کا پروگرام طے کیا گیا تھا۔ مگر چند خاص وجوہ اور بعض عام اسباب کی بنا پر بڑی گڑبڑ اور ابتری رہی۔ اسی ہال میں لگے بڑے بڑے آئینوں سے کوئی بھی اپنا چہرہ چھپا نہ سکا۔ مجھے پھر ایک بار اندازہ ہوا کہ آئینے کس قدر سچ بولا کرتے ہیں۔ بہر حال یہاں نہ کسی سے ملنے کا موقع ملا نہ کسی سے ڈھنگ کی بات ہو سکی۔

البتہ قرۃ العین حیدر صاحبہ اور عصمت آپا سے دوسرے دن پانچ بجے اس جگہ پھر ملنا طے ہوا۔

دوسرے دن میں ٹھیک وقت پر امپیریل ہوٹل پہنچا۔ مصنفین کا ایک مخصوص اجلاس جس کی صدارت عصمت چغتائی کر رہی تھی ابھی ابھی ختم ہوا تھا۔ سبھی چائے اور کافی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہال ہی میں قرۃ العین حیدر سے میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا" آیئے چائے پیتے پیتے ہی بات کریں۔ مجھے فوراً ہی ریڈیو اسٹیشن بھی جانا ہے۔" میں نے اتفاق کیا، پھر ہم چائے کی طرف بڑھے۔ بیرا چائے بنا رہا تھا۔ گھنٹوں کی مسلسل بحث و تقریر کے بعد سبھی شرکائے جلسہ تھکے تھکے لگ رہے تھے اور اب چائے کی پیالیاں بول رہی تھیں۔ ہال میں نہیں ورانڈے میں اب بڑی ہماہمی تھی۔

آج سے کئی برس پہلے، حیدر آباد میں، اب یاد نہیں کہ کس کانفرنس میں اور کس مقام پر علی سردار جعفری، سلیمان اریب، رام لال، میں اور میرے دوست احمد جلیس اردو ناول کے سلسلے میں عینی کے فن پر بحث کر رہے تھے۔ عینی کے سحر انگیز اسلوب نگارش کے سردار اس وقت بھی مداح تھے اور آج بھی ہیں اور آج میں خود عینی سے عینی کے فن کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

کچھ رسمی بات چیت کے بعد میں نے پوچھا" عینی صاحبہ یہ بتلایئے کہ آپ نے ناول ہی کو اپنے اظہار کا وسیلہ کیوں بنایا۔"

عینی نے کچھ اس طرح جواب دیا جیسے ان کے خیال میں یہ بات زیادہ اہم نہیں ہے کہ فن کار کے اظہار کا وسیلہ کیا ہوتا ہے بلکہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس کے فن کا معیار کیا ہے۔

پھر میں نے دوسرا سوال کیا" بعض ناقدین کا خیال ہے کہ اردو میں ناول ہے ہی نہیں۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔" اردو کی ایک عظیم ناول نگار خاتون سے یہ جواب سن کر میں واقعی سوچ میں پڑ گیا۔

عینی بڑی بے چین سی نظر آ رہی تھیں۔ شاید انھیں ریڈیو اسٹیشن کا خیال ستا رہا تھا۔ اس لیے میں نے جلد ہی ایک اور سوال کیا" اپنی ناولوں میں آپ کس قسم کی تکنیک برتتی ہیں۔ یعنی میرا

مطلب ہے کہ آپ اردو ادب میں ناول کے ارتقا کے سلسلے میں اس کے کن فنی پہلوؤں پر توجہ کرتی ہیں یا انھیں بڑھاوا دینے کی کوشش کرتی ہیں۔"

گرم گرم چائے کے گھونٹ جلدی جلدی حلق سے اتارتے ہوئے انھوں نے جواب دیا "یہ تو آپ کا کام ہے، نقادوں کا کام ہے کہ وہ پڑھیں اندازہ کریں۔ اس تعلق سے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

اور لوگوں کی طرح میرا بھی خیال ہے کہ قرۃ العین حیدر کی ناولوں میں ورجینیا وولف کی اثر پذیری ملتی ہے۔ اس لیے میں نے دریافت کیا "یوں تو آپ ہندستان کے اردو ناول اور ناول نگاروں سے بخوبی واقف ہیں ہی۔ ساتھ ہی آپ نے کئی بیرونی ملکوں کے دورے بھی کیے ہیں۔ انگریزی، فرانسیسی اور روسی اور دیگر زبانوں کے ناول کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ کیا آپ یہ بتلائیں گی کہ ان میں آپ کن ناول نگاروں کو زیادہ پسند کرتی ہیں اور ان میں کیا فنی محاسن محسوس کرتی ہیں؟"

"ہاں! یوں تو میں نے کئی ملکوں کے دورے کیے ہیں۔ انگریزی کے توسط سے مختلف زبانوں کے ناول بھی پڑھے ہیں مگر یہ ایک ایسا سوال ہے کہ اس پہ تفصیلی روشنی ڈالی جانی چاہیے۔ یہاں اس تعلق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ عصمت آپا سے ہی پوچھیے شاید وہ کچھ بتا سکیں گی۔ مجھے ریڈیو اسٹیشن بھی پہنچنا ہے۔" اس کے بعد وہ بھیڑ بھاڑ میں شہاب ثاقب کی طرح جانے کہاں غائب ہوگئیں۔

اب میں عصمت آپا سے مخاطب ہونے ہی والا تھا کہ عصمت آپا نے خود مجھے مخاطب کیا "تم نے چائے پی لی۔" ان کے لہجے میں اتنی اپنائیت تھی اور اتنا پیار تھا کہ مجھے اپنی مرحوم پھوپھی یاد آگئیں۔

میں نے کہا "ہاں میں نے چائے تو پی لی مگر وہ ناکافی تھی۔"

مسکراتے ہوئے انھوں نے کہا "تو پھر آؤ کافی پی لیں۔"

ہم نے کافی پی لی۔ عصمت آپا نے کہا "ایسی جگہ چلو جہاں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ یہاں ایک ہنگامہ سا ہے۔"

''تو پھر اندر ہال ہی میں چلیے جہاں اب طوفان کے بعد کی خاموشی ہے۔'' میں نے کہا اور پھر ہم ہال میں آ گئے۔ سامنے ہی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، وہیں بیٹھ گئے۔

''عصمت آپا... میرا خیال ہے کہ عینی صاحبہ نے اپنے ناولوں میں کردار نگاری سے زیادہ منظر نگاری اور فضا بندی پر توجہ کرتی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے ان کے طویل طویل ناولوں کے باوجود نہ تو پریم چند کا 'ہوری' پیدا ہو سکا نہ کوئی 'خوجی' یا 'مرزا ظاہر دار بیگ'۔ علاوہ ازیں ایک بے نام سی تشنگی، اضطراری کیفیت، زندگی سے اکتاہٹ اور اس کی بے مقصدیت کا المیہ اور ایک عجیب قسم کا احساس محرومی ان کے ناولوں کے مزاج کا ایک حصہ بن گیا ہے۔

کچھ سوچتے ہوئے عصمت آپا نے کہا ''ہاں ہو سکتا ہے کہ تمھارا خیال ٹھیک ہو۔''

واجدہ تبسم کے نام لکھے گئے ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے پوچھا ''آپا، آپ نے واجدہ تبسم کے نام ایک خط میں عینی کے انداز تحریر کے تعلق سے لکھا تھا کہ ان کے قلم میں شہد کی شیرینی اور شیمپین کا نشہ ہے۔''

عصمت آپا نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا ''ہاں۔ اب بھی میں یہی کہوں گی۔ وہ بڑی جادوگر ہے۔ لکھنے میں بڑا جال بنتی ہے۔ اب تو بہت خوبصورت انداز میں لکھتی ہے۔''

ہم نے اب کافی ختم کر دی تھی۔ عصمت آپا بٹوے میں سے پان نکال رہی تھیں۔ میں نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا ''اچھا آپا اب یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ آپ نے افسانہ نگاری کے فن کو ہی کیوں اپنایا؟''

''اس لیے کہ یہ آسان تھا۔ اس وقت آزاد نظم نہیں تھی ورنہ شاید شاعرہ بن جاتی۔ ابتدا میں ایک ڈرامہ 'فسادی' بھی لکھا تھا مگر پطرس بخاری نے ایسی کڑی تنقید کی کہ میں نے ڈرامہ لکھنا ترک کر دیا۔ میرے لکھنے کا کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا۔ خاص کر کسی انعام یا اعزاز کے لیے میں نہیں لکھتی۔ میرے لکھنے پڑھنے کا مقصد دل کو بہلانا تھا۔ مگر یہ دل کا بہلاوہ جی کا جنجال بن گیا۔''
عصمت آپا نے اپنا جواب مکمل کیا اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے پھر بات چھیڑی۔ ''فن کار اپنے فن کی تخلیق سے پہلے کس سے تحریک پاتا ہے یا

کچھ اثر قبول کرتا ہے۔ آپ نے کن کن سے اثر قبول کیا ہے؟''

ابھی میرا سوال پورا نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے جواب دینا شروع کیا ''رشتہ داروں سے، دوستوں سے، پڑوسیوں سے، انجانوں سے، جان پہچان والوں سے، حالات سے، ماحول سے، سبھی سے میں نے اثر قبول کیا ہے۔ میں نے کوئی چیز دل سے گڑھ کر نہیں لکھی جو کچھ لکھا سب میرا مطالعہ اور مشاہدہ ہے۔ میرے ابتدائی زمانے میں اچھے افسانہ نگاروں میں عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، ایم اسلم، علی عباس حسینی وغیرہ تھے۔ ان کی چیزیں بھی میں دلچسپی سے پڑھا کرتی تھی۔''

عصمت آپا کے موڈ کو موافق دیکھ کر میں نے سوال کیا ''اُردو افسانوی ادب میں منٹو کی طرح آپ بھی ایک فحش افسانہ نگار کی حیثیت سے کافی مشہور ہوئیں، آپ کو شہرت زیادہ ملی یا بدنامی؟''

ایک لمبی سانس لینے کے بعد انھوں نے کہنا شروع کیا ''میرے افسانے 'لحاف' کے ساتھ ہی مجھے شہرت ملی، اور شہرت کے ساتھ بدنامی بھی۔ بلکہ یوں سمجھو کہ شہرت اور گالیاں ساتھ ساتھ ملیں اور اب یہ دونوں مجھے ایک جیسی چیز معلوم ہوتی ہیں۔ لوگوں سے، نقادوں سے مجھے شکایت ہے کہ انھوں نے میری عریانی کو تو پکڑ لیا لیکن میرے خوبصورت کرداروں کو، جیسے چچا بڑے، جو میرے حقیقی چچا کا کردار ہے، چچو بی جو میری پھوپھی کا کردار، 'زہر کا پیالہ' والی ٹیکو جو میری انا تھی، کو کسی نے نہیں سراہا۔ 'ڈائن' اور 'ساتواں نمبر' میرے پسندیدہ افسانے ہیں۔ میری ناول 'دل کی دنیا' مجھے اتنی پیاری لگتی ہے کہ میں اپنی ساری تحریروں کو اس پر نچھاور کر دوں۔ یہ میرے بچپن سے متعلق ہے مگر اس کا کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ سب نے مجھے ادبی دنیا کی ویمپ (Vamp) بنا دیا مگر جو درد میں نے محسوس کیا وہ کسی نے بھی محسوس نہیں کیا۔''

امپیریل ہوٹل کے اس بڑے ہال روم ڈانس ہال کی گمبھیر خاموشی اور ایسے میں عصمت آپا کے دل کی گہرائیوں میں گرنے والے آبشاروں کی دھیمی دھیمی آواز نے مجھے بہت متاثر کیا۔ کچھ دیر بعد میں نے جدید افسانے اور کہانیوں کے بارے میں ان کے تاثرات معلوم کرنے چاہے۔

انھوں نے بتلایا کہ بعض نئے افسانے اور کہانیاں انھیں بے حد پسند آتی ہیں اور بعض بہت ناپسند بھی ہوتی ہیں۔ دراصل ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے یہ ایک عبوری دور ہے۔

''ہاں آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اَب یہ فرمائیے کہ دیگر اصنافِ ادب کے مقابلے میں خواتین، افسانہ نگاری اور ناول نویسی میں کیوں زیادہ کامیاب رہتی ہیں، آپ اور عینی کے علاوہ صالحہ عابد حسین، رضیہ سجاد ظہیر، سلمیٰ صدیقی، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، آمنہ ابوالحسن نے اس صنف میں کافی نام پایا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا جذبات نگاری، ماحول کی عکاسی اور دل آویز اندازِ بیان میں صنفِ نازک کو زیادہ ملکہ حاصل ہے؟''

میری اس بات پر وہ چونکیں اور پھر کہا ''میں نے تو اس بارے میں کبھی غور نہیں کیا۔''

قطع کلام کرتے ہوئے پھر میں نے ہی کہا ''آپ کیوں غور کریں آپ تو 'مردانہ وار' لکھتی ہیں۔'' وہ ہنس پڑیں۔ پھر میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ میں نے آپ کی تحریر ہی میں نہیں بلکہ تقریر اور بات چیت کے دوران بھی اچھے اچھے مردکو پسینہ آتے دیکھا ہے۔ اسے میں آپ کی بے باکی سے تعبیر کروں یا خود اعتمادی سے؟''

ان کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ انھوں نے عینک ٹھیک کی، پھر ہونٹ صاف کیے اور بولیں ''دونوں۔ یہ میرے بچپن اور میرے اس ماحول کا اثر ہے جس میں میں پلی بڑھی۔ مگر مجھے مرد سے یہ شکایت ہے کہ اسے صدیوں سے یہ گمان ہو گیا ہے کہ وہ بہت کچھ ہے، بلکہ سب کچھ ہے۔ وہ کبھی نہیں بھولتا کہ وہ مرد ہے۔ مگر عورت بھول سکتی ہے کہ وہ عورت ہے۔ میری آئیڈیل عورت اندرا گاندھی ہیں۔ نہایت تیز، مستعد، بے باک اور بے لاگ۔ پر وقار اور کارکرد۔''

آپا کے لب ولہجہ میں اب بھی وہی اعتماد تھا۔ اپنا جواب ختم کر کے وہ میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ شاید میرے اگلے سوال کی منتظر تھیں اس لیے میں نے دریافت کیا۔ ''بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارے نامور شاعر وادیب، انعام اور اعزاز یا کوئی اعلیٰ مقام پا کر ویسے مفکر یا دانشور نہیں رہتے جو وہ پہلے ہوتے ہیں بلکہ انھیں شکایت ہے کہ وہ Establishment کا ایک حصہ بن جاتے

ہیں۔اس ضمن میں آپ کیا محسوس کرتی ہیں؟''

''یہ دراصل ایک ناراض گروہ کا خیال ہے۔اگر کسی کو کوئی اعزاز ملتا ہے تو اس میں جلنے کی کیا بات ہے۔کرشن چندر پر مجھے رشک آتا ہے مگر ان سے مجھے نہ کوئی حسد ہے، نہ کوئی بغض۔اگر کوئی عورت خوب صورت ہو تو اس میں بدصورت عورت کی ناراضی کا کیا جواز ہے۔اگر کسی کے پاس میرے زیور سے زیادہ قیمتی اور زیادہ اچھے زیور ہوں تو میں اس پر لعن طعن کیوں بکوں۔بہر حال اس میں جھوٹ زیادہ اور صداقت کم ہے۔ہوسکتا ہے کہ جماعت میں شریر بچے کو مانیٹر بنا دینے کی پالیسی بھی کارفرما رہی ہو۔مگر میرے خیال میں ادیب کو اس کے ادب اور اس کی خدمات کی بنا پر ہی مقامات ملتے ہیں۔ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ اِدھر سردار نے بہت ترقی کی ہے۔وہ بہت ذمہ دار بن گیا ہے اور دھرم ویر بھارتی بھی ذمہ داری کے احساس کے مارے بوڑھے ہو گئے ہیں...اور ہم ہنس رہے تھے۔

('آج کل'، جون 1972)

بچوں میں پڑھنے کا شوق کم ہو گیا ہے

آصف جیلانی

اردو کی ممتاز ناول نویس اور افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کو ہم سے جدا ہوئے 9 سال گزر گئے۔ انھوں نے اردو میں ناول نگاری کو ایک نئی جہت، وسعت اور گہرائی کے ساتھ ایک نیا اسلوب بخشا ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ وہ چھ دہائیوں سے زیادہ عرصے تک اردو ادب کے افق پر چھائی رہیں۔ ان کا تخلیقی سفر 1944 سے شروع ہوا تھا جبکہ ان کا پہلا افسانہ رسالہ 'ادیب' میں شایع ہوا تھا اور اس کے تین سال بعد ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'ستاروں سے آگے' منظر عام پر آیا۔

1949 میں ان کا پہلا ناول 'میرے بھی صنم خانے' شایع ہوا اور سنہ 59 میں ان کے ناول 'آگ کا دریا' نے دھوم مچادی جو اردو میں ناول نگاری کے ایک نئے عہد کا نشان مانا جاتا ہے۔ اس کے بعد ناول 'آخر شب کے ہم سفر'، 'کارِ جہاں دراز ہے'، 'گردش رنگ چمن' اور 'چاندنی بیگم' قرۃ العین حیدر کے تخیل کی تازہ کاری نئے انداز اور نئے تجربات کا پتہ دیتے ہیں۔

برصغیر کی تاریخ کے مختلف ادوار میں عورت کی سماجی حیثیت اور جاگیردارانہ دور سے لے کر اب تک عورت کے استحصال کے جو روپ بدلے، ان کا ادراک اور اظہار قرۃ العین حیدر کے

ناولوں سے پہلے اردو ادب میں نمایاں نظر نہیں آتا۔

قرۃ العین حیدر اردو کی پہلی خاتون ادیبہ ہیں جنھیں سنہ نواسی میں ہندوستان کا سب سے اعلیٰ ادبی اعزاز 'گیان پیٹھ دیا' گیا۔ انھیں 1984 میں پدم شری اور 2005 میں پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا۔

قرۃ العین حیدر انتقال سے دو سال پہلے جب لندن آئی تھیں تو بی بی سی اردو سروس کے ثقافتی پروگرام 'سب رس' میں ان سے روایتی انداز سے ذرا ہٹ کر میں نے ان سے اس بات پر گفتگو کی کہ وہ اپنے ناولوں کے لیے مواد کس طرح جمع کرتی ہیں اور ناول لکھنے کے سلسلے میں کن مراحل سے گزرتی ہیں۔

اس گفتگو کا آغاز میں نے اس سوال سے کیا تھا کہ اپنے ناول کے بنیادی خیال کو کاغذ پر منتقل کرنے تک کتنا عرصہ لگتا ہے؟ جواب میں انھوں نے کہا۔ یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ اس لیے کہ جسے creative process کہا جاتا ہے اس کا آپ تجزیہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ کوئی بلیو پرنٹ نہیں بنا سکتے۔ غالباً اب لوگ کمپیوٹرائز کر رہے ہیں اور کمپیوٹر میں ڈال کر ناول لکھے جائیں گے۔ یہ سب نہیں ہوتا۔ کم از کم اکثر ادیب ایسا نہیں کرتے اور میں تو بالکل نہیں کرتی کہ پہلے سے کوئی پلان بناؤں۔ سوچوں پہلے سے کہ اس پر کام کروں گی۔ یہ سب میکینکل ہوتا ہے یہ فلم کے اسکرپٹ رائٹنگ میں تو ہوتا ہے یا ٹی وی کے لیے ہوتا ہے۔ لیکن ہم جو لکھ رہے ہیں اور لکھنے کا جو عمل ہے وہ تخلیقی عمل ہے جو بڑا Haphazard ہوتا ہے۔ کچھ لکھنا شروع کر دیا پھر تین چار مہینے کے لیے بھول گئے۔ اس لیے یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ کب سوچا اور کب لکھا۔

میں نے پوچھا کہ آپ نہیں سمجھتیں کہ ناول لکھنے کے لیے تو ڈسپلن کی ضرورت ہے اور تواتر سے لکھنا ضروری ہے۔ انگریزی کے ممتاز ادیب گراہم گرین نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ وہ ڈسپلن کے ساتھ لکھتے ہیں اور اس کے تحت ہر روز لازماً پانچ سو الفاظ لکھتے ہیں۔ آپ کا کوئی ایسا ڈسپلن ہے؟

جواب دیا: ابھی عرض کیا کہ میں نہیں لکھتی تو مہینوں نہیں لکھتی اور لکھتی ہوں تو لکھتی چلی جاتی

ہوں۔ میرے ہاں کوئی ڈسپلن نہیں ہے۔ ہمارے ہاں ہندستان اور پاکستان میں ادیب اتنے منظم نہیں ہیں۔ سب Haphazard طریقے سے لکھتے ہیں۔ مغرب میں جو ادیب ہے اس کا تو پورا پروفیشن ہے۔ اس کے سکریٹری اور ایجنٹس ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے ادیب تو روٹی روزی میں لگے رہتے ہیں۔ ان کو جب وقت ملتا ہے وہ لکھ لیتے ہیں۔

میں نے پوچھا کیا آپ کو کوئی خاص وقت ہے لکھنے کا۔ علی الصبح یا رات دیر گئے؟

جواب دیا: نہیں ایسا کچھ نہیں۔ مجھے لکھنے کے لیے ایسے ماحول کی ضرورت نہیں کہ چاند نکلا ہے۔ باغ میں شاخ پر بلبل بیٹھی ہے اور آپ بیٹھے لکھ رہے ہیں۔ نہیں ایسا کچھ نہیں۔ مجھے جب وقت ملا لکھ لیا۔

ناول کے پہلے مسودے کے بعد آپ کتنی بار اس میں ردوبدل کرتی ہیں۔ میں نے پوچھا۔

ان کا جواب تھا: نہیں صاحب میں تبدیلی تو کرتی ہوں۔ میرے لیے میرے ناول ایک طرح کی موزیکل کمپوزیشن ہے۔ مجھے موسیقی سے گہرا لگاؤ ہے۔ اسی لیے میں کوئی چیز لکھنے کے بعد جب یہ محسوس کرتی ہوں کہ یہ بے سری چیز ہے اور سر میں نہیں بیٹھی ہے تو میں اسے دوبارہ لکھتی ہوں۔

میں نے کہا کہ مغرب میں ناول نگار اپنے موضوع کی تلاش میں دور دراز کے مقامات کا سفر کرتے ہیں اور خاص طور پر اپنے ناولوں کے پس منظر اور کرداروں کے لیے مختلف علاقوں کی چھان بین کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں اردو میں ایسی کوئی روایت نہیں۔ آپ نے مختلف مقامات کا سفر کیا ہے اور اپنے ناولوں میں ان جگہوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً چائے کے باغات اور لندن۔ تو کیا آپ نے عمداً سفر کیا ہے ان جگہوں کا اپنے ناولوں کے پس منظر اور کرداروں کی تلاش کے لیے؟

انھوں نے جواب میں کہا: نہیں یہ محض اتفاق ہے۔ جہاں چلے گئے وہاں کسی بات نے اسٹرائک کیا اس کے بارے میں لکھ لیا۔ خاص طور پر ناول لکھنے کے لیے سفر نہیں کیے۔ میں نے

کوئی پروگرام نہیں بنایا۔ یہ نہیں کہ میں ناول لکھنے کے لیے یوگوسلاویہ جارہی ہوں یا جاپان جارہی ہوں۔نہیں چلے گئے کوئی بات اسٹرائک کی وہ لکھ دی۔نہیں میں پلان بنا کر ناول لکھنے کے لیے کسی ملک میں نہیں جاتی۔ یہ نہیں کہ البانیہ جا کر ناول لکھوں گی یا فرانس جا کر لکھوں گی۔ گئے ہیں گھومتے پھرتے تو ظاہر ہے پس منظر مل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میری ایک کہانی ہے کارمن۔ تو میں جب جاپان سے لوٹ رہی تھی تو میں منیلا میں ٹھہری تھی۔ ہوٹل میں بکنگ نہیں ہوئی تھی اس لیے میں وہاں YWCA میں ٹھہری۔ وہ YWCA کا پورا کا پورا ماحول ہے اس کہانی میں۔ مجھے setting مل گئی۔ میں نے پلاٹ بنا دیا اور کردار بنا دیے۔ setting مل جاتی ہے اور بعض اوقات کیریکٹرس بھی مل جاتے ہیں تھوڑے سے باقی ان کو بناتے ہیں اور جو جی چاہے کریں آپ ان کے ساتھ۔

میں نے سوال کیا کہ یہ تو آپ کو یاد ہوگا کہ کون سا ناول آپ نے کم سے کم مدت میں لکھا اور کون سا ناول لکھنے میں بہت دیر لگی۔

کہنے لگیں کہ یہ کہنا بڑا مشکل ہے۔ لیکن کچھ ناول ایسے ہیں جن کے لیے میں نے ریسرچ کی۔ بعض کے لیے میں نے بہت جلد ریسرچ کر لی وہ میں نے جلد مکمل کر لیے بعض میں دیر لگی اور تین سال لگے ان میں۔ مثلاً 'آگ کا دریا' مجھے پتہ ہے کہ اس کے بارے میں سوال کرنے کے لیے آپ تلے بیٹھے ہوں گے۔ لیجیے میں آپ کو مطمئن کیے دیتی ہوں۔ 1956 میں میں نے اس کے بارے میں پڑھنا شروع کیا اس کے پس منظر کے لیے۔ کچھ پہلے سے تھا میرے دماغ میں۔ تو ایک سال میں میں نے یہ ناول ختم کر لیا اس کے بعد اس کا مسودہ ایک سال تک پڑا رہا گھر پر۔ ایک سال اس کے چھپنے میں لگا۔ میرے خیال میں ایک اور بڑا ناول جو میں نے کافی ریسرچ کے بعد لکھا وہ ہے 'گردش رنگ چمن'۔ اس کی ریسرچ کے لیے میں رام پور گئی اور اپنے عزیزوں کے ساتھ رہی تھی۔ وہاں رضا لائبریری میں ریسرچ کی پھر مجھے تھوڑی سی ریسرچ کی ضرورت تھی سو میں یہاں لندن آئی۔ میں نے انڈیا آفس لائبریری سے کچھ میٹریل لیا۔ میٹریل کیا گو ہر جان کی والدہ کے دیوان کی تصویر بنوائی۔ اس کے بعد میں نے ناول لکھا۔ وہ بھی سال چھ ماہ میں مکمل ہو گیا۔

میں نے کہا کہ بہت سے لوگوں کے نزدیک آگ کا دریا آپ کا بنیادی کام ہے اس لحاظ سے کہ پہلی بار اردو ناول میں تارنخیت کا رجحان آپ نے شروع کیا۔ اور جیسے کہ گردش رنگ چمن کا ذکر آیا ہے اس کے بارے میں عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں تارنخیت اتنی حاوی نہیں جتنی کہ 'آگ کا دریا' میں ہے تو آپ سمجھتی ہیں کہ آپ تارنخیت کے رجحان سے دور جا رہی ہیں یا یہ رجحان بدل رہا ہے۔

کہنے لگیں کہ دیکھیے کوئی ضروری نہیں کہ میں ہر کتاب ایک ہی طرح کی لکھوں۔ ہر کتاب کا ایک ہی نسخہ ہو ایک ہی سانچہ ہو۔ اور اب تارنخیت کیا۔ یہ الگ الگ کہانیاں ہیں۔ اب مثال کے طور پر میرا تازہ ناول چاندنی بیگم ہے وہ بالکل مختلف انداز کا ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ ہر چیز کو ایک ہی طریقے سے لکھتے چلے جائیں۔ اب بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے چاندنی بیگم میں اس طرح کیوں لکھا اور آپ نے چاندنی بیگم کو مار کیوں دیا۔ ارے بھئی چاہیے تھا اسے مارنا تو مار دیا۔ تو آپ بتائیے کہ اس کے لیے میں کیا صفائی پیش کروں۔

میں نے پوچھا کہ گردش رنگ چمن میں بہت سے لوگوں کو یہ بات عجیب سی لگی کہ مسز عندلیب بیگ، بہت جدت پسند ہیں جب کہ ان کی بیٹی عنبرین بہت قدامت پسند ہے۔

کہنے لگیں کہ: ایسا تو ہوتا ہے۔ یہ تو وہ خود عنبرین کہتی ہے کہ میں والدہ کے ری ایکشن میں قدامت پسند ہوں مذہبی ہوں۔

تو آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ پرانے لوگ جدیدیت کے زیادہ قائل ہیں۔ میں نے سوال کیا۔

جواب میں انھوں نے کہا کہ بھئی یہ الگ الگ کیریکٹرس ہیں۔ حد ہو گئی کہ آپ اس کو جنرلائز کر رہے ہیں۔ یہ مختلف کیریکٹرس ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایک کیریکٹر کی بنیاد پر فیصلہ کر لیں۔ مسز عندلیب کی زندگی confused تھی۔ وہ باغی تھیں۔ پریشان حال تھیں۔ ایک شخصیت کی بنیاد پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ سب ایسے ہوتے ہیں۔

میں نے پوچھا کہ لاہور میں ایک انٹرویو میں آپ نے کہا تھا کہ آگ کا دریا آپ کا بنیادی کام نہیں ہے۔ تو آپ کس ناول کو اپنا بنیادی کام سمجھتی ہیں۔

جواب میں ان کا کہنا تھا: بنیادی کام کیا ہوتا ہے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ مجھے کوئی contract دیا گیا تھا کہ میں GPO کی بلڈنگ بناؤں تو میں نے یہ بلڈنگ بنادی تو یہ میرا بنیادی کام ہوگیا۔ نہیں بھئی ایک رائٹر ہے وہ لکھ رہا ہے، ممکن ہے کہ کوئی اچھی چیز لکھ لے جو ہم سمجھیں وہ بہتر ہے۔ 'آگ کا دریا' کے ساتھ یہ ہوا کہ وہ مختلف وجوہ کی بناپر مشہور بہت ہوگیا۔

میں نے کہا کہ اس کا کینوس بہت بڑا تھا۔

وہ بولیں کہ جی ہاں اس کا کینوس بہت بڑا تھا۔ اب ضروری نہیں کہ میں ہر مرتبہ اسی طرح لکھتی چلی جاؤں۔

میں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ لوگوں کو اس وجہ سے تعجب ہوا کہ آپ کی پہلی جو کتابیں تھیں وہ مختلف تھیں جن میں مغربیت زیادہ تھی۔

وہ بولیں۔ اب مغربیت کیا ہوتی ہے۔ لوگ یہ بھی نہیں سوچتے کہ جو کتاب میں نے اٹھارہ یا انیس سال کی عمر میں لکھی تھی تیس سال کے بعد تو میں ویسی کتاب نہیں لکھوں گی۔ تیس سال میں مجھ میں زیادہ عقل آجائے گی نا۔ کچھ تجربہ آجائے گا کچھ میچوریٹی آجائے گی تو میں ذرا مختلف لکھوں گی۔ جو میں لکھ رہی تھی انٹ سنٹ بی اے میں جب میں لکھ رہی تھی۔ اس کے تیس سال بعد تو میں پچاس سال کی عمر میں وہ نہیں لکھوں گی جو میں اکیس سال کی عمر میں لکھا تھا۔ ایک ادیب میں نے آخر تھوڑا بہت Development ہوتا ہے۔ تو اس کے لحاظ سے اس کا اسٹائل بھی بدلتا ہے اور میچوریٹی آتی ہے۔ مختلف چیزیں اس کی سمجھ میں آتی ہیں اور وہ بہتر سے بہتر لکھتا ہے۔

میں نے پوچھا تو آپ کہہ رہی ہیں کہ ابھی آپ کو اپنا شاہکار لکھنا باقی ہے۔

کہنے لگیں: شاہکار کیا ہوتا ہے۔ صاحب یہ بڑا کلیشے ہے۔ شاہکار کا لفظ مت کہیے۔ شاہکار واہکار کچھ نہیں ہوتا۔ جس کتاب سے رائٹر خود مطمئن ہو وہ ٹھیک ہے اور جسے لوگ سمجھیں ٹھیک ہے وہ ٹھیک ہے۔

میں نے سوال کیا کہ اردو میں ناول کی روایت کے بارے میں آپ کیا کہیں گی۔

انھوں نے کہا: اردو زبان میں ناول بہت لکھے گئے ہیں۔ نول کشور پریس کے زمانے میں ہزاروں ناول لکھے گئے تھے اور مقبول بھی ہوئے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس زمانے میں لوگوں کے پاس ناول پڑھنے کے علاوہ اور کوئی انٹرٹینمنٹ کا ذریعہ نہیں تھا۔ صرف ناول ہی ایک ذریعہ تھا۔ ایک زمانے میں ہمارا پورا دور ناول کا گزرا ہے۔ اب آج کل ماحول بدل گیا ہے۔ معاشرہ بدل گیا ہے۔ پہلے لوگ گراموفون سنتے تھے پھر ریڈیو آیا اور پھر ٹی وی آیا۔ ٹی وی کے ساتھ پورا سانچہ ہی بدل گیا۔ نظریات کا، انٹرٹینمنٹ کا، پورے تصورات بدل گئے۔ پھر ویڈیو آ گیا۔ لہٰذا اب ناول کوئی بیٹھ کر نہیں پڑھتا افسوس کی بات ہے۔ اور پرابلم یہ ہے کہ بچوں میں پڑھنے کا شوق کم ہو گیا ہے۔ پچھلے زمانے میں بچوں کے لیے پورا لٹریچر تھا۔ پہلے بچوں کے لیے رسالے نکلتے تھے۔ کہاں ہوتی تھیں۔ بچے پڑھتے تھے۔ اب بچے پڑھتے نہیں۔ بچے ویڈیو دیکھتے ہیں اسی طرح ناول بھی نہیں پڑھے جاتے۔ ہمارے ہاں لٹریسی اتنی کم ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو ناول پڑھتے ہیں۔ پھر ناول بھی فقط ایک ہزار چھپتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ چار پانچ ہزار سے زیادہ لوگ ناول نہیں پڑھتے۔ اس کا مقابلہ آپ مغرب سے نہیں کر سکتے۔ یہاں دس دس لاکھ سے زیادہ کتابیں چھپتی ہیں اور بڑی تعداد میں لوگ یہ کتابیں پڑھتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں پڑھنے کی عادت کم ہوتی جارہی ہے۔ اور ظاہر ہے افسانے کا زمانہ ختم ہوتا جارہا ہے۔ پھر ڈائجسٹ آ گئے ہیں۔ اچھے ناول کا حلقہ بہت محدود رہتا ہے۔ ہاں رضیہ بٹ کو لاکھوں لوگ پڑھیں گے ہمارے ہاں ہندوستان میں گلشن نندا بھی بہت مقبول ہیں۔ اسی طرح کے ناول بہت مقبول ہیں لیکن وہ ناول بہت محدود ہیں جو ذہن پرست طبقہ پڑھنا چاہتا ہے۔

میں نے کہا کہ ہندستان میں اردو کی کتابیں اچھی خاصی تعداد میں چھپ رہی ہیں اور اس سلسلے میں سرکاری تنظیموں کی طرف سے مالی اعانت مل رہی ہے۔ تو کیا آپ مطمئن ہیں۔

ان کا کہنا تھا جی ہاں اردو اکادمیوں کی مالی اعانت کی وجہ سے اردو کی اچھی خاصی کتابیں چھپ رہی ہیں مضامین سنجیدہ ہیں۔ تحقیق، تنقید، کے ساتھ دینیات اور اسلام پر کافی زور ہے۔ ہر ریاست میں اردو اکادمیاں ان کتابوں کی اشاعت میں بڑے پیمانے پر مالی مدد دیتی ہیں۔ یہ صحیح

ہے کہ کتابیں تو بہت چھپ رہی ہیں لیکن آپ پرسنٹیج کی بات کریں تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ساؤتھ ایشیا میں ادب عوامی دلچسپی کی چیز ہے اور جس طرح مغرب میں کتابیں شائع ہوتی ہیں اور پڑھی جاتی ہیں ان کا ہم یہاں مقابلہ نہیں کر سکتے۔

شکریہ!

(’اردو دنیا‘، مئی 2016)

نوٹ: آصف جیلانی نے عینی آپا کی وفات سے دو سال قبل لندن میں ایک انٹرویو لیا تھا جو بی بی سی سے نشر ہوا۔ یہ انٹرویو کسی بھی رسالے یا کتاب میں ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ پہلی بار ’اردو دنیا‘ میں شائع ہوا۔

آئینہ جہاں برصغیر کی ممتاز اور منفرد فکشن نگار قرۃ العین حیدر کی کلیات ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنا افسانوی سفر 1943 سے شروع کیا۔ جو ان کے انتقال تک جاری رہا۔ اس دوران انھوں نے تقریباً 75 افسانے لکھے جو ان کے پانچ افسانوی مجموعوں میں شامل ہیں۔ پانچ ناولٹ، نو ناول اور گیارہ رپورتاژ تحریر کیے۔ ان کے علاوہ درجنوں مضامین، خاکے، بچوں کی کہانیاں اور دوسری زبانوں سے تراجم کیے۔ پوری زندگی صحافت میں گزاری (پرنٹ میڈیا اور الکٹرونک میڈیا) درجنوں دستاویزی فلمیں بنائیں۔ مصوری اور موسیقی کا بھی بے حد شوق تھا۔ درجنوں پینٹنگ بنائی لندن اور ہندوستان میں نمائش بھی ہوئی۔ انگریزی میں سیکڑوں صحافتی مضامین لکھے انٹرویوز اور فلم ریویو کیے، اردو ادیبوں کو انگریزی میں ترجمہ کیا۔ خود درجنوں انٹرویو دیے۔ محقق کا فریضہ بھی انجام دیا اور کئی کتابیں مدون کیں۔ یہ کلیات ایک عہد ساز ادیبہ کے کارناموں کو مجتمع کرنے کی ایک محققانہ کوشش ہے۔ حکومت ہند نے ان کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ''پدم شری'' اور ''پدم بھوشن'' جیسے انعامات سے سرفراز کیا تھا۔ جلد یازدہم ان کے انٹرویوز پر مشتمل ہے۔

کتاب کے مرتب ڈاکٹر جمیل اختر اردو کے معروف ادیب، محقق، مصنف اور نقاد ہیں۔ فکشن کی تحقیق ان کا خصوصی میدان ہے۔ قرۃ العین حیدر کی کلیات اسی تحقیقی سلسلے کی ایک کڑی ہے اس سے قبل بلونت سنگھ کی کلیات آٹھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں عصمت چغتائی، بلونت سنگھ اور قرۃ العین حیدر کا نیا افسانوی مجموعہ بھی ان کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ اشاریہ آج کل کی تدوین کے ذریعے اردو میں اشاریہ سازی کو ایک تحریک کی شکل دی۔ زندگی نامہ قرۃ العین حیدر اور گوپی چند نارنگ ان کے علمی کمالات کے نئے زاویے کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے ادبی کارناموں کی داستان بہت طویل ہے۔ اب تک مختلف موضوعات پر ان کی چالیس سے زائد کتابیں قومی اور بین الاقوامی اداروں سے شائع ہو چکی ہیں جن میں چار کتابیں آکسفورڈ پریس سے بھی شائع ہوئی ہیں اور انھیں کئی ادبی ایوارڈز بھی مل چکے ہیں۔

ISBN: 978-93-5160-129-6
9 789351 601296
NCPUL
New Delhi
₹ 132/-

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025